اردو

دیوان غالب

مطبوعہ نظامی پریس بدایوں

محمد احمید الدین ایف۔ آر۔ ایس۔

پوچھتے ہیں وہ کہ "غالب کون ہے" کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی

خط مرزا غالب

جناب قاضی صاحب کو میری بندگی پہنچے۔ مکرر یہ کہ مولوی غلام غوث خان بہادر میر منشی

کا قول سچ ہے۔ اب میں تندرست ہوں، پھوڑا پھنسی زخم جراحت

کہیں نہیں مگر ضعف کی وہ شدت ہے کہ خدا کی پناہ۔ ضعف کیونکر

نہ ہو، برس دن صاحب فراش رہا ہوں۔ ستر برس کی عمر، جتنا خون بدن میں

تھا بے مبالغہ آدھا اس میں سے پیپ ہو کر نکل گیا۔ سن نمو

کہاں جو اب پھر تولید دم صالح ہو۔ بہر حال زندہ ہوں

اور ناتواں اور آپ کی پرسشہائے دوستانہ کا ممنون احسان

والسلام مع الاکرام نجات کا طالب غالب

دو شنبہ ۸ جمادی الثانی سنہ ۱۲۸۰ مطابق ۲۳ نومبر سنہ ۱۸۶۳ء

(ضمیمہ دیوان غالب مطبوعہ نظامی پریس بدایوں)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ طبع ششم

حُسن بے پروا خریدار متاعِ جلوہ ہی
آئینہ زانوئے فکرِ اختراعِ جلوہ ہی

یہ کون نہیں جانتا کہ حسین سے حسین شخص ہیں بھی جس کو قدرتی طور پر آنکھ ناک چہرہ مُہرہ ہاتھ پاؤں غرضکہ تمام اعضا سڈول اور موزوں عطا کیے گئے ہوں دلربایانہ کشش اور معشوقانہ ادا اُس وقت تک پیدا نہیں ہوتی جب تک کہ مشاطہ کے ہنرمند ہاتھ اُس میں چار چاند نہ لگا دیں اسی مسئلہ کو مرزا غالب نے اپنے اس شعر میں جس کو ہم نے دیباچہ کا عنوان بنایا ہی اپنے مخصوص رنگ میں بیان کیا ہی جس کا مطلب یہ ہی کہ حسن اگرچہ بے پروا و بے نیاز ہوتا ہی لیکن بناؤ سنگھار اور جلوہ افروزی کا وہ بھی خواہاں رہتا ہی۔ بعینہٖ یہی حال کلام غالب کا ہی۔ غالب کے اشعار میں وہ سب کچھ موجود ہی جو ایک مکمل اور فطرتی شاعر کے کلام میں ہونا چاہیئے۔ سب سے بڑھ کر اُس کا اعلیٰ تخیل ہی اور یہی وہ چیز ہی جس سے غالب کے اشعار میں ہمیشہ تازگی نظر آتی ہی۔ جب پڑھیئے نیا لطف ملتا ہی۔ لیکن آج سے بارہ برس قبل کلام غالب کی حالت اُس حسین معشوق جیسی تھی جس کو قدرت نے ہر طرح کی موزونیت اور خوبصورتی عطا کی ہو

لیکن پھر بھی اُس کا حُسن بے پردۂ خریدار متاعِ جلوہ ہو۔

سب سے پہلے ۱۹۱۵ء میں نظامی پریس بدایوں کو کلامِ غالب کی مشاطہ گری کا فخر حاصل ہوا اُس نے اردو دیوانِ غالب کو جو ادنیٰ درجہ کے خاکی کاغذ پر غلط سلط چھپا ہوا چند پیسوں کے بدلے بکتا تھا ۲۲×۲۷/۸ سائز کے اعلیٰ درجہ کے دبیز ولایتی سفید کاغذ پر نہایت خوشخط جلی قلم معرا اگر اشارات املائی سے مزین شائع کیا جس کو تعلیم یافتہ طبقہ میں پسندیدگی کا درجہ حاصل ہوا۔ ۱۹۱۶ء میں دوسرا نسخہ جو حامل شرح تھا نہایت خوشنما سرورق کے ساتھ ۲۰×۲۶/۸ کی کتابی تقطیع پر پہلے سے زیادہ اہتمام کے ساتھ مجلد شائع ہوا۔ تیسری مرتبہ پاکٹ ایڈیشن کی صورت میں یعنی موجودہ تقطیع پر نہایت خوشنما و دلفریب مشرح نسخہ شرح پر نظرِ ثانی کے بعد ۱۹۱۹ء میں مرتب ہو کر ۱۹۲۰ء میں نکلا۔ جس کے ساتھ ڈاکٹر سید محمود کا عالمانہ اور دلچسپ مقدمہ بھی شامل تھا پھر ۱۹۲۲ء میں میں نے شرح پر نظرِ ثانی کر کے اُس کو از سرِ نو مرتب کیا جو ذیشان اور خوب صورتی کو لیے ہوئے چوتھی مرتبہ ۱۹۲۲ء میں اپنی مقبول چھوٹی تقطیع پر طبع ہو کر ناظرین کے ہاتھوں میں پہنچا۔ اس ایڈیشن میں ڈاکٹر محمود صاحب کا جو مقدمہ شامل ہوا اُس کو ڈاکٹر صاحب کی نظرِ ثانی نے پہلے سے زیادہ پُر کار آمد اور دلکش بنا دیا۔ اس کے ایک ہی سال بعد اسی سائز پر ۱۹۲۲ء میں پانچویں ایڈیشن کو پریس میں پہنچنے کی نوبت آئی جو ۱۹۲۳ء میں تیار ہو کر بازار میں آ گیا اسی سال مشرح پاکٹ ایڈیشن کے علاوہ ۲۲×۲۹/۸ پیمانہ کی بڑی تقطیع پر

خوشخط جلی قلم اور اچھے کاغذ پر ایک اور نسخہ شائع ہوا جس کے ساتھ غالب
کی خود نوشتہ سوانح عمری اور مشکل الفاظ و محاورات غالبی کی فرہنگ بھی دی گئی
جب نظامی پریس سے اچھے کاغذ اور خوشنما طباعت کے ساتھ مختلف
شان و صورت کے متعدد ایڈیشن چھپ کر شائع ہوئے تو قدرتی طور پر پبلک میں
اعلیٰ قسم کی چھپائی اور عمدہ کاغذ کے قیمتی نسخے خریدنے کا شوق پیدا ہو گیا۔
پبلک کے اس بدلے ہوئے مذاق سے فائدہ اُٹھانے کے لیے نظامی پریس کا
دیکھا دیکھی اور مطابع نے بھی دیوان غالب کو اچھے کاغذ اور بہتر طباعت
کے ساتھ شائع کرنے کی کوشش کی۔ ایک دارالاشاعت نے تو یہاں تک
ہمت کی کہ سمندر پار سے "جرمنی نسخہ" تیار کرا کے منگایا جو پلیٹ ٹائپ کے
چھاپے کا بہت عمدہ نسخہ پھر دوبارہ نہ چھپا۔ کئی حامل شرح نسخے بھی شائع
ہوئے لیکن ہمیں یہ ظاہر کرنے سے نہایت مسرت ہے کہ نظامی پریس کے
شرح پاکٹ ایڈیشن کی مانگ برابر جاری ہے سال گزشتہ کے وسط میں
نظامی پریس کا پانچواں نایاب ایڈیشن کم یاب ہو گیا اور قدردانان کلام غالب
کو جنھوں نے گزشتہ چھ ماہ میں اس کو طلب فرمایا مایوس ہونا پڑا جس کی وجہ
میری کثرت مشاغل ہے۔ مجھے عدیم الفرصتی کی وجہ سے سب سے پچھلے نسخے پر
درستی اغلاط کی غرض سے نظر ڈالنے کا جلد موقع نہ ملا۔ صرف دسمبر ۱۹۲۲ء کے
آخر میں مرتبہ نسخہ کو پریس میں بھیج سکا اور گزشتہ تین ماہ کی مہلت میں کارکنان
پریس نے اس کو دوسرے کاموں پر مقدم رکھ کر تیار کر دیا۔ بحمد اللہ آج وہ

ہمہ جہت مکمل ہو کر اسی آب و تاب کے ساتھ جس طرح اس سے پہلے ایڈیشن نکلے تھے شائع ہو رہا ہے امید ہے کہ نقادانِ سخن بالخصوص دلدادگانِ کلامِ غالب اس کو متقدم نسخوں سے زیادہ صحیح اور مکمل پائینگے اور اس خاکسار کو دعائے خیر سے یاد فرمائیں گے والسلام

خاکسار نظامی بدایونی

۳ اپریل ۱۹۲۶ء

بدایوں

M.A.LIBRARY, A.M.U.
U32227

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسی تقطیع پر اور اسی شان کے ساتھ ہمارا دیوان غالب چوتھی مرتبہ گزشتہ سال انھیں دنوں میں شائع ہوا تھا۔ ایک سال سے کم مدت میں وہ ہاتھوں ہاتھ نکل گیا۔ اس لیے طبع پنجم کا اہتمام آج سے کئی ماہ پہلے شروع ہوگیا تھا۔ لیکن اب ۱۹۲۲ء کی پہلی سہ ماہی میں وہ مکمل ہوکر اس قابل ہوا ہے کہ معزز ناظرین کے ہاتھوں تک پہنچے۔

اس تازہ گلدستے کے تیار کرنے میں کارکنان پریس نے حتی الامکان اس کمی کو پورا کردیا ہے جو اس سے ماقبل کی طباعت میں بعض نکتہ سنج ناظرین کو محسوس ہوئی تھی شرح کو نظر ثانی کے بعد زیادہ واضح اور مکمل کردیا ہے۔ وہ الجھنیں جو بعض اشعار کے متعلق اشاعت ماسبق میں باقی رہ گئی تھیں دور ہوگئی ہیں معانی اور مطالب کی وضاحت کے علاوہ طباعت اور صحت کے لحاظ سے بھی یہ نسخہ اپنے پیش رو نسخوں سے امتیازی حیثیت رکھتا ہے لیکن پھر بھی

ہم دلدادگانِ کلامِ غالب کے سامنے یہ اعتراف کرنے کے لیے تیار ہیں کہ
غالب جیسے بڑے شخص کا کلام جس شان و اہتمام سے شائع ہونے کے
قابل ہے ہم اپنی بے بضاعتی کے سبب سے اس مرتبہ بھی اس کا عشر عشیر
اہتمام نہ کر سکے۔

دیوان غالب کو متعدد مرتبہ نظامی پریس سے شائع ہوتے دیکھ کر بعض صاحبان
کی طرف سے ہم سے سوال کیا جاتا ہے کہ غالب کے کلام کا سبق دہرانے کے
بجائے نظامی پریس کی صفائی طباعت اور حسن صنعت کے متعلق اپنی کوششوں
کو اردو ادب کے دوسرے اساتذہ کے دواوین کی اشاعت میں صرف
کر کے اپنے مطبوعات کے دائرے کو وسیع کیوں نہیں کرتے کیا اُن شعرا
کا کلام کیفیات و جذبات کا حامل نہیں؟ کیا وہ اس قابل نہیں کہ تعلیم یافتہ
دنیا کے سامنے اس کو اسی شان و خوبی کے ساتھ لایا جائے؟ ان سوالات
کا جواب صاف ہے۔ دیوان غالب کو متعدد مرتبہ اور جلد جلد چھاپنے کی
ضرورت صرف اس وجہ سے پیش آئی کہ اس کی مانگ تھی اور رہی اور
آئندہ اس سے بھی زیادہ ہوگی کیونکہ موجودہ زمانہ میں کلام غالب کی جو کچھ
بھی قدردانی ہوئی وہ اس سے کہیں کم ہے جس کا وہ فی الواقع مستحق ہے۔ غالب کا
کبھی نہ ختم ہونے والا تخیل۔ اس کا فلسفیانہ زاویۂ نظر۔ اس کے اچھوتے تخیلات
اور نظریات جو اس کو اس کے معاصرین شعرا میں ممتاز بناتے ہیں ایسے ہیں پیش گوئی
کرتے ہیں کہ مستقبل قریب میں اس کو اس سے زیادہ حسن قبول کا درجہ حاصل ہوگا
اور ایک نہ ایک دن وہ قدر و منزلت کے اس حقیقی معیار پر [illegible] کا نقشہ

ہماری آنکھوں میں پھر رہا ہی روشناس ہوگا۔

دوسرے شعرا کے دواوین کی نسبت ہم اپنے شکوہ سنج احباب کو یقین دلاتے ہیں کہ "نظامی پریس" اردو ادب کے اُن جواہر خانوں کو بھی جو آج اُسی بے التفاتی کے گڑھے میں دفن ہیں جس میں کچھ سال قبل غالب کا انمول کلام پوشیدہ تھا نقادین اردو ادب کے سامنے لانے کے لیے بالکل تیار ہی۔ اگر موجودہ سیاسی ہل چل کی بدولت ادبیات ترقی کی رفتار دھیمی نہ پڑجاتی تو ملک کے تعلیم یافتہ گروہ کا پرجوش ذوق اور فہم سلیم کا مطالبہ ضرور اس حد پر پہنچ جاتا کہ جناب سید راس مسعود صاحب بی۔ اے۔ آکسن کی ترقی اردو کی اُس اسکیم کے تحت میں جس کو ہمارے پریس نے دیوان غالب کی اشاعت سے عملی صورت دی ہی اس وقت تک دیگر شعرا کے کلام کے بھی متعدد ایڈیشن نکل چکے ہوتے لیکن حالات حاضرہ کو دیکھتے ہوئے یہ بھی غنیمت معلوم ہوتا ہی کہ دیوان غالب کے بعد اردو شاعری کے آفتاب میر انیس کے مراثی کی پہلی جلد جو ۵۰۰ صفحات سے زائد حجم کی ضخیم کتاب ہی ایک بسیط مقدمے کے ساتھ شائع ہوکر ناظرین کے ہاتوں تک پہنچ گئی جس کے لیے تمام بہی خواہان ادب اردو کو اعلیٰ حضرت قدر قدرت ہزاگزالٹڈ ہائی نس حضور میر عثمان علی خاں بہادر بالقابہ شہریار دکن کی اُس گراں قدر امداد کا جو اُنھوں نے اس سلسلہ کی اشاعت کے لیے مرحمت فرمائی شکر گذار ہونا چاہیے یہ کتاب در اصل سلسلہ آصفیہ کی جس کی ابتدا "نظامی پریس" نے کی ہی سب سے پہلی کڑی تھی۔ خدا کی ذات سے امید ہی کہ اس سلسلے میں مشاہیر اساتذہ اردو کے دواوین کی اشاعت کا کام

برابر جاری رہیگا۔ کیونکہ اپنی زبان کو ترقی دینے کا مسئلہ جو اس وقت ملک کے سامنے شد و مد سے پیش کیا گیا ہی اُس کا یہ اقتضا نہیں ہو سکتا کہ اب زیادہ عرصہ تک ہم قدیم اردو شعرا کے کلام کے ساتھ کم نگاہی کو روا رکھیں بلکہ وقت آگیا ہی کہ ایک مرتبہ پھر اردو شعرا کے کلام کے گلدستوں سے ہم اپنے تعلیم یافتہ احباب کی میز کو زینت دینے کے اسباب بہم پہنچائیں ؎

دوڑے ہی پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال
صد گلستاں نگاہ کا ساماں کیے ہوئے

۱۳ر اکتوبر ۱۹۲۲ء   خاکسار نظامی بدایونی

مقدمہ

از جناب ڈاکٹر سید محمود صاحب پی۔ ایچ۔ ڈی بیرسٹر ایٹ لا

تمہید دیوان غالب کو آب و تاب کے ساتھ شائع کرنے کا خیال سب سے پہلے میرے معزز دوست سید راس مسعود صاحب۔ بی۔ اے (آکسن) کو ہوا۔ ادبیات سے جو شوق اُن کو ہے غالباً وہی اس بات کا محرک ہوا کہ اردو علم ادب کے خدائے سخن کو اس کس مپرسی کی حالت میں نہ رہنا چاہیئے۔ جس میں کہ وہ اب تک ہماری غفلتوں اور لاپروائیوں سے پڑا ہوا ہے۔ غیر ملکوں کے لٹریچر کے مطالعے نے اُن پر ثابت کر دیا ہوگا کہ قومی یا ملکی ترقی کے لیے اعلیٰ علم ادب کس درجہ ضروری اور لازمی ہے اور بغیر اس کے کوئی قوم مدارج ترقی کے پہلے زینہ پر بھی قدم رکھنے کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ چنانچہ ان کی تحریک پر مولانا نظامی بدایونی نے دیوان غالب کا پہلا ایڈیشن نفیس کاغذ اور صاف ستھری چھپائی کے ساتھ ملک میں پہلی مرتبہ شائع کیا۔ دوسرا ایڈیشن اور زیادہ عمدگی اور صحت کے ساتھ نکلا۔ تعلیم یافتہ گروہ نے اس کی قدر کی۔ جس سے پتا چلا کہ اہل ملک غالب کی عظمت کو پہچانتے اور اس ترجمانِ حقیقت کے فلسفیانہ خیالات کو سمجھنے لگے ہیں۔ ان دونوں اشاعتوں کے بعد

ہاجمیر نے نظامی صاحب کے ایک خط کا جواب دیتے ہوئے تحریک کی کہ اب تیسرا ایڈیشن پاکٹ ایڈیشن کی صورت میں شائع ہونا چاہیئے۔ اور اس کے ساتھ ہی اور تجاویز پیش کیں۔ مولانا نظامی نے میری تجاویز کو منظور کر لیا۔ لیکن اس قصور کے بدلے ساتھ ہی میری سزا بھی تجویز کر دی اور مجھ سے فرمائش کی کہ تیسرے ایڈیشن کے لیے مقدمہ نظم لکھو اور اس پر اصرار اور سخت اصرار ہوا کہ میں نے اپنی حماقت سے کچھ تو "الامر فوق الادب" کا لحاظ کر کے اور کچھ سزا کی اہمیت کو نہ سمجھ کر وعدہ کر لیا۔ آج چھ ماہ کے تقاضوں سے تنگ آ کر ایفائے وعدہ کی کوشش کر رہا ہوں اور اب مجھے پتا چل رہا ہے کہ جس چیز کا میں نے بلا سمجھے بوجھے وعدہ کر لیا تھا وہ میرے بس کا کام نہیں تھا۔ حسن اتفاق سے آج کل دلی آیا ہوا ہوں اور یہ چند اوراق پریشاں اسی پاک سرزمین پر لکھے گئے ہیں۔ جہاں وہ کشاف رازِ فطرت مرزا اسد اللہ خان غالب بقائے دوام کا جام نوش کر کے پڑا سو رہا ہے۔

"تیری تصانیف میں لوگوں کو تیری ہی تصویریں نظر آتی ہیں وہ آتی ہیں اور مجھ سے پوچھتی ہیں "وہ کون ہے" مجھے نہیں معلوم انھیں کیا جواب دوں؟ میں تیرے فسانے اپنے غیر فانی نغموں میں سنایا کرتا ہوں۔ راز دل بے اختیار عیاں ہو جاتا ہے۔ وہ آتے ہیں اور مجھ سے پوچھتے ہیں۔ بتا ان سے تیرا کیا مطلب ہے میں نہیں جانتا انھیں کیا جواب دوں۔

میں کہتا ہوں "آہ کون جانتا ہے ان کا کیا مطلب ہے؟" (ٹیگور)

شاعری کیا ہے؟ اس کا جواب کچھ آسان نہیں۔ سینٹ آگسٹن نے
اس کا جواب ایک دلفریب پیرایہ میں دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "اگر مجھ سے نہ پوچھو
تو مجھے معلوم ہے اور اگر پوچھو تو میں جانتا نہیں"۔ گو ہم میں سے ہر شخص کو اس کا
جبلی احساس ہے کہ شاعری کسے کہتے ہیں۔ لیکن اس احساس کا صحیح الفاظ میں اظہار
اگر غیر ممکن نہیں تو دقت طلب ضرور ہے۔ شاعری اس فن کا نام ہے جو قوت متخیلہ کے
توسل سے انبساط اور حقیقت کو ملا دیتا ہے۔ اور اس کا نتیجہ ایجاد ہوتا ہے۔ کارلائل
کہتا ہے کہ شاعری ایک موسیقانہ خیال ہے۔ شیلے اس کی تعریف یوں کرتا ہے کہ
شاعری قوت متخیلہ کا انکشاف ہے۔ دراصل یہ وہ فن ہے کہ جس کے ذریعہ
سے لفظوں کا استعمال کر کے پردۂ تصویر پر خیالی نقش و نگار ثبت کیے
جاتے ہیں۔ جو کام مصور رنگوں کے استعمال سے لیتا ہے وہی کام شاعر الفاظ
کے ذریعہ سے نکالتا ہے۔ شاعری جذبات اور خیالات کی بولتی چالتی
تصویر اور حسن و حقیقت کی تشریح ہے۔ یہ انسانی قلب کے کیفیات کو سریلی
زبان کے ذریعہ سے معرض بیان میں لاتی ہے۔

لٹریچر انسانی زندگی کی ایک تفسیر ہے۔ شاعری انسانی قلب کے لیے
ان امور میں تسکین دہ ثابت ہوتی ہے جن کا فطرت نے کوئی انسداد نہیں
کیا۔ شاعری کے اعلیٰ مقصود کے لیے ضروری ہے کہ خواہ شاعر فلسفی ہو یا نہ ہو
لیکن اس کی شاعری کی عمارات ایسی مستحکم بنیاد پر قائم ہوں جن میں تزلزل نہ آ سکے
ہر ایک شاعر کے لیے یہ امر ضروری ہے کہ جیسا کہ اس کی غرض عالم حسن
سے حقیقی ذوق و سرور حاصل کرنا ہے۔ اس کی قوت متخیلہ کی پرواز کے لیے

کافی وسعت ملنی چاہیئے۔ لیکن جب وہ مصلح بنتا ہے تو ہم اس امر کے طالب ہوتے ہیں کہ اس کی تعلیم و تلقین فہم و ادراک کے واسطے اطمینان بخش ثابت ہو اور نیز تخیل کے لیے دلکش اور قلب کے لیے موثر ہو۔ حقیقی شاعری ہماری نگاہوں میں وہ تخیل پیدا کرتی ہے جس سے ہم حُسن کی جلوہ افروزیوں سے لذت اندوز ہوتے ہیں۔ نیز روحانی معنی کے دروازے ہماری آنکھوں کے سامنے کھُل جاتے ہیں۔

غالباً ہم میں ایسے اشخاص کم ہونگے جو شاعرانہ بصیرت اور ادراک سے محروم ہوں۔ اور جن کے حصّہ میں یہ لطفِ تخیل اور خداداد جوہر نہ آیا ہو۔ لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ تھوڑی بہت شاعرانہ استعداد جو خداوند عالم نے ہم میں ودیعت کی ہے مادّی تاثرات کے عمل سے ایک عرصہ کے بعد بالکل مفقود اور کالعدم ہو جاتی ہے۔

فطری شاعر وہ ہے جس میں مجازی حُسن کے مشاہدے اور حقیقی معنے کے ادراک کی قوت ہو۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس میں فطرت کی طرف سے ایسی قوت ودیعت کی گئی ہو جس سے وہ اپنے مشاہدات اور محسوسات کو ایسے رنگ میں بیان کرے کہ ہماری آنکھوں میں اُس کا سماں بندھ جائے اور ہمارے جذبات مشتعل ہو جائیں وہ ہمارے قلوب کو اپنی طرف کھینچ لے اور اپنے الفاظ کی بندش اور بیان کی رنگینی سے ہمارے سامنے وہی تصویر کھینچ دے جس کو وہ خود دیکھتا اور محسوس کرتا ہے۔

شاعری ہمارے تخیل کو استوار اور ہماری ہمدردی کو مستحکم کرتی اور

ہماری شاعرانہ ترجمانی کی قوت کو رفتہ رفتہ بڑھاتی ہے لیکن اگر تخیل اور احساسات کے ذریعہ سے اسرار حیات کی ترجمانی کا نام شاعری ہے تو اس کو سب سے بڑی اہمیت اس قوت سے حاصل ہوتی ہے جس کی مدد سے وہ زندگی کے اہم ترین معاملات ہماری نظر کے سامنے پیش کرتی ہے۔ دنیا کے بڑے اور نامور شاعر ہمیشہ مانتے آئے ہیں کہ زندگی ہی شاعری کی بنیاد ہے زندگی ہی سے اس کا تعلق ہے اور زندگی ہی سے اس کا وجود ہے۔

اس بنیادی اصول کو مدنظر رکھ کر شعرا نے کارہائے نمایاں کیے ہیں اور زندگی کو بخوبی سمجھنے اور صحیح ترجمانی کرنے کی کوشش کی ہے اور در اصل یہی ان کی عظمت کا ثبوت ہے۔ کلام میں خاص خیالات کی محض موجودگی سے کچھ زیادہ فرق نہیں ہوتا پایا۔ جو چیز کسی شاعر کے کلام کو زیادہ موثر بناتی ہے وہ در اصل اس کا وہ پیرایہ بیان ہے جس میں خیالات کا اظہار کیا گیا ہو۔ کسی نظم کے مطالعہ کے وقت شاعر کی ہستی نظر اور اس کی شخصیت کی طرف اپنی توجہ مبذول کرنی چاہیے اور پھر اس پہلو پر بھی غور کرنا چاہیے جو شاعر کو انفرادی حیثیت سے متمیز کرتا ہے۔

غالب کی شاعری پر تنقیدی نظر حقیقتاً کچھ آسان کام نہیں ہے اور اس کی بلند پروازی اور شوکت خیالات، اس کا تعمق اس کی فہم رسا اور عظمت تخیل اس کا عجیب اور انوکھا طریقہ بیان اور اس کی صناعی وہ چیزیں ہیں کہ جن کو بخوبی سمجھنا اور الفاظ کے ذریعہ سے بیان کرنا میری استعداد سے بالاتر ہے۔

مولانا حالی جیسا نکتہ رس اور صاحب ذوق سلیم ہی اس کام کو سرانجام دینے کی قابلیت رکھتا تھا۔ مولانا حالی کی کتاب یادگار غالب بیشک ایک قابلانہ تصنیف ہے۔ لیکن یہ محققانہ و عالمانہ تصنیف بھی شیدایان غالب کی پیاس نہیں بجھاتی۔ وہ غالب کی حقیقی عظمت کا بہت تھوڑا حصہ ظاہر کرتی ہے۔ ممکن ہے کہ مولانا ممدوح نے زمانہ کی قدر ناشناسی اور ابنائے زمانہ کی انتہائے استعداد قابلیت کا خیال کرکے کَلِّمُوا النَّاسَ عَلیٰ قَدرِ عُقُولِهِم کے دانشمندانہ مقولے پر عمل فرمایا ہو اور ان دقائق کا اظہار مناسب نہ سمجھا ہو جن کو صرف انہیں کی چشم بصیرت کلام غالب میں دیکھ سکتی تھی لیکن اس نئے دور نے مغربی تعلیم میں ہندوستان میں ایک ایسا نوجوان پیدا کیا تھا۔ جس نے مرزا غالب کی عظمت حقیقی معنوں میں پہچان لی تھی اور جو غالب کے کلام کو اپنے حسن معانی کے ساتھ ملک کے سامنے پیش کرنے والا تھا۔ جس سے فلسفی اور صوفی شاعر اور سائنس والے سب ہی تحیر رہ جاتے۔ آہ! عبدالرحمن عمر نے تیرے ساتھ وفا نہ کی اور تو ملک و قوم کی عظیم الشان خدمت انجام نہ دے سکا غالب نے ایسے ہی موقع کے لیے اور شاید تیرے ہی واسطے یہ کہا ہوگا

ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی رحمن[1]
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

یہ نوجوان فلسفی جو شاعرانہ تخیل سے بہرہ ور تھا۔ ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں۔ مقدس وید اور دیوان غالب

[1] اصل شعر میں رحمن کے بجائے عارف ہے۔ یہاں رحمن سے ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری

کون شخص ہے جو دیوانِ غالب کے مطالعہ کے وقت یہ نہیں محسوس کرتا کہ اس کا لکھنے والا حقیقی ماہر فن ہے اور شاعری خدا کی طرف سے اُس کو ودیعت کی گئی ہے اور اُس کی شاعری کسبی نہیں ہے۔ اس کی شیریں بیانی اور مذاق سلیم اس کی بلاغت و فصاحت۔ اس کی عظمت اور بلندیٔ خیال۔ اس کی رنج و خوشی اس قدر دقیق اس قدر لطیف اور اس قدر نازک ہیں کہ ضبطِ تحریر میں لانے کی گنجائش نہیں۔

غالب کی ہستی اُن چیدہ اور برگزیدہ خاصانِ خدا کے گروہ سے ہے جن کا وجود ابدی ہے۔

غالب کی ذکاوت و بزرگی اس کی مستحق تھی کہ اُس کی شہرت چار دانگ عالم میں ہوتی۔ وہ ایک غیر معمولی طور پر ذکی پیش گو فلسفی اور ایک بلند پایہ شاعر ہے جس کے قصائد انوری و خاقانی کے قصائد سے مرتبہ میں کم نہیں جس کی غزلیات عرفی و طالب کی غزلیات پر فوقیت

بی۔اے۔ایل ایل۔بی۔پی۔ایچ ڈی کی طرف اشارہ مقصود ہے۔ بھوپال کے سرکاری کتب خانہ میں مرزا غالب کے قدیم دیوان اردو کا ایک نسخہ دستیاب ہوا تھا جس میں وہ تمام نظمیں اور غزلیں موجود ہیں جن کو مروجہ دیوان کی ترتیب کے وقت مرزا نے خارج کر دیا تھا۔ یہ دیوان آنریبل نواب افتخار الملک جناب صاحبزادہ محمد حمید اللہ خاں صاحب بہادر بھوپال کے حکم سے چھپا ہے۔ مولوی عبد الحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو نے رسالہ اردو حصہ اول میں اس تبصرہ کو جو مرحوم ڈاکٹر نے کلام غالب پر لکھا تھا۔ محاسن کلام غالب کے عنوان سے شائع کر دیا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ تصنیف ضائع نہ ہوئی اور اس جوان مرگ فلسفی کی محنت رائگاں نہ گئی۔

محمود

رکھتی ہیں۔ جس کی رباعیات فارسی عمر خیام کی رباعیات سے دقیع ہیں اور جس کی نثر ابو الفضل اور ظہوری کی نثر سے کہیں زیادہ شاندار ہے۔ وہ حسن حقیقت کا پرستار ہے اور زندگی کے مختلف ترانوں کا مغنّی۔ اگر وہ ایک طرف آتش سیّال اور شرمیلے گلاب کی تعریف میں نغمہ سرا ہوتا ہے تو دوسری طرف فلسفے کے دقیق اور اہم ترین مسائل کا انکشاف کرتا ہے۔ اس کی فارسی اور اردو دونوں دیوان علم ادب کے بیش بہا جواہر ہیں۔ ان میں لعل و یاقوت گوہر و زمرد سب ایک جا جمع ہیں۔

غالب ایسے وقت میں بزم شعرا میں رونق افروز ہوا جب کہ اسلامی عروج کا آفتاب غروب ہو چکا تھا۔ مشرقی اور مغربی تہذیب کا تصادم ہو رہا تھا۔ پرانی وضع و پیرانا تمدن رفتہ رفتہ نیست و نابود ہوتا جاتا تھا۔ اس وقت ہر صاحب نظر لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی کی زبان سے یہ ضرور کہہ رہا ہوگا ؎

"نئے انداز کی خوشیاں نئے انداز غم ہونگے"

اور شاید یہی وجہ ہے کہ ہم غالب کے کلام میں افسردگی اور تسلیم و رضا کی نمایاں علامت پاتے ہیں۔ انسانی رنج و خوشی کا احساس اور اس سے ہمدردی اور اس احساس و ہمدردی کا عجیب پر معنیٰ پیرایہ اور دلکش الفاظ میں اس کا اظہار کچھ غالب ہی کا حصّہ تھا۔ وہ دوسرے شعرا کی طرح انسانی کمزوریوں پر قہقہہ نہیں لگاتا۔ بلکہ وہ خود اُن کمزوریوں سے متاثر ہو کر اُن کے ساتھ روتا ہے۔ گناہ گار کا وہ سچا ہمدرد ہے۔ اور

اس ناچیز کی رائے میں سچے مصور فطرت کا یہ فرض اولین ہے:
حضرت غالب کی دقیقہ سنجی ان کے ہمعصر اشخاص کی سمجھ سے
بالاتر تھی اس لیے غالب کے کلام کی قدر و قیمت اُن کے زمانہ میں نہیں
کی گئی لیکن ہر ملک میں تقریباً تمام صاحبان فن و کمال کے ساتھ ایسا
ہی ہوتا آیا ہے۔ غالب کی ذات اس سے کیوں مستثنےٰ ہو سکتی تھی۔ یہ
مبالغہ آمیز خودنمائی نہ تھی بلکہ اپنی خداداد مہارت اور بے نظیر کمال کا پورا
یقین تھا جس نے اُس خدائے سخن سے یہ اشعار کہلوائے ع

تا ز دیوانم کہ سرمست سخن خواہد شدن
این مے از قحط خریداری کہن خواہد شدن

ابھی پورے پچاس برس نہیں گزرے کہ وہ کشاف حقیقت اپنے
کلام جادو دانی کی نغمہ سرائی چھوڑ کر عالم بقا کو سدھارا اور عاشق صادق
اپنے معشوق حقیقی سے جا کر مل گیا اور اُس کے لیے پھر "من و تو" کا فسانہ باقی
نہ رہا جیسا کہ اُس نے خود کہا ہے ع قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے
کام اچھا ہے وہی جس کا مآل اچھا ہے

اتنے ہی تھوڑے عرصہ میں اُس کی ہردلعزیزی کا یہ عالم ہے کہ اُس کے
دیوان کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں اور پھر ہر طرف سے مانگ ہے۔ بہت سے
نئی تہذیب کے دلدادہ جو مغربی مادیت سے تنگ آ کر حقیقی خوشی کی تلاش
میں سرگرداں ہیں۔ اُن کو غالب کے کلام کے مطالعہ میں ہر چار طرف مزہ اور اُنہیں
کیفیت وجدانی و سرور روحانی کا لطف ملتا ہے جس سے اُن کی طبع ملول کو

ایک گونہ تشفی و تسکین ہوتی ہے۔ شعراء کا کام نغمہ سرائی کر کے صرف بیچین دلوں کو مسرت بخشنا ہی نہیں۔ بلکہ ملکی و قومی ترقی میں نمایاں حصّہ لینا بھی اُن کا فرض ہے۔

شیکسپیر کا کلام انگلستان میں اور "گوئٹے" کا کلام جرمنی میں بہت کچھ ملکی و قومی ترقی کا باعث ہوا۔ اب آیندہ غالب کا کلام کہاں تک اور کس حد تک اس بدنصیب ملک ہند کی ترقی میں ممد و معاون ہوگا۔ اس کا جواب صرف آنے والی نسلیں دے سکتی ہیں۔

تعمق خیال۔ خوب صورت اور تقریباً بے عیب طرز ادا وسعت نظر عالمگیر ہمدردی و غمخواری۔ انسان اور اُس کے خصائل سے گہری واقفیت اور جوہر تاثیر یہ تمام خوبیاں غالب کی نظم اور نثر دونوں میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں۔ غالب کے کلام میں سلطنت تخیل کی عظیم الشان بلندیاں اور پرسکون فلسفۂ زندگی۔ انسانی ہستی کی رنج اور خوشیاں۔ زندگی کے مکروہات سے صاحبان دل کی کش مکش اور رنجیدہ دلوں کو تسکین و راحت دینے کی قوت سب کچھ موجود ہے۔ صرف مطالعہ کرنے والے کو اہل دل و صاحب ذوق ہونا چاہیئے۔ وہ ہم کو زندگی کی حقیقت اُس کی اہمیت اور اُس کا راز بتاتا ہے اور ہم کو خودی کے تاریک غار سے نکال کر ایک غیر متناہی بلندی پر لے جاتا ہے۔ جہاں سے ہم وہ چیزیں دیکھنے لگتے ہیں۔ جن کے بیان سے ہماری زبان قاصر ہے۔

کلام غالب کا مطالعہ کرتے وقت ہر ایک کو یہ احساس ہوتا ہے کہ گویا شاعر

اُسی کے جذبات دلی کی ترجمانی کر رہا ہے۔ اور یہی کمال شاعری ہے۔

"تمام صنعتوں کا مقصد انسان کے لیے خوشی بہم پہنچانا ہے۔ انسان کو کس طریقے سے خوش کیا جائے۔ اس سے زیادہ اہم سوال دنیا میں نہیں ہے۔ سچی صنعت صرف وہی ہو سکتی ہے جو انتہا درجہ کی خوشی و لذت بخشے نظم چاہے کتنی ہی درد انگیز کیوں نہ ہو پڑھنے والے کو اس سے بھی لطف و خوشی حاصل ہو سکتی ہے" غالب کی شاعری میں ظاہر بات ہے کہ جتنا زیادہ دلسوز مضمون ہوگا۔ اتنا ہی زیادہ پڑھنے والے کو لطف حاصل ہوگا۔ بہرحال اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ مرزا غالب کا کلام توحید۔ تصوف حکمت فلسفہ عبرت بے ثباتی دُنیا خودداری۔ جذبات حب الوطنی۔ ارتقا تناسخ۔ وحدت الوجود وغیرہ وغیرہ مسائل اور دوسرے راز فطرت کے بہت سے انکشافات سے پر ہے۔ تقریباً تمام اردو شعرا کی غزل گوئی یہ ہے کہ پرانے پامال مضامین جو مدت العمر سے اوّل عربی پھر فارسی اور اس کے بعد اردو غزلوں میں بندھتے چلے آتے ہیں۔ بہ تبدیل الفاظ معمولی بول چال اور روزمرہ میں ادا کیے جائیں۔ بقول "مولانا حالی میرے ذوق تک جتنے مشہور غزل گو اہل زبان میں گزرے ہیں۔ ان کی غزلوں میں ایسے مضامین بہت کم نکلیں گے جو اس محدود دائرے سے خارج ہوں۔ ان فن کا کمال یہی سمجھا جاتا تھا کہ جو مضامین پہلے بندھ چکے ہیں اُنھیں کو بلیغ اسلوب میں اس طرح ادا کیا جائے کہ نئی بندش پہلے بندشوں سے بڑھ جائے برخلاف اس کے مرزا کی غزل میں ایسی نازک خیالی اور ایسے اچھوتے

مضامین پائے جاتے ہیں کہ جن کو اکثر شعرا کی فکر نے بالکل چھوا تک نہیں
مرزا غالب شارع عام پر چلنا نہیں چاہتے تھے اور عامیانہ خیالات
اور محاورات سے حتی المقدور اجتناب کیا کرتے بلکہ عام محاورات کا استعمال
وہ اپنے لیے معیوب جانتے۔ عام فہم اشعار کہنے سے اسے کہیں زیادہ
پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے کہ ان کے طرز خیال اور طرز بیان
میں ایک جدت اور نرالا پن پایا جائے اور یہ کہنا کسی طرح غلط نہیں کہ
کہ مرزا اردو شاعری میں اپنے طرز کے موجد تھے۔ اوائل میں وہ بیدل
کے کلام سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ موجودہ دیوان کی اکثر غزلوں
میں بھی جابجا اس کی شہادت ملتی ہے۔ اس دیوان میں اول سے
آخر تک بے شمار ترکیبیں ایسی ملتی ہیں جو اردو شعرا کی عام شاہ راہ سے
بالکل الگ ہیں اور جن میں بیدل کا رنگ صاف طور پر نمایاں ہے مثلاً "
دام شنیدن، یک بیاباں ماندگی، ماتم یک شہر آرزو، وحشت خیز انداز، سنبل
غلطیدۂ صد رنگ۔ نشہ ہا شاداب رنگ۔ عرض ناز۔ شوخی دنداں، یک جہاں
زانو تامل، رنگ تماشا باختن" اس قسم کی بندشوں کے علاوہ جو کثرت سے ملتی
ہیں بعض پوری غزلیں ایسی ہیں جن کو پڑھ کر صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ
قصداً بیدل کے رنگ میں لکھی گئی ہیں۔ مثلاً ؎

پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موج شراب — دے بط مے کو دل و دست شنا موج شراب
پوچھ مت وجہ سیہ مستی ارباب چمن — سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہوا موج شراب
جس قدر روح نباتی ہے جگر تشنۂ ناز — دے ہے تسکیں بدم آب بقا موج شراب

یا مثلاً یہ غزل :-

عرضِ نازِ شوخیِ دنداں برائے خندہ ہے ۔ دعویٔ جمعیتِ احباب جائے خندہ ہے
ہے عدم میں غنچہ محوِ عبرتِ انجامِ گُل ۔ یک جہاں زانو تامل در قفائے خندہ ہے

قصائد میں بھی تقریباً یہی حال ہے چنانچہ قصیدہ اول و دوم اور چھکر ان کی تشبیب پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ وہ مرزا بیدل کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ مگر وہ مقتضائے طبیعت کے خلاف کچھ تو اس راہ کے دشوار گزار ہونے کی وجہ سے اور کچھ معترضوں کی نکتہ چینیوں سے تنگ آکر رفتہ رفتہ اس روش کو چھوڑتے گئے اور اس کشمکش میں ایک ایسی معتدل روش کی بنیاد پڑ گئی جس کو خاص مرزا کی روش کہنا چاہیئے ۔

ان کے زمانہ میں ایک بڑا گروہ ان کی مشکل پسندی کے باعث ان کی شاعری کا قائل نہ تھا چنانچہ لوگوں کی مخالفت اور قدر ناشناسی سے تنگ آکر مرزا نے بارہا مختلف پیرایوں میں اس کا اظہار کیا ہے ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل اُن کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

اس شعر میں اپنے مخالفین کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ اور ایک نہایت عمدہ پیرایہ میں ان کی نافہمی پر چوٹ کی ہے۔ مندرجۂ ذیل رباعی سے بھی اسی قسم کا مضمون مفہوم ہوتا ہے ؎

رباعی

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل ‏ ‏ سن سن کے اسے سخنوران کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش ‏ ‏ گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

اب ملک میں زبان فارسی کا رواج اس قدر کم ہوتا جاتا ہے کہ باوجود اس درجہ قبولیت کے بھی مرزا کے فارسی کلام سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ ان کے فارسی دیوان میں بھی وہ نایاب جواہر پوشیدہ ہیں جن کو بازار علم میں لایا جائے تو انمول ثابت ہوں گے۔ مرزا کو اپنے فارسی کلام پر فخر تھا۔ اور اس کا ذکر انھوں نے متعدد مقامات پر کیا ہے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"میرے فارسی کے وہ قصیدے جن پر مجھ کو ناز ہے۔ کوئی اُن کا لطف نہیں اٹھاتا"

اُس زمانے کے خیال کے مطابق مرزا غالب اردو شاعری کو داخل کمالات نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ اُس میں اپنی کسر شان جانتے تھے۔ چنانچہ ایک فارسی قطعہ میں جس کی نسبت مشہور ہے کہ اُس میں ذوق کی طرف خطاب ہے کہتے ہیں ؎

فارسی بیں تا ببینی نقش ہائے رنگ رنگ ‏ ‏ بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است
راست می گویم من و از راست سر نتواں کشید ‏ ‏ ہرچہ در گفتار فخر تست آں ننگ من است

ان اشعار میں اپنے فارسی گوئی کے جوش کمال میں مجموعۂ اردو کو

اپنے لیے موجبِ ننگ بتایا ہی۔ ورنہ حقیقت میں اُن کا دیوان ریختہ "کم از گلشنِ کشمیر نہیں" کی نفیس اور پاکیزہ تشبیہ سے کہیں بڑھا ہوا ہی۔

غالب کے اشعار کی نسبت ایک عام خیال یہ پھیلا ہوا ہے کہ اُن میں سادگی و صفائی و سلاست جیسی چاہیے نہیں پائی جاتی الفاظ کا انتخاب ان کی ترتیب اور جملوں کی ترکیب عموماً ایسی ہوتی کہ سامع کا ذہن آسانی اور سرعت کے ساتھ معنی مقصود تک نہیں پہنچتا بلکہ انتشار اور اشتباہ میں پھنسا ہو کر معنی مراد سے دور بھٹک جاتا ہی۔ اس میں شک نہیں کہ غالب کے دیوان اردو میں بہ کثرت ایسے اشعار پائے جاتے ہیں کہ جن کے معنی مطلوب تک پہونچنے کے لیے فکر و ذہن پر حدِّ معمول سے زیادہ بار ڈالنے کی ضرورت پڑتی ہی۔ حقیقت یہ ہی کہ سادگی و صفائی بیان جس طرح پامال اور پست یا افتادہ مضامین اور روزمرہ کے سادہ واقعات کے لیے حسنِ کلام ہی اسی طرح دقیق و غامض اور بلند و سنجیدہ مضامین کے لیے بھی حسنِ کمال ہی لیکن دونوں قسم کے مضامین اور تخیلات کے لیے سادگی کلام اور صفائی بیان کا معیار ایک نہیں ہوسکتا درحقیقت کسی کلام کی سادگی یا غیر سادگی کا فیصلہ کرنے میں محض الفاظ کے مانوس۔ کثیر الاستعمال اور عام فہم اور ترکیب کے عامیانہ اور بر زبان روزمرہ ہونے یا نہ ہونے کو پیشِ نظر رکھنا کافی نہیں ہی بلکہ نفسِ مضامین کی نوعیت اور مقتضائے حال کا لحاظ رکھنا شرط ضروری ہی۔ فصاحت کی تعریف یہ کی گئی ہی کہ کلام غیر مانوس اور متروک الاستعمال الفاظ اور ثقیل و ناگوار الفاظ و کلمات سے پاک اور تعقید لفظی و معنوی سے محفوظ ہو۔ بلاغت کے

مفہوم میں فصاحت کے علاوہ الفاظ اور ترکیب کا مقتضائے حال سے مطابق ہونا داخل ہے ظاہر ہے کہ جس چیز کو اصلاح فن میں فصاحت و بلاغت کہتے ہیں اسی کو عام فہم الفاظ میں سادگی و صفائی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

غالب کے کلام کو اس معیار سے جانچو تو صاف نظر آئے گا کہ اس کا اشکال سادگی و صفائی کی کمی یا بہ الفاظ دیگر فصاحت و بلاغت کے نقصان سے نہیں ہے۔ بلکہ اس کا باعث نفس مضامین کا دقیق اور فہم عوام سے بلند تر ہونا ہے۔ اور بس۔

ہم اوپر عرض کر چکے ہیں کہ مرزا غالب کی کوشش ابتدا سے یہ رہی کہ وہ مرزا عبدالقادر بیدل کے رنگ کو اردو میں منتقل کریں۔ قطع نظر ان حصوں کے جو انھوں نے دوستوں کے اصرار سے اپنے دیوان سے خارج کر ڈالے موجودہ دیوان میں بھی جا بجا اس کی صریح شہادتیں پائی جاتی ہیں جن کی طرف ہم ناظرین کو توجہ دلا چکے ہیں۔ غالباً اہل نظر واقف ہوں گے کہ بیدل کی خیال بندی کو سادگی اور سلاست سے کس قدر بعد ہے لیکن ہم نہایت حیرت کے ساتھ دیکھتے ہیں کہ مرزا غالب کے کلام میں باوجود خیال بندی اور معنی آفرینی اور متانت و جزالت اور باوجود تشبیہوں کے جدت اور استعاروں کی طرفگی کے سادگی اور سلاست کا عنصر بھی ایک کافی حد تک موجود ہے۔ بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ دیوان کا ایک معتد بہ حصہ سادگی اور صفائی کا بہترین نمونہ ہے۔

ناظرین کی دلچسپی کے لیے اس قسم کے کچھ اشعار متفرق غزلوں سے لیکر

ہم نقل کرتے ہیں۔

کوئی امید بر نہیں آتی — کوئی صورت نظر نہیں آتی
موت کا ایک دن معین ہے — نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد — پر طبیعت ادھر نہیں آتی
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی — کچھ ہماری خبر نہیں آتی

ہیں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں — کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے
جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں — غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکن زلف عنبریں کیوں ہے — نگہ چشم سرمہ سا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں — ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے — نالہ پابند نے نہیں ہے
ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے — پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے
ہاں کھائیو مت فریب ہستی — ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے
ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب — آخر تو کیا ہے اے نہیں ہے

ابن مریم ہوا کرے کوئی — میرے دکھ کی دوا کرے کوئی
شرع و آئین پر مدار سہی — ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی
بات پر واں زبان کٹتی ہے — وہ کہیں اور سنا کرے کوئی
بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ — کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی
نہ سنو گر برا کہے کوئی — نہ کہو گر برا کرے کوئی

روک لو گر غلط چلے کوئی — بخش دو گر خطا کرے کوئی

جب توقع ہی اٹھ گئی غالب
کیوں کسی کا گلا کرے کوئی

مندرجہ بالا اشعار جن غزلوں سے ہم نے لیے ہیں ان کا عام رنگ یہی ہے اور ایسی غزلوں کی کافی تعداد دیوان میں موجود ہے۔ یہاں ہم شاعری کے ایک اہم نکتہ کی طرف ناظرین کی توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں۔ جس سے مرزا کے مذاقِ سلیم اور اعلیٰ سلیقۂ شاعری کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ سادگی اور صفائی کی جو بحریں انھوں نے اختیار کی ہیں وہ بہت چھوٹی اور اس مقصد کے لیے نہایت ہی موزوں ہیں۔ دوسری بات قابلِ توجہ یہ ہے کہ مرزا کے کلام کے اس حصّہ میں باوجود انتہائے سادگی اور سلاست کے حتیٰ کہ ان میں کے بعض اشعار فارسی اضافات سے بھی عاری ہیں ان کا خاص رنگ صاف طور پر عیاں ہے۔ ملاحظہ ہو:

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا — نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا
نوازش ہائے بیجا دیکھتا ہوں — شکایت ہائے رنگیں کا گلا کیا
دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر — ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا
سن اے غارت گرِ جنسِ وفا سن — شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا

درد منت کشِ دوا نہ ہوا — میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی — بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

جان دی۔ دی ہوئی اُسی کی تھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا دل جگر تشنۂ فریاد آیا

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی کیوں ترا راہ گزر یاد آیا

پھر ترے کوچہ کو جاتا ہے خیال دلِ گم گشتہ مگر یاد آیا

اے تجلی تری سامانِ وجود ذرہ بے پرتو خورشید نہیں

کہتے ہیں جیتے ہیں امید پہ لوگ ہم کو جینے کی بھی امید نہیں

مرزا کے اچھوتے خیال۔ اِن کی بلند پروازی اور تعمق مضامین کی مثال میں یہاں ہم چند اشعار نقل کرتے ہیں۔

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

کیا نفیس اور نرالا خیال ہے۔ زندگی کا لطف اسی لیے ہے کہ لوگوں کو مرنے کا یقین ہے ورنہ دنیا کا کوئی کام بھی انسان کی سستی اور کاہلی کے باعث نہ ہوتا۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

اگر انسان کا وجود نہ ہوتا تو وہ خدا ہوتا۔ پہلے مصرعہ میں کہہ چکے ہیں کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

کیا شوخی ہے۔ در پردہ خدا سے شکایت کرتا ہے۔ گو بظاہر درخواست ہے کہ میرے بے شمار گناہوں کا حساب مجھ سے نہ طلب کرے

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لیکر بہشت کو[1]

علو خیال قابل ملاحظہ ہے۔ دوزخ و بہشت کا خیال عشق حقیقی میں خارج ہوتا ہے اور ایسی طاعت اور ایسا سجدہ نیاز لا حاصل ہے جس میں دوزخ کا خوف اور بہشت کی حرص و ہوس ہو۔

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

جو لوگ تصوف کا مذاق رکھتے ہیں اور مصطلحات تصوف سے بھی واقف ہیں۔ کچھ وہی لوگ اس شعر کا لطف اٹھا سکتے ہیں

---

[1] حضرت آسی غازی پوری فرماتے ہیں

تیرے کوچہ میں جسے اہل ہوس حور و قصور
کس جہنم میں اسے حرص ہوا نے بھیجا

ہی پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

کیا بلند مرتبہ ہی اور کتنی منزلیں طے کر چکے ہیں جس جگہ اور وں کا منتہٰی

انتہا کو پہنچتا ہی وہاں سے حضرتِ غالب کا مذہب[1] شروع ہوتا ہی

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام

مہرِ گردوں ہی چراغ رہ گذارِ بادیاں

نئی نئی اور عجیب و غریب تشبیہیں اختراع کرنا کچھ انھیں کا کام تھا۔

دامِ ہر موج میں ہی حلقۂ صد کامِ نہنگ

دیکھیں کیا گزرے ہی قطرے پہ گہر ہونے تک

استعارات و کنایات میں بھی جو شاعری کے لطف کو دوبالا کر دیتے ہیں حضرت کو یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ قطرہ اپنی اصل یعنی بحر سے جدا ہوا ہی اور قبل اس کے کہ وہ بحر میں مل جائے۔ معلوم نہیں کیا کیا منازل اس کو طے کرنے ہیں۔ اسے مسئلۂ تناسخ سمجھو یا مشربِ صوفیہ

رازِ معشوق نہ رسوا ہو جائے

ورنہ مرجانے میں کچھ بھید نہیں

کیا سادگی ہی اور رازِ حقیقت کا کیا ہی انوکھا انکشاف ہی

---

[1] حضرت آسی غازی پوری نے بھی اس مضمون کو نہایت عمدہ پیرایہ میں ادا کیا ہی ؎ نظر و ناظر و منظور نہ جب ایک ہوئے * کیا ملا دو نے قیامت میں خدا سے کیے سوا

رونقِ ہستی ہی عشق خانہ ویراں ساز کی
انجمن بے شمع ہی۔ گر برق خرمن میں نہیں

انسانی ہستی کا جزو اعظم محبت و عشق ہی اور انسان کے لیے محبت کا ہونا لازمی بتاتے ہیں۔ خواہ وہ محبت ملکی ہو یا قومی حقیقی ہو یا مجازی اس مطلب کو کس خوبی سے ادا کیا گیا ہی۔

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

ذوق کو یہ شعر نہایت پسند تھا اور اکثر کہا کرتے تھے کہ مرزا کو اپنے اچھے اشعار کی خود خبر نہیں ہوتی۔

بڑے بڑے فلسفی اپنے دقیق مسائل کا جواب اس الہامی کتاب دیوان غالب سے تلاش کر سکتے ہیں۔ فلسفہ کا غالباً سب سے اہم ترین مسئلہ ہی کہ وجہ آفرینش دنیا کیا ہی۔ ہر فلسفی نے اس کا جواب اپنی انبساط کے موافق دیا ہی۔ مرزا غالب اس کا جواب یوں دیتے ہیں

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خودبیں

کس خوبی کے ساتھ دو مصرعوں میں مرزا نے اس مسئلہ کا حل کیا ہی مبداء عالم حسن ہی اور حسن اظہار کا متقاضی ہی۔ اس لیے دنیا عدم سے

---

[1] اسی مضمون کو حضرت آسی غازی پوری نے نہایت خوبی سے ادا کیا ہی

وجود میں آئی۔

عذر شراب خواری میں حضرت کا ایک شعر حقیقت میں ایک دفتر معنی ہے اور جتنا اُسے پڑھیے، لطف اُتنا ہی دوبالا ہوتا ہے۔ یورپ کے نامور شعرا کے کلام[1] راقم الحروف کی نظر سے گزرے ہیں۔ لیکن اس موضوع پر اس پایہ کا ایک شعر بھی نہیں ملا۔ اسے صوفیائے کرام کے مسلک کی تشریح کہیے یا جو چاہے سمجھ لیجیے۔ کیونکہ اس کی کیفیت الفاظ میں ادا نہیں ہو سکتی ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو

ایک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

اہل تصوف اگر اس جام جہاں نما یعنی دیوان غالب میں اپنا عکس دیکھنا چاہیں تو اُن کو معلوم ہو جائیگا کہ اُن کے تمام دقیق مسائل کا کس خوبی کے ساتھ اس شیخ نے حل کیا ہے۔ کیا شعر ہیں اور کن رموز فطرت کا اظہار کیا ہے فرماتے ہیں ؎

حسن پھر کس کام کا جب چاہنے والا نہ ہو

سچ ہے تجھ سے دل ربا کو لطف تنہائی نہ تھا

---

[1] غالب کے سمجھنے میں جو مدد ایک عرصہ سے مجھے اپنے عزیز دوست مسٹر عبد المجید خواجہ ایم۔ اے (کینٹب) بیرسٹر ایٹ لا سے جو خود بھی شاعر ہیں ملتی رہی ہے اس کا اظہار اس جگہ شاید بے موقع نہ ہو۔ اگر غالب کی عظمت کو ذرہ برابر بھی صحیح طور پر اس حقیر نے سمجھا ہے تو یہ انہیں کے فیض صحبت کا اثر ہے۔ میں اپنے دوست کا

اک ذرۂ زمیں نہیں بیکار باغ کا
یاں جادہ بھی فتیلہ ہی لالے کے داغ کا

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہی آئنہ دائم نقاب میں

غالب کا مذہب قیود اور پابندیوں سے پاک ہی۔ وہ اس منزل پر ہیں کہ جہاں ہندو مسلمان کی تمیز باقی نہیں رہتی ؎

وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہی
مرے بتخانہ میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

مغربی تہذیب کے والہ و شیدا اکثر فرماتے ہیں کہ غالب میں سوا گل و بلبل کے افسانوں کے اور کیا رکھا ہی۔ ان کے دل حسن و حقیقت سے ناآشنا۔ ان کے دماغ جذباتی کیفیات سے بے بہرہ۔ بھلا وہ ان رموز کو کیا سمجھیں۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے مرزا غالب نے لکھا ہی۔

مطلب ہی ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہی دشنہ و خنجر کہے بغیر
ہرچند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہی بادہ و ساغر کہے بغیر

کاش غالب کو بھی کوئی فِٹز جیرالڈ[1] مل جاتا جو اس کے کلام کے رموز و نکات کو کسی مغربی زبان میں اہلِ مغرب کے سامنے پیش کرتا۔

تہ دل سے ممنون ہوں کہ اُن کی بدولت اس ناچیز کی چشم کو رنے روشنی کی شعاعیں دیکھیں ۱۲ محمود

[1] یہ وہ بزرگ ہیں جنھوں نے عمر خیام کا ترجمہ انگریزی میں کیا اور خوبی ترجمہ کے

اس بار عظیم کا بیڑا اگر سر جیمز ٹامس جو خود بھی معرفت الٰہی کی مظہر پر منجد مرا ہی اٹھائے تو کیا عجیب ہو کہ اُسے کچھ کامیابی ہو جائے۔ غالب کے کلام کی یہ عظمت اس کے تخیل و ادراک کا وہ عالم۔ مگر افسوس غالب کا مزار دلی میں جس حالت میں پڑا ہوا ہے اُسے دیکھکر ایک فلسفی کا قول یاد آتا ہے جس نے کہا تھا کہ "اگر تم کو کسی قوم کی حالت کا اندازہ کرنا ہو تو تم اس کے مزارات پہ چلے جاؤ" غالب کے مزار پر جاکر جو کیفیت مجھ پر طاری ہوئی وہ احاطۂ تحریر سے باہر ہے۔ مجھے دیمیر میں گوئٹے کے مزار کے دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا ہے۔ ایک وہاں کی قدر دانی ہے اور ایک یہاں کی کس مپرسی دونوں کا فرق دیکھ کر اقبال کا مشہور شعر جو اس نے غالباً ایسی ہی کیفیت سے متاثر ہو کر لکھا ہوگا بے اختیار میری زبان پر جاری ہوگیا

آہ تو اُجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے

گلشن دیمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

ہندوستانیوں کی زندگی کا خاتمہ بہ حیثیت ایک قوم کے ۱۸۵۷ء کے مشہور ہنگامے سے پہلے ہو چکا تھا۔ اور اس وقت کے شعرا اور صاحبان سیاست دونوں نے اسے محسوس کیا۔

باعث عمر خیام کا نام آج یورپ میں روشن ہے۔

لہ گوئٹے جرمنی کا سب سے زیادہ مشہور شاعر گزرا ہے جس کا زمانہ ۱۷۴۹ء سے ۱۸۳۲ء تک رہا۔ اس کا معرکۃ الآرا ڈراما فاسٹ ہے وہ شہر دیمیر میں رہتا تھا اور وہیں مدفون ہے ۱۲۔

اہلِ سیاست کے احساس کا نتیجہ ہنگامہ ہوا اور شعرا نے مختلف طریقوں سے اس پر نوحہ کیا۔ مرزا غالب کا احساس گہرا تھا اور انھوں نے نہایت پُر درد پیرایہ میں اس کا اظہار کیا ہے ؎

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں
یا رب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

پھر کہتے ہیں ؎

ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے
یاں تک مٹے کہ آپ ہی اپنی قسم ہوئے

ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے بعد دِلّی اور نواحِ دِلّی پر جو آفتیں ٹوٹیں انھوں نے ہزارہا بندگانِ خدا کو بے خانماں اور تباہ کر دیا شہزادے اور شہزادیاں جنگلوں میں مارے مارے پھرتے تھے۔ دِلّی اُجڑ گئی اور شرفا کے مکان ویران بنا دیے گئے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں "قصہ مختصر شہر صحرا ہو گیا" ان واقعات کو مرزا نے بچشم خود دیکھا تھا۔ غالباً اسی کے متعلق فرماتے ہیں ؎

کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم
دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

اپنے ملک و شہر کے لوگوں پر جو مصیبتیں نازل ہوئیں اُن پر مرزا خون کے آنسو بہاتے ہیں ایک خط میں لکھتے ہیں "یہاں اغنیا اور اُمرا کے ازواج و اولاد بھیک مانگتے پھریں اور میں دیکھوں۔ اِس مصیبت کی تاب لانے کو جگر چاہیے (اردوئے معلی صفحہ ۲۸۷) ملک کے تباہ ہونے اور دلّی کے اُجڑ جانے اور قومی ہستی کے مٹ جانے کا جو درد و غم مرزا کو ہو وہ اُن کے خطوط سے جو اردوئے معلی [۱] میں موجود ہیں صاف عیاں ہے۔

ایک خط میں لکھتے ہیں "ٹول ٹوٹی [۲] کوئی چیز ہے وہ جاری ہو گئی ہے۔ سوائے اناج اور اُپلے کے کوئی چیز ایسی نہیں جس پر محصول نہ لگا ہو۔ جامع مسجد کے گرد پچیس پچیس فٹ گول میدان نکلیگا۔ دکانیں حویلیاں ڈھائی جاویں گی۔ دار البقا فنا ہو جائے گی۔ رہے نام اللہ کا (اردوئے معلی ۱۲۹) خاص کر مسلمانوں پر جو مظالم توڑے گئے وہ ناقابل بیان ہیں مرزا لکھتے ہیں "کہ مسلمان آدمی شہر میں سڑک پر بن ٹکٹ پھر نہیں سکتا"

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں	آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا
دل نہیں ورنہ دکھاتا تجھ کو داغوں کی بہار	اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا

۱ اردوئے معلی صفحہ ۱۱ ، ۲ ٹون ڈیوٹی سے مراد ہے ۱۲

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالبؔ کہ دل
دیکھ کر طرز تپاکِ اہل دنیا جل گیا

جو مصائب اہلِ ہند پر ۱۸۵۷ء کے کچھ پہلے اور پھر اُس کے بعد نازل ہوئے وہ بجائے خود آئندہ کے لیے ایک سبق تھے جس کو مرزا نے کس خوبی سے ادا کیا ہی اور اُن کی خواہش ہو کہ اُن کے ہم وطن ان سے سبق حاصل کریں اور آئندہ کے لیے متنبہ ہوں ؎

اہلِ بینش کو ہو طوفانِ حوادث مکتب
لطمۂ موج کم از سیلیٔ استاد نہیں

دلی فتح ہونے کے بعد نہ صرف اہلِ دلی نے بلکہ تقریباً تمام ملک نے انگریزی سرکار کی اطاعت قبول کر لی اور طرح طرح سے اپنی وفاداری کا اظہار کرنے لگے لیکن حکامِ انگریزی کا جوشِ انتقام کم نہ ہوا۔ ہنگامے کے حالات اُن کو فراموش نہ ہوئے۔ لوگوں کو سزائیں دی گئیں۔ اُمرا کی جاگیریں ضبط ہوئیں غربا کے مکانات مسمار کر دیے گئے مرزا ان حالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "نہ کوئی قانون ہو نہ قاعدہ ہو نہ نظیر کام آئے نہ تقریر پیش جائے اور پھر اس کا ذکر شکایت کے پیرایہ میں یوں کرتے ہیں ؎

وائے محرومیٔ تسلیم و بدا حالِ وفا
جانتا ہو کہ ہمیں طاقتِ فریاد نہیں

ایک اور جگہ رقم فرماتے ہیں "بھائی بُری آ بنی ہو،، انجام اچھا نظر نہیں آتا۔ قصہ مختصر یہ کہ "قصہ تمام ہوا،، اور پھر جو سزائیں دی گئیں

ان کی سختی کی گویا یوں شکایت کرتے ہیں ؎

حد چاہیئے سزا میں عقوبت کے واسطے

آخر گناہگار ہوں۔ کافر نہیں ہوں میں

سنہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد فاتح کے جوشِ انتقام نے مفتوح کے ملک و دولت ہی پر قناعت نہ کی بلکہ ان کے سرمایۂ ناز کارنامے اور فن و کمال یہاں تک کہ ان کی تہذیب کو مٹانے اور برباد کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ یہ ممکن نہ تھا کہ مرزا جیسے باکمال شاعر اور صاحبِ دل پر اس کا اثر نہ ہوتا۔ چنانچہ جس پوشیدہ مگر دردناک پیرایہ میں انھوں نے اس کا مرثیہ لکھا وہ حقیقتاً دل ہلا دینے والا ہے اور ہندوستان کی مٹی ہوئی عظمت کو یاد دلا کر خون کے آنسو رُلاتا ہے۔ اس کے چند اشعار نقل کیے بغیر دل نہیں مانتا۔

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے

اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل

زنہار اگر تمہیں۔ ہوسِ نائے و نوش ہے

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط

دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے

یا صبح دم جو دیکھیے آکر تو بزم میں
نے وہ سرور و شور نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

ایک دوست کو لکھتے ہیں "بھائی ہندوستان کا قلمرو بے چراغ ہو گیا۔ لاکھوں مر گئے، جو زندہ ہیں اُن میں سیکڑوں گرفتارِ بندِ بلا ہیں۔"

ایک دوسری جگہ شاہی خاندان کی تباہی کا ذکر یوں کرتے ہیں:-

"معزول بادشاہ کے ذکور جو بقیۃ السیف ہیں وہ پانچ پانچ روپیہ مہینہ پاتے ہیں۔" حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی تاریخ میں بہت کم فاتحین نے اپنے مغلوب حریف کے اہل و عیال و نسل کے ساتھ اس قسم کا سخت برتاؤ کیا ہوگا جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے نمایندوں نے بہادر شاہ کے خاندان کے ساتھ روا رکھا۔ ان تمام خیالات کے ہجوم سے مرزا اس قدر متاثر ہیں کہ جس کا اندازہ مشکل سے کیا جاتا ہے۔ اپنے دردِ دل کا اظہار ذیل کے اشعار میں کس خوبی سے اور کتنے پُردرد الفاظ میں کرتے ہیں ؎

گلشن میں بندوبست بہ رنگِ دگر ہے آج
قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج
آتا ہے ایک پارۂ دل ہر فغاں کے ساتھ
تارِ نفس کمندِ شکارِ اثر ہے آج

غالب کے دیوان میں جا بجا ایسی مثالیں ملتی ہیں جن سے اُن کے حب وطن کا اظہار ہوتا ہے اور وہ بار بار اپنے ملک کی بدنصیبی پر روتے ہیں ایک اور جگہ فرماتے ہیں ؎

ہندوستان سایۂ گل پایۂ تخت تھا — جاہ و جلال عہد وصالِ بُتاں نہ پوچھ
ہر داغ تازہ یک دلِ داغ انتظار ہے — عرضِ فضائے سینۂ درد امتحاں نہ پوچھ

ایک خط میں لکھتے ہیں۔ خداوند نعمت کیا تم دلّی کو آباد اور قلعہ کو معمور اور سلطنت کو بدستور سمجھے ہوئے ہو؟ بادشاہ کے دم تک یہ باتیں تھیں" (اردوئے معلی ۲۰۳)

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں "ہائے لکھنؤ! کچھ نہیں کھلتا کہ اُس بہارستان پر کیا گزری۔ اموال کیا ہوئے۔ اشخاص کہاں گئے۔ خاندانِ شجاع الدولہ کے زن و مرد کا کیا انجام ہوا (اردوئے معلی صفحہ ۲۰۹) ان تمام واقعات دل خراش پر روتے ہیں اور فرماتے ہیں ؎

یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

کس قدر معنی خیز اور درد ناک شعر ہے۔ اگر مرزا غالب کے دیوان کو بغور پڑھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کو اپنے ملک سے کس درجہ محبت ہے۔ اپنے ضائع شدہ قومی وقار کا کس درجہ رنج ہے اور اپنی کھوئی ہوئی ملکی آزادی پر ان کے آنسو کبھی نہیں تھمتے فرماتے ہیں ؎

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں — لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شام فراق میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

اس وقت ملک کی جو حالت تھی اُسے یاد کر کے کہتے ہیں ؎

کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے

جس میں کہ ایک بیضۂ مور آسمان ہے

اور پھر اپنی ناچاری و مجبوری دیکھ کر صبر و شکر کی ہدایت کرتے ہیں ؎

تاب لاتے ہی بنے گی غالب واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

اپنی ملکی آزادی کے جانے پر ہر چند صبر کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن ضبط نہیں ہوتا اور بے اختیار چیخ اُٹھتے ہیں ؎

بس کہ روکا میں نے اور سینے میں اُبھریں پے بہ پے

میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہو گئیں

اسی غزل میں ایک موقع پر فرماتے ہیں کہ حکومت ہی اصل میں قوموں کی زندگی کا باعث ہوتی ہے۔ اور جب کسی قوم کو حکومت حاصل ہو گئی گویا سب کچھ مل گیا اور اُس قوم میں زندگی آ گئی ؎

جاں فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آ گیا

سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں

جام کا اشارہ صاف سلطنت کی طرف ہے ایک موقع پر اپنے ابنائے ملک کو مخاطب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر تم میں حب وطن کا سچا جوش ہے۔ اور آزادی کی خواہش حقیقی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اپنا اثر نہ کرے۔ حکومت و سلطنت کسی خاص شخص یا قوم کی ملکیت نہیں ہوا کرتی۔ جیسا کہ جمشید کی خاتم

اس کی خاص ملکیت تھی ؎

عشقِ تاثیر سے نومید نہیں　　جاں سپاری شجرِ بید نہیں
سلطنت دست بدست آئی ہے　　جامِ مَے خاتمِ جمشید نہیں

خمارِ حب الوطنی آسانی سے نہیں اترتا اور جب کسی قوم میں اس کا احساس ہو گیا تو اس جنون کو دور کرنا کچھ آسان کام نہیں ہے اس مضمون کو مرزا غالب نے کس خوبی سے ادا کیا ہے ؎

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی
یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائینگے کیا

جب انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ کیا اور سلطنت کے مالک بن بیٹھے اُس وقت سے برابر اُن کا یہی دعویٰ رہا کہ وہ ہندوستان میں صرف ہندوستانیوں کے مفاد کی غرض سے حکومت کر رہے ہیں۔ اور یہ کہا گیا کہ ملک ہندوستان کی حکومت ہندوستانیوں کو رفتہ رفتہ دی جائے گی۔ یہاں تک کہ ایسا وقت آئے گا جب حکومت کی ساری ذمہ داری اہلِ ہند کے سپرد کر دی جائے گی۔ مرزا غالب کہتے ہیں اور حسرت و مایوسی کے ساتھ کہتے ہیں ؎

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک　　کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک
دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ　　دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک
عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب　　دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

اپنے درد دل کا اظہار نہ کرنا اور اپنے مصائب پر خاموش رہنا۔ اس بات کی دلیل ہے کہ قوم میں زندگی باقی نہیں ہے۔ اور قوم مردہ ہو چکی ہے بلکہ

ایسی خاموشی قوم کے مرگ کا باعث ہوتی ہے۔ اس خیال کو کس عمدگی سے اور کتنی اچھی اور خوب صورت تشبیہ کے ساتھ مرزا نے ادا کیا ہے ؎

زبان اہلِ زباں میں ہے مرگ خاموشی
یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانِ شمع

اس زمانہ میں جو حالات تھے اُس کے اعتبار سے صاف صاف الفاظ میں اِن خیالات کا اظہار کرنے سے وہ معذور تھے۔ اور مجبوراً ایسے خیالات کا اظہار نہایت گہرے اور پوشیدہ معنوں ہی میں کر سکتے تھے چنانچہ ایک خط میں ملک کی تباہی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔
مفصل حال لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں اور پھر کہتے ہیں ؎

زبانِ اہلِ زباں میں ہے مرگ خاموشی — یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانِ شمع

اور پھر کہتے ہیں:۔

آتش کدہ ہے سینہ مرا رازِ نہاں سے — اے وائے اگر معرضِ اظہار میں آوے

ایک اور جگہ جتایا ہے ؎

گر خاموشی میں فائدہ اخفائے حال ہے — خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

مرزا غالب کے اشعار میں عموماً کئی معنے نکالے جا سکتے ہیں جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں

گنجینۂ معنی کا طلسم اُس کو سمجھیے! — جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

علاوہ حسنِ معنی کے اُن کے اشعار ایک وجدانی کیفیت پیدا کرتے ہیں جس کا لطف کچھ وہی لوگ اُٹھا سکتے ہیں جو اہلِ دل اور صاحب ذوق ہیں۔

شاعر کے لیے کچھ یہ ضروری نہیں ہے کہ شعر کہتے وقت اُس کے ذہن میں وہ تمام معنی و مضامین موجود ہوں جو اُس کے خیال کی پرواز الفاظ کی بندش وغیرہم کے باعث متاخرین پیدا کر سکیں۔ غالب کے دیوان کو اُٹھا کر دیکھ لو کہ اس کے اشعار ہر زمانہ کی آب و ہوا اور ہر طبیعت والے کی متابعت کرتے ہیں یا نہیں۔

اکثر صاحبان نے یہ اعتراض کیا ہے کہ غالب سیاسی خیالات سے بے بہرہ تھے۔ اور اُن کو ملکی و قومی تباہی کا بالکل احساس نہ تھا۔ میرے عزیز دوست سید راس مسعود صاحب جو اس وقت اردو علم و ادب کی بہت کچھ خدمت انجام دے رہے ہیں اور جن کی ادبی دلچسپیوں کے باعث ان کے اعتراض کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں۔ "غالب کی اکثر تحریرات میرے پاس موجود ہیں جن میں انھوں نے انگریزوں کی اور انگریزی طرزِ حکومت کی بہت سی تعریفیں کی ہیں" مجھے اس سے انکار نہیں۔ لیکن کسی غیر ملکی حکومت یا طرزِ حکومت کی تعریف و توصیف کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ شاعر ملکی و قومی جذبات سے بے بہرہ ہے" اسی لیے میں نے اس تحریر میں جا بجا خود مرزا کی عبارتیں ان کے مطبوعہ خطوط سے نقل کر دی ہیں۔ تاکہ تاریخی حیثیت سے بھی پتہ چل جائے

کہ وہ اُن حالات سے کس درجہ متاثر تھے۔ اور اُن کو اپنے ملک کی مٹی ہوئی عظمت کا کتنا گہرا احساس تھا۔ یہ سچ ہے کہ ہمارے شعرا کا طرزِ بیان شعرائے یورپ کے طرزِ بیان سے بالکل جداگانہ ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تصوف کے بیان سے ہماری شاعری پُر ہے۔ لیکن تصوف کے بڑے بڑے مسائل بھی "بادہ و ساغر" اور "گل و بلبل" ہی کے الفاظ میں حل کیے گئے ہیں غالب نے کچھ تو اُس زمانہ کے حالات کے اعتبار کے باعث اور کچھ خود اردو شاعری کے خاص طرزِ بیان کی وجہ سے اگر ملکی و قومی جذبات کو الفاظ میں چھپایا ہے تو پھر تعجب کا کیا مقام ہے۔ آج بھی جب کہ اردو شاعری کا طرزِ بیان بہت کچھ بدل چکا ہے۔ اقبال جیسا شہرۂ آفاق شاعر اپنے جذبات کو بہت کچھ الفاظ میں چھپاتا ہے۔ غالب کے فارسی دیوان میں بھی جا بجا اِن جذبات کا اظہار کیا گیا ہے۔ لیکن یہاں اس کا ذکر کرنا طول ہوگا۔ اور اس کے علاوہ اس موقع پر فارسی کلام پر بحث کرنا خارج از موضوع بھی ہے صرف ایک تمثیل کافی ہوگی۔

۵۷ء کے ہنگامے کے ختم ہونے پر جب عام معافی کا اعلان ہوگیا تو مرزا غالب نے ایک زبردست قصیدہ لکھا تھا جو فن شاعری اور قادر الکلامی کا ایک گراں بہا اور نادر الوجود نمونہ ہے جس کے بعض حصے مولینا حالی نے بھی یادگار غالب میں نقل کیے ہیں۔ اس قصیدے کو اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو اُس سے ہمارے گزشتہ بیان کی پوری طرح تائید ہوتی ہے۔ ناظرین کی صرف ادبی دلچسپی کی غرض سے چند شعر یہاں

دو غریب قصیدے کے نقل کرتا ہوں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قریباً
ہر شعر میں ذم کا پہلو نمایاں ہے۔

در روزگار ما نتوان شمار یافت　　خود روزگار آنچہ دریں روزگار یافت
پرکار تیز گرد فلک درمیاں مہیں　　حق داد داد حق کہ بہ مرکز قرار یافت
آمد اگر بفرض ز بالا بلا فرود　　بر روئے خاک پیچ و خم زلف یار یافت
در خاک و باد و آتش و آب آشتی فزود　　ایں پرورش کہ خلق ز پروردگار یافت
ناچار خندہ داد گرایش نمی کند　　در دہر ہر چہ صورت ازیں ہر چہار یافت
گر خواجہ بندہ را خط آزادگی نوشت　　ہم بندہ سرائے خودش بندہ وار یافت
در بندہ خود ز خشم خط بندگی درید　　توقیع خوشدلی ز خداوندگار یافت
رہزن متاع خویش بر ابن السبیل ریخت　　کودک رضائے لہو ز آموزگار یافت

ہندو مسلمانوں کے اتفاق کا اتحاد کا جو غلغلہ آج کل مچا ہوا ہے اور ایک دوسرے کو اپنا ہمدرد بھائی بنانے پڑتا ہوا ہے اور ساری اختلافات مٹانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کے خاص مذہبی معاملات میں بھی ہندوؤں نے عملی ہمدردی کا اظہار کرنا شروع کر دیا ہے۔ مرزا غالب نے اس ضرورت کو بہت پہلے محسوس کیا تھا اور مسلمانوں سے گویا وہ یہ کہتے ہیں

زنار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال
رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھکر

غالب بیشک انسانی ہستی کا اعلیٰ مفسر ہی اور اس کا کلام ہر زمانہ میں انسان کے دلی جذبات و خیالات کی تفسیر کر کے لوگوں کو خوش کرتا رہیگا۔ اس ہیچمیرز کی رائے میں غالب شیلی کی پرواز کیٹس کی فصاحت گوئٹے کی عمیق النظری۔ شلر کی بلند خیالی۔ فرنسس ٹامس کے تخیل۔ مومن کے درد۔ سودا کی ظرافت اور میر کی سادگی کا مجموعہ ہی۔

"میر آفتاب آرزومند ہی کہ تیرے نغموں کا ہم نوا ہو جائے! لیکن ایک آواز کے لیے بیکار تڑپ رہا ہی۔ میں بولتا ہوں۔ لیکن بول نغمہ نہیں بنتے لاچار عاجز ہو کر چیخ اٹھتا ہوں"

(ٹیگور)

خلاصہ یہ کہ مرزا کی شاعری میں ہزارہا نکتے ایسے پائے جاتے ہیں جو ناقابلِ بیان ہیں۔ اِن کے اشعار کو پڑھ کر جو حالتیں یا کیفیتیں طاری ہوتی ہیں اُن کو الفاظ کے ذریعہ سے ظاہر کرنا ناممکن ہی۔ بقول خواجہ حافظ شیرازی سے

لطیفہ ایست نہانی کہ عشق ازو خیزد
کہ نام آں نہ لب لعل و خطِ زنگاریست

خاکسار محمود۔ از دہلی
۱۸؍ اکتوبر سنہ ۱۹۱۶ء[لے]

لے سب سے پہلے پاکٹ ایڈیشن طبع اول کے لیے ڈاکٹر صاحب نے یہ مقدمہ اکتوبر سنہ ۱۹۱۶ء میں لکھا تھا اس کے بعد جب اس دیوان کے طبع ثانی کی نوبت آئی تو اُنھوں نے سنہ ۱۹۲۱ء میں اس پر نظر ثانی فرما کر اس کو اور زیادہ دلچسپ بنا دیا تھا۔ اس ایڈیشن میں جو مقدمہ نقل کیا گیا ہے وہ وہی سنہ ۱۹۲۱ء کا مرتبہ مقدمہ ہے۔ اس وقت سنہ ۱۹۲۲ء میں ہمارا یہ ایڈیشن ایسے وقت میں پریس میں جا رہا ہے جبکہ ڈاکٹر صاحب اپنی ملکی اور قومی خدمات کے بدولت جو وہ تحریک خلافت اور ترک موالات کے سلسلے میں آج کل انجام دے رہے ہیں قید فرنگ میں ہیں۔ اس لیے ہم اُن سے یہ درخواست نہ کر سکے کہ وہ اس مقدمے پر ایک اور نظر ڈال کر اس کو زیادہ مکمل اور دلچسپ بنا دیں ۱۲۔

(مولف)
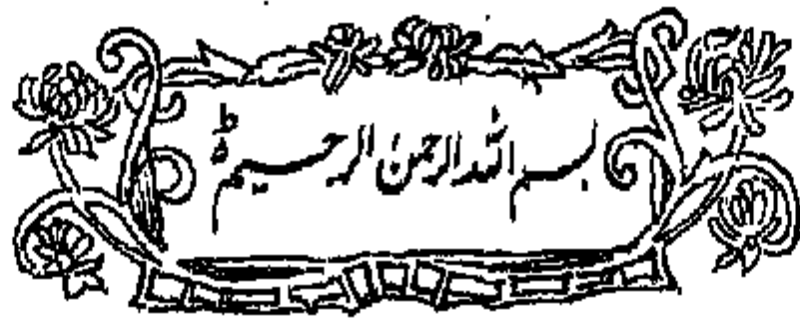
دیباچہ طبع چہارم

ہماری مطبوعات میں جو قبول عام اردو دیوان غالب کو حاصل ہوا ہی وہ ہمیشہ ہمارے لیے باعث فخر رہے گا۔ اس کا تیسرا ایڈیشن ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا تھا۔ پورا سال بھی نہ گزرنے پایا کہ وہ ختم ہو گیا۔ اور سنہ ۱۹۲۱ء کی پہلی ششماہی میں طبع چہارم کی ضرورت ہوئی۔ چونکہ طبع سوم کی چھوٹی خوشنما تقطیع عام طور پر پسند کی گئی۔ اس لیے اس مرتبہ وہی شان قائم رکھی گئی۔ اس دفعہ صحت اور خوشنمائی کا زیادہ اہتمام کیا گیا ہی۔ طبع سوم کے واسطے جو مقدمہ ڈاکٹر سید محمود صاحب نے لکھا تھا اس کو صاحب موصوف نے اپنی نظر ثانی سے زیادہ دلچسپ اور کارآمد بنا دیا ہی جس کے لیے وہ ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں۔

میں نے شرح کو مکمل کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ بعض اشعار کی شرح کے ذیل میں فارسی اساتذہ سے غالب کی مضمون آفرینی اور تخیل کا مقابلہ کرکے دلچسپیِ ناظرین کا سامان بہت کچھ زیادہ کردیا ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے اشعار پر مفید نوٹ اضافہ کئے گئے ہیں۔ شرح کی وہ خصوصیت بھی قائم رکھی گئی ہے جس کی طرف رسالۂ معارف نے اپنے ریویو میں اشارہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "یہ شرح دیکھنے کے قابل ہے اس میں شارح نے نہایت اختصار کے ساتھ اشعار کا مطلب بیان کیا ہے اور کوشش کی ہے کہ خود غالب کی زبان سے اس مطلب کو ادا کیا جائے"

غیر مطبوعہ کلام کے ذیل میں ایک ایسے قصیدہ اور قطعۂ تاریخ کو جگہ دی گئی ہے جو اس سے پہلی اشاعتوں میں درج نہ ہوا تھا۔ غالب کے غیر مطبوعہ کلام کی جو اب روشنی میں لایا جا رہا ہے دو قسمیں ہو سکتی ہیں۔ ایک وہ کلام جو اُن کے مروجہ دیوان کی ترتیب کے وقت موجود تھا۔ اور جس کو انھوں نے غیر قابلِ برداشت سمجھ کر اپنے انتخاب میں نہیں لیا تھا۔ اور جس کی نسبت خود یہ لکھا ہے:-

"امید کہ تحسین سرایانِ سخنورستائے پراگندہ ابیاتے را کہ خارج از ایں اوراق یابند از آثار تراوش رگِ کلکِ ایں نامہ سیاہ نشناسند" دوسرا غیر مطبوعہ کلام وہ ہے جو دیوان کے طبع ہونے کے بعد تصنیف ہوا۔ اس دیوان میں غیر مطبوعہ کلام کے تحت میں جو اشعار ہم نے لکھے ہیں وہ زیادہ تر

آخر الذکر قسم کی ہیں۔ ممکن ہے کہ کوئی قطعہ یا غزل ایسی بھی ہو جو مسودے کے خارج شدہ کلام سے ہو۔ اس خارج شدہ کلام سے مرزا نے جس تحقیر کے ساتھ اپنی بے تعلقی کا اظہار الفاظ بالا میں کیا ہے۔ اس کو دیکھتے ہوئے اس کلام کی اشاعت اگرچہ ایک اخلاقی جرم کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ لیکن اس زمانہ میں فدایان غالب کی آویزش اُن کے کلام کے ساتھ اس درجہ ترقی کر گئی ہے کہ وہ غالب کے قلم سے نکلے ہوئے ہر رطب و یابس کو سر اور آنکھوں پر بلکہ دل میں جگہ دینے کو تیار رہیں۔ پبلک کے اسی ذوق کو پورا کرنے کی غرض سے مرزا صاحب کے قدیم دیوان کا وہ مکمل نسخہ جس میں خارج شدہ نظمیں اور غزلیں بھی شامل ہیں۔ بھوپال کے کتب خانۂ سرکاری کی الماری سے نکال کر بازار میں لانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

مرزا نے اپنے دیوان کا انتخاب کرتے وقت جب زوائد کو اس سے خارج کیا ہوگا تو یہ بات وہم میں بھی نہ گزری ہوگی کہ جن کو وہ حشو و زوائد سمجھتے ہیں۔ پچاس برس بعد لوگ اس کو نعمت اور بیش بہا خزانہ تصور کریں گے۔ مرزا غالب کے اس دیوان کو مرحوم ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری نے ترتیب دیا تھا اور اب وہ ریاست بھوپال کے حکم سے آگرہ میں زیر طبع ہے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے کلام غالب پر ایک تبصرہ بھی لکھا۔ جس کو انجمن ترقی اردو نے اپنے رسالہ اردو کے حصۂ اول میں "محاسن کلام غالب" کے عنوان سے شائع کیا ہے۔ مرحوم ڈاکٹر نے

غالب کے کلام پر جس فلسفیانہ رنگ میں تبصرہ کیا ہے وہ اردو داں پبلک کے لیے اس سے زیادہ مشکل ہے جیسا کہ کلام غالب اگر بجائے اردو کے یہ مضمون زبان انگریزی میں لکھا گیا ہوتا تو بہتر ہوتا اور بقول مدیر معارف کم سے کم اس سے یہ فائدہ ہوتا کہ ہم سے زیادہ اغیار اس کے ذریعہ سے غالب کے مرتبہ کو پہچانتے۔ بہرکیف غالب کے قدر دانوں کے لیے جو ان کو ایک زبردست فلسفی شاعر تصور کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ تبصرہ ایک انمول چیز ہے اور اس سے یہ پتا چلتا ہے کہ اس شاعر کی جس کے کلام کو سب سے پہلے نظامی پریس بدایوں نے جدید تعلیم یافتہ طبقے کے ہاتھوں تک پہنچانے کی کامیاب کوشش کی ہے عظمت کس کا سکہ اس گروہ کے قابل ترین افراد کے دلوں پر بیٹھ چکا ہے۔

ہمارے مطبوعہ دیوان کے طبع سوم پر ریویو کرتے ہوئے پنڈت منوہر لعل صاحب زتشی ایم۔ اے۔ نے۔ اخبار لیڈر الہ آباد میں لکھا تھا "ان اساتذہ میں غالب کا مرتبہ سب سے بلند ہے۔ اس لیے ہم سب کو نظامی پریس بدایوں کا ممنون ہونا چاہیئے کہ اس نے پچھلے سال کے اندر دیوان غالب کے تین نہایت عمدہ ایڈیشن شائع کر دیے ہیں۔ مضمون فہمان عمق خیال، حسن ادا، مضمون آفرینی، شیریں بیانی، معنویت، دلکشی ہر حیثیت سے غالب اس وقت دوسرے شعرا سے زیادہ جدید طبقے میں مقبول اور محبوب ہے۔"

مندرجۂ بالا اقتباس سے بخوبی ظاہر ہے کہ مرزا غالب کی اس پیشگوئی

"شہرتِ شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن"

کے پورے ہونے کا وقت آگیا ہے اور آج غالب کے کلام کے دلدادہ اُس سے کہیں زیادہ موجود ہیں جتنے خود اُن کے زمانہ میں تھے اور یہی وجہ ہے کہ نظامی پریس کے چھپے ہوئے دیوان غالب کے تین قیمتی اور گراں قدر ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل چکے ہیں اور آج چوتھا ایڈیشن آپ کے سامنے ہے۔ اگر ملک اور قوم کا ادبی مذاق اسی طرح ترقی کرتا گیا تو وہ وقت جلد آنیوالا ہے کہ غالب کے اس سے زیادہ ایڈیشن نہ صرف نظامی پریس سے بلکہ ملک کی دوسری دارالاشاعتوں کے اہتمام سے شائع ہوں اور لوگ اُن کو شوق سے پڑھیں۔

خاکسار

نظامی۔ بدایونی

بدایوں ۱۴ر جولائی ۱۹۲۱ء

دیباچہ طبعِ ثالث

نظامی پریس بدایوں نے سید راس مسعود صاحب بی اے
آکسن کی تحریک سے ۱۹۱۵ء میں اردو دیوان غالب کو سب سے
پہلی مرتبہ تعلیم یافتہ طبقہ کی نفاست پسند طبائع اور ساتھ ہی اُن کے
عالمانہ مذاق کو ملحوظ رکھ کر شائع کیا تھا۔ خدا کا شکر ہی کہ آج اسی مطبع
سے وہ دیوان تیسری مرتبہ چھوٹی تقطیع پر مزید اہتمام سے آراستہ و پیراستہ
سُنہرے کام کے خوشنما جلد سے مزین طاؤس[1] بہشت بن کر نکلتا ہی۔ پہلا
نسخہ تو معرا تھا لیکن یہ طبع سوم اپنے پیش رو کی طرح حامل شرح ہی اس
مرتبہ شرح پر نظرِ ثانی کی گئی ہی اور مرزا کے خطوط سے مدد لیکر بعض معرکۃ الآرا
اشعار کی شرح خود مرزا کی زبان سے لکھی گئی ہی۔ جس کی وجہ سے اس شرح

[1] مرزا کے خطوط کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہی کہ اُنھیں کتابوں کی اشاعت میں
خوشنمائی اور دلربائی کا خیال موجودہ زمانہ کے نفاست پسند انگریز کی

کی ایک خاص امتیازی صورت پیدا ہوگئی ہے۔ اس جدید نسخے کو ریاست رامپور کے سرکاری کتب خانہ کے قلمی[1] دیوان سے جو ۱۸۵۵ء مطابق (۱۲۷۱ھ) کا لکھا ہوا ہے مقابلے کی عزت حاصل ہوئی۔ آخری صفحات میں مرزا کے وہ قطعات اور اشعار جو اصل دیوان کے علاوہ ہیں اور جو اس سے پہلے کسی نسخے میں نہیں چھپے ہیں شامل کر دیے گئے ہیں جن کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اس جدید الطبع نسخے میں ایک قابل قدر اضافہ ڈاکٹر سید محمود صاحب غازی پوری۔ پی۔ ایچ۔ ڈی بیرسٹر ایٹ لا کا وہ عالمانہ مقدمہ ہے جس کو انھوں نے خاکسار کی درخواست پر لکھنے کی تکلیف گوارا فرمائی۔ یہ مقدمہ اسی سرزمین پر بیٹھ کر لکھا گیا ہے۔ جہاں مرزا نے اپنی عمر کا بڑا حصہ گزارا تھا اور جس خاک پاک میں آج بھی وہ آسودہ ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس مقدمے کے مرتب کرنے کے

تعلیم یافتہ نوجوانوں سے کم نہ تھا۔ ایک خط میں اپنے شاگرد صاحب مطبع منشی شیو نرائن کو ایک مطبوعہ کتاب کی رسید دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"بھائی صاحب ۳۳ کتابیں بھیجی ہوئی برخوردار منشی شیو نرائن کی کل جمعہ ۱۲ نومبر کو پہنچیں۔ کاغذ اور سیاہی اور خط کا حسن دیکھ کر میں نے اور وہ یقین جانا کہ طلائی کام پر یہ کتابیں طاؤس بہشت بن جائیں گی حوریں ان کو دیکھ کر شرمائیں گی (اردوئے معلیٰ)

[1] یہ وہ قلمی دیوان ہے جس کو مرزا نے قبل ہنگامہ ۱۸۵۷ء نواب محمد یوسف علی خاں بہادر والی رامپور کے نذر گزرانا تھا۔ اس کے آخر میں نواب ضیاء الدین خاں نیر کی ایک دلچسپ تقریظ بھی شامل ہے جس میں ظاہر کیا گیا ہے کہ اس دیوان میں کل ۱۷۹۵ اشعار ہیں۔ مرزا کے ایک خط مورخہ ۳ مئی ۱۸۶۶ء سے جو منشی

دوران میں مرزا غالب کی زیارت کی غرض سے "سلطان جی"[1] میں جاکر عالم خموشاں کی بھی سیر کی اور کیا عجب ہو کہ وہاں مرزا غالب کے روحانی فیض سے مستفیض ہوئے ہوں۔ جیسا کہ اس مقدمے کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہو یعنی اس میں انھوں نے وہ نکات پیدا کیے ہیں جو آج تک مرزا غالب کے سوانح نگاروں یا ان کے کلام پر تنقید کرنے والوں کو نہ سوجھے تھے۔ اس مرتبہ مرزا کی تصویر کے علاوہ ان کے ایک غیر مطبوعہ خط کا فوٹو بھی دیا گیا ہو جس سے مصنف کی شان خط کی زیارت ہوجاتی ہو یہ خط قاضی عبدالجمیل صاحب بریلوی کے ذخیرہ سے نکال کر ان کو خلف الصدق قاضی محمد خلیل صاحب رئیس بریلی نے ہمیں عنایت کیا ہو جس کے ہم ان کے شکر گذار ہیں۔ یہ خط پہلی مرتبہ شایع ہوتا ہو۔ اس سے قبل اردوئے معلیٰ وغیرہ کے مولفین کی اس خط تک دسترس نہیں ہوئی تھی۔ خلاصہ

شیونرائن صاحب کے نام لکھا گیا اور جو اردوئے معلی میں موجود ہو ظاہر ہوتا ہو کہ سنہ ۱۸۵۷ء سے قبل جو نسخہ مرزا کے دیوان کا طبع ہوا تھا وہ تلف ہوچکا تھا۔ جب ان کے دوستوں نے اس دیوان کو شایع کرنا چاہا تو اسی نسخہ موجودہ کتب خانہ رام پور کی نقل حاصل کرکے اس کو مطبع میں بھیجا گیا تھا۔ گویا آج تک مرزا کے کلام کو زندہ رکھنے کا سبب یہی قلمی دیوان ہو ۱۲

[1] دہلی میں اُس مقام کو جہاں سلطان المشائخ حضرت نظام الدین بدایونی مدفون ہیں سلطان جی کہتے ہیں ۱۲-

اس جدید نسخے کو دل آویز اور نظر فریب بنانے میں حتی المقدور کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا گیا ہے۔ خدا کرے کہ وہ

موجودہ زمانہ کی نفاست پسند جدید

تعلیم یافتہ جماعت میں مقبول ہو

اور اس کی اشاعت سے مصنف

کی روح محظوظ ہو۔

خاکسار

نظامی بدایونی

۸ دسمبر ۱۹۱۹ء

دیباچہ طبع ثانی

سید راس مسعود صاحب کی تحریک پر سب سے پہلے دیوان غالب کا
خاص ایڈیشن نظامی پریس میں ۱۹۱۵ء میں نکلا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ سوء
اتفاق سے یہ خاکسار کئی ماہ تک بستر علالت پر پڑا رہا اور اس وجہ سے اس
کی کاپیوں کی صحت کا انتظام دوسروں کے ہاتھ میں رہا اور یہ ادعا کہ وہ
غلطیوں سے پاک ہو جاتا رہا۔ جیسا کہ اس معذرت نامے سے جو اس ایڈیشن کے
آخر میں لکھا پڑا ظاہر ہوگا لیکن پھر بھی وہ ایڈیشن بازار میں دستیاب ہونے والے
نسخوں سے کیا بہ لحاظ اپنی دلفریبیوں اور کیا بہ لحاظ صحت ایسا غنیمت تھا۔
یہی وجہ ہوئی کہ شائقین کلام غالب نے میری توقع سے زیادہ اس کی قدر
فرمائی۔ اس ایڈیشن کے خریداروں میں فیصدی ۹۰۔ انگریزی داں اصحاب
شامل ہیں جن میں زیادہ تعداد گریجویٹ وکلا اور بیرسٹر صاحبان کی ہو اس سے
یہ اندازہ ہوتا ہو کہ نئے تعلیم یافتہ اصحاب کے حلقے میں دیوان غالب کے پہلے ایڈیشن کو

ہر دلعزیز بناتے ہیں محض اس کی ظاہری خوشنمائی ہی محرک نہیں ہوئی۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ صرف غالب کا کلام ہی وہ کلام ہے جو متصوفیانہ مذاق کے ساتھ فلسفی مسائل سے بھی مالا مال ہے۔ غالب کا تخیل وہ چیز ہے جو کبھی پرانا نہیں ہو سکتا یہی وجہ ہے کہ ہمارے نوجوان تعلیم یافتہ اشخاص کی طبیعتوں کا رجحان غالب کے طرف بڑھا ہوا ہے۔ غالب کو اپنی زندگی میں جب کہ اس کے معاصرین اس کے طرز کلام پر صرف اس وجہ سے مضحکہ اڑاتے تھے کہ اس نے شاعری کی ایک جدید شاہ راہ قائم کی تھی اور عشق و عاشقی اور گل و بلبل کے پارینہ مضامین سے اس کا مطمح نظر کہیں بلند تھا۔ کیا خبر تھی کہ اس کے مرنے سے تقریباً نصف صدی بعد وہ خوبیاں جو اس نے اپنی شاعری میں سب سے علیحدہ ہو کر پیدا کی تھیں عام طور پر قدر کی نگاہ سے دیکھی جائیں گی یہ امر واقعہ ہے کہ سب سے پہلے غالب نے یہ ثابت کر دیا کہ اردو نظم میں ہر طرح کی فصاحت و بلاغت فلسفہ و حکمت اور نیچرل جذبات کے ادا کرنے کی قابلیت موجود ہے۔ غالب نے شاعری کے مقصد کو خوب پہچانا ہے وہ صرف غزل سرائی سے غیر مہذب جذبات کو ابھارنا پسند نہیں کرتا بلکہ اس نے وہ روش اور اسلوب بیان اختیار کیا تھا جس سے وہ ایسے حکیمانہ خیالات دنیا کے سامنے پیش کر سکے جو دوسروں کی اصلاح کا باعث ہوں اور انسانی اخلاق کا پایہ بلند ہو۔ یہی وجہ ہے کہ بعض تذکرہ نویس اس کو یوروپین مصنفین کا ہم پایہ سمجھتے ہیں۔ غالباً یہاں پر یہ اعتراض کیا جائے گا کہ ایک شخص جو رند مشرب ہو وہ دوسروں کی اصلاح کیا کر سکتا ہے۔

بیشک غالب ایک قابل ترک عادت میں مبتلا ہو گیا تھا لیکن وہ نہایت

صداقت شعار اور راست گو تھا۔ اُس نے اپنے کلام میں اپنی اس مذموم عادت پر جا بجا ملامت کی ہے اور اس لیے اُس کا کیر کٹر پارسا زاہدوں اور نمائشی پرہیزگاروں سے بدرجہا قابلِ تعریف ہے۔ بہرحال اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ اس کے کلام میں توحید۔ تصوف۔ حکمت۔ فلسفہ۔ عبرت۔ بے ثباتی دنیا۔ خودداری۔ استغنا۔ اور اسی قسم کے اخلاقی مضامین بکثرت پائے جاتے ہیں۔ غالب نے اِن مضامین پر کبھی فخر نہیں کیا بلکہ اپنی رندانہ مشرب کی وجہ سے جہاں کہیں اس قسم کے مضامین پر قلم اُٹھانے کا ذکر کیا ہے تو انفعال کے ساتھ کہتا ہے

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

اردو شاعری میں تو غالب کا خاص مرتبہ تھا ہی۔ فارسی میں بھی اس کا پایہ کسی اہلِ زبان شاعر سے کم نہیں ہے۔ اس اردو دیوان کے دیباچہ میں اُس کی فارسی شاعری سے بحث کرنا ہمارے منصب سے باہر ہے اس موقعہ پر ہمیں صرف یہ کہنا ہے کہ اپنے اردو کلام میں جو مضامین غالب نے ادا کیے ہیں وہ معنی خیزی کے لحاظ سے فارسی اشعار سے کسی طور پر کم نہیں ہیں بلکہ بعض حالتوں میں وہ فارسی سے بھی زیادہ ممتاز ہیں ہم دیکھتے ہیں کہ غالب کے اردو کلام میں جا بجا فارسی کے پیوند لگائے گئے ہیں جس کی وجہ سے وہ مشکل اور دقیق سمجھا جاتا ہے۔ لیکن جب وہ اس روش کو چھوڑ کر صفائی اور سادگی کی طرف جاتا ہے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سادگی بیان پر جو قدرت اُسے تھی

وہ دوسرے کو بہت کم حاصل ہے۔ اُس کے دقیق اشعار اور فارسیت کے رنگ نے یہ ضرورت پیدا کر دی ہے کہ اس کے مطالب کو عام فہم اور آسان بنانے کے لیے دیوان کی شرح لکھی جائے چنانچہ اس وقت تک کئی شرحیں شائع ہو چکی ہیں۔ ہمارا خیال تھا کہ موجودہ شرحیں دلدادگان کلام غالب کے ضرورتوں کو پورا کرتی ہیں اور اس وجہ سے ہم نے پہلے ایڈیشن کو معرا شائع کرنا کافی سمجھا تھا۔ اُس ایڈیشن میں صرف اشارات املائی کے استعمال سے مشکل اشعار کو اس قابل بنا دیا تھا کہ وہ پڑھنے کے ساتھ ہی ناظرین کے ذہن میں اُتر جائیں لیکن اکثر احباب نے ہمیں مجبور کیا اور یہ مشورہ دیا کہ دوسرے ایڈیشن میں مشکل الفاظ کے معنی عام فہم اردو میں اور دقیق مضامین کی شرح مختصر طریقے سے بطور حاشیہ ہر صفحے پر متن کے تحت میں لکھ دی جائے تاکہ ناظرین کو کسی دوسری شرح کے سامنے رکھنے کی ضرورت باقی نہ رہے حاشیہ کے لکھنے میں ہم نے شرح طباطبائی مولانا حسرت اور خود رقعات غالب کو جو عود ہندی میں موجود ہیں پیش نظر رکھا ہے حضرت شوکت میرٹھی کی شرح دیکھنے کا بھی اس اثنا میں موقع ملا اس شرح میں اگرچہ مکمل دیوان نقل نہیں کیا گیا ہے لیکن جن اشعار کی شرح لکھی گئی ہے ان میں سے اکثر کی عام دیوانوں سے جدا ہو کر کلام غالب کی وہ گت بنائی ہے کہ جس سے گوشۂ قبر میں غالب کی روح کو ضرور کوفت ہوئی ہوگی مثلاً تمام نسخوں میں یہ لکھا ہے ؎

نقشے نامے کو اتنا طول غالب مختصر لکھ دے　　　　کہ حسرت سنج ہوں عرض ستم ہائے جدائی کا

شوکت صاحب اصلاح فرماتے ہیں ؎

نہ دے نامے کو اتنا طول غالبؔ مختصر لکھ دے　　کہ حسرت سنج ہوں عرض ستم ہائے جدائی کا

اس طرح کے محرفہ اشعار شوکت صاحب کی شرح میں اکثر ملتے ہیں اگر حضرت شوکت کسی قدیم نسخہ دیوان کا حوالہ دیتے اور اس کی بنا پر اشعار کی تصحیح کرتے تو حق بجانب تھا۔ عام مطبوعہ دیوانوں میں بھی بعض اشعار میں اختلاف پایا جاتا ہے اور اسی وجہ سے ہمیں چند ایڈیشن مختلف مطابع کے چھپے ہوئے تصحیح کی غرض سے جمع کرنے پڑے پہلے ایڈیشن کی اشاعت کے وقت سب سے زیادہ قدیم چھپا ہوا جو نسخہ دستیاب ہوا تھا وہ مطبع احمدی دہلی سے ۱۲۷۸ھ میں شائع ہوا تھا اور جس کی کاپیوں کی صحت خود مرزا نے کی تھی۔ اس مرتبہ اس سے بھی زیادہ پرانا ایک قلمی نسخہ ہاتھ آیا جو اصل دیوان سے نقل کیا گیا ہے جس کو پہلی مرتبہ غالب نے ۱۲۳۷ھ میں مرتب کیا تھا۔ یہ نقل بھی جو ہمیں دستیاب ہوئی ہے اسی زمانے کی لکھی ہوئی ہے اس کے ساتھ ایک دیباچہ بزبان فارسی مصنف نے لکھا ہے جس کو ناظرین کے مطالعہ کے لیے اس دیوان کے شروع میں بجنسہٖ درج کیا گیا ہے اس دیباچہ کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیوانِ اردو فارسی دیوان سے پہلے مصنف نے ۱۲۴۸ھ میں ترتیب دیا۔ لیکن اس میں مصنف کی بعض مشہور غزلیں نہیں ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۴۸ھ کے بعد دوسرا نسخہ مرزا نے اُن غزلیات کو شامل کر کے جو سال مذکور کے بعد تصنیف ہوئیں ترتیب دیا ہے اور وہی نسخہ شائع ہوا ہے اگر اُس قلمی نسخے کی جو ۱۲۳۷ھ کا لکھا ہوا ہے ہمیں ملا ہے متابعت کی جائے تو بعض مشہور غزلیں نکال دینی پڑیں گی مثلاً یہ غزل " لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور"

جس کا مضمون تاریخی واقعہ پر مشتمل ہے اور جو یقیناً غالب کی تصنیف ہے۔ اس لیے اس
قلمی دیوان سے صرف یہ مدد لی گئی ہے کہ بعض خفیف غلطیاں جو مطبوعہ دیوانوں
میں پائی گئیں درست کر لی گئی ہیں۔ موجودہ اڈیشن میں حتی الامکان کتابت
کی غلطیوں کی صحت کی گئی ہے لیکن پھر بھی ممکن ہے کہ بعض متجسس اور نکتہ چیں
نگاہیں کاتب کے کسی نہ کسی سہو کو ڈھونڈ نکالیں۔ نہایت سختی کے ساتھ کتابت
میں اُس املا کا خیال رکھا گیا ہے جو زمانہ حال میں سررشتہ تعلیم کی کتابوں میں
مروج ہے اور جس سے اردو کتابت کا یہ نقص دور ہو جاتا ہے کہ اُس میں مختلف
آوازوں کو ایک ہی صورت میں لکھا جاتا ہے مثلاً گہر۔ گھر۔ نے۔ لی۔ ذی وغیرہ
جہاں تک معنی نے اجازت دی ہے مرکب لفظوں کو علیحدہ کر کے لکھا گیا ہے
یعنی اُن دو لفظوں کو جو جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں قطعی طور پر ملانا جائز
نہیں رکھا ہے مثلاً کش مکش کو بہ صورت کشمکش نہیں لکھا ہے۔

اس طرز تحریر کے اختیار کرنے سے صرف یہ مقصد ہے کہ اردو رسم الخط
سریع الفہم صورت اختیار کر لے اور یہ بھی خیال رکھا ہے کہ لفظ کی صورت
آواز سے مطابقت کرے مثلاً نہ دے نامے کو اتنا طول الخ اس طریقے سے
نہیں لکھا نہ دے نامہ کو اتنا طول الخ اشارات املائی میں بھی اس قدر زیادہ
صحت کا لحاظ رکھا گیا ہے چونکہ اردو میں اس وقت اشارات املائی کی صورتیں
مخصوص نہ تھیں اس لیے ہم نے انگریزی اشارات املائی کا اتباع کیا ہے البتہ
اس قدر تصرف کیا ہے کہ کامے کی جگہ خفیف ڈیش سے کام لیا ہے۔ پہلے
اڈیشن میں مرزا کا صرف فوٹو دیا گیا تھا۔ اس مرتبہ ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا

خط حاصل کرکے اُس کا عکس بھی چھاپا گیا ہی جس کے لیے ہم قاضی محمد خلیل صاحب
رئیس بریلی کے شکر گذار ہیں۔ یہ خط قاضی صاحب موصوف کے پاس
محفوظ تھا۔ مولوی وہاب الدین صاحب طالب فرشوری بدایونی کے
ذریعہ ہم تک پہنچا جس کے لیے مولوی صاحب موصوف بھی مستحق شکریہ ہیں
امید ہی کہ اردو ادب کی یہ خدمت پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی
جائے گی۔ اردو دیوان غالب کا یہ دوسرا ایڈیشن فی الواقع ترقی ادب اردو
کی اُس اسکیم کو جو عالی جناب سید راس مسعود صاحب بی۔ اے آکسن
ناظم تعلیمات سرکار نظام خلد اللہ ملکہ کے عرصہ تک زیر غور رہی ہی پہلی
قسط ہی۔ خدا سے دعا ہی کہ ہماری یہ کوشش مقبول اتمام ہو تاکہ آیندہ ہمیں
ہمت ہو کہ اس سلسلے میں اردو کے دوسرے قدیم اساتذہ کا کلام اسی طریقہ
سے شائع کر سکیں اور ہماری یہ مطبوعات نفاست پسند علم دوست تعلیم یافتہ
اصحاب کے کتب خانوں کی زینت ہو کر مصنفین کے نام کو جنھوں نے اردو کی
خدمت میں اپنی عمریں صرف کر دی ہیں زندہ اور قائم رکھ سکیں ؛

خاکسار
نظامی عفی عنہ

بدایوں ۱۳ر جون سنہ ۱۹۱۸ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ طبع اوّل

زمانہ دگرگونہ آئیں نہاد
شد آں مرغ کو بیضہ زریں نہاد

یاد ش بخیر وہ زمانہ بھی کیا زمانہ ہوگا جب کہ ایشیائی علوم
وفنون کے چشمے جزیرہ نمائے ہند کے گھر گھر میں ابل رہے ہوں گے
تیمور سے پہلے اور اُس کے بعد جب کہ مسلمان فاتحین نے ملک
ہندوستان پر فاتحانہ حملے کیے ہیں اُس وقت کس کو یقین ہوگا کہ
یہ آریہ ورت کا دیس ان بدیسیوں کی بدولت اپنی عالی شان وشوکت
اپنی کامل عظمت وجلالت اپنی اتم لیاقت وقابلیت کے لحاظ سے
عہد خلفائے عباسیہ کا ہم عہد ہوگا۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ جب فاتح
قوم کے ساتھ مفتوح اقوام بھی قدم بہ قدم ترقی کے میدانوں کو
طے کرتی نظر آتی تھیں جس حکم داں کو جن علوم وفنون کے کملا اور
ماہرین کی تلاش ہوتی تھی نگاہ التفات کے ایک معمولی سے اشارہ

یہ ایک دو نہیں بلکہ سیکڑوں دیدہ ور دولت پر حاضر ہو جاتے تھے قطب الدین ایبک سے مرحوم بہادر شاہ ظفر تک کے درباروں پر نظر ڈالی جائے کوئی دربار ایسا نظر نہ آئے گا جس کے میر فرد شوں میں تخمین روزگار کے مجسمے لازمہ موزونیت و زیبائش نہ ہوں۔

جس زمانہ کی یہ حالت ہو اُس زمانہ کی دلچسپیوں اور مشاغل کا کیا پوچھنا؟ سستا سماں بے فکری کا زمانہ، سلطنت قدر دان۔ خود قابل۔ ان صورتوں میں جو مشغلے ہوں گے۔ غالباً مفید اور علمی ہی ہونگے۔ یہ مسلم ہے کہ کوئی مشغلہ بغیر تحریص و تقابل کے ترقی پذیر نہیں ہوتا۔ اور تحریص و تقابل کے لیے سوسائٹی کا ہم خیال و ہم لیاقت ہونا لازمی ہے۔ چنانچہ اُس زمانہ میں ہم لیاقتی و ہم خیالی کی کمی نہ تھی۔ جہاں کسی نے ایک خیال کو عملی جامہ پہنایا چراغ سے چراغ جلنے لگا۔

دیگر علوم و فنون کی شاعری کا ستارہ بھی کچھ کم عروج پر نہ تھا۔ شاعروں کے منہ موتیوں سے بھرے جاتے تھے۔ سخن سنجوں کا کلام در و جواہر میں تولا جاتا تھا۔ فرد فرد پر اشرفی صلے میں ملتی تھی اور پھر جاگیرات مستزاد۔ ان ترقیوں اور قدر دانیوں کے نظارے ایک دو نہیں بلکہ چند در چند صدیوں تک دیکھنے والوں کی آنکھیں میں چکا چوند پیدا کرتے رہے۔ مگر تیرھویں صدی عیسوی کے آخر تک اس عروج نے سارے مدارج طے کرکے ترقی معکوس کی گردان شروع کر دی اور گویا چراغ لیکر ڈھونڈھنے سے بھی ان باکمال تحبوں کا پتا نہ لگتا تھا۔ خال خال کوئی صاحب کمال نظر آجاتا تھا۔ مگر آہ اور صد آہ کہ آج وہ حقیقی

قحط الرجال ہی کہ بجز نام یاد رہجانے کے اُن باکمالوں میں سے کسی ایک فرد کا نشان نہیں فاعتبروا یا اولی الابصار۔

پیش ازیں بر رفتگاں افسوس می خوردند خلق
می خورند افسوس در ایام ما بر ماندگاں

تیرھویں صدی کی آخری نمود اُس باکمال شاعر پر ختم ہوگئی جس کو علیٰ کل غالب کہنا ذرا بھی مبالغہ نہیں یعنی نجم الدولہ میرزا اسداللہ خاں غالب (جن کا اُردو دیوان نئے سامان کے ساتھ ان چند سطروں کے بعد پیش نظر ہوگا۔) اُن باکمال اور فطرت شناس شعرا میں تھے جن کی سچی تعریف کے لیے فی زمانہ ہم جیسے نااہلوں کو اس مشہور شعر پڑھنے کے سوا کوئی چارہ نہیں

سعدیؔ ثنائے تو نتواند بشرح گفت
خاموشی از ثنائے تو حدِ ثنائے تست

مرزا غالب کی شاعری کے مدارج کو پہنچنا اور اُن کے اصلی مفہوم کو سمجھنا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ اردو شعرا میں ایک اور صرف وہی ایک ایسے مختص النوع اور مخترع الطبیعۃ فرد فرید گزرے ہیں۔ جن کی ہر بات میں جاحت ہر رنگ میں ندرت۔ ہر تخیل میں فوقیت نظر آتی ہے۔ اگرچہ ان کی شاعری بھی بلحاظ اصول ہو تو اعد کوئی نئی شاعری نہیں ہے۔ اصناف سخن کی وہی قسمیں اور اُن میں وہی پابندیاں نظر آتی ہیں جن کی ابتدا ولی نے اور ترمیم و اصلاح میر نے کی ہے۔ ابن ہم اُن کا کوئی قصیدہ کوئی مثنوی کوئی قطعہ کوئی غزل کوئی رباعی حتیٰ کہ ایک فرد بھی ایسی نہ ملے گی جو اپنے

علوِ تخیل۔ رفعتِ مضمون۔ موزوں اسالیب تخصیص ترکیب اور دل آویز ادا میں تمام اساتذہ سلف و خلف کے کلام سے جداگانہ شان رکھتی ہو اُن کے ممتاز کلام کی ایک ادنیٰ سی شناخت یہ ہو کہ جب کوئی شعر اُن کا پڑھا جاتا ہو تو بغیر اس کے کہ نام و تخلص معلوم ہو سُننے والا جس کا مذاقِ سخن صحیح ہو بے تکلف سمجھ جاتا ہو کہ یہ مرزا غالب کا شعر ہو۔ یہی حیثیت ممیزہ بتاتی ہو کہ اُن کے زمانہ میں بعض اہلِ سخن بوجہ اجنبیت روشِ معاصرانہ لگ سے اُن کے کلام کو ناپسند کرتے تھے۔ حتیٰ کہ اس معاندانہ خیال کا اثر اب تک یہ باقی ہو کہ جہاں ایسے لوگوں میں کوئی شعر فارسی اور اجنبی ترکیب و اضافت کا پڑھا یا سُنا جاتا ہو تو بے تکان کہہ دیا جاتا ہو کہ یہ مرزا غالب کا رنگ ہی حالانکہ یہ خیال واقعیت سے کوسوں دور ہو؎

لاکھ مضموں اور اس کا ایک ٹھٹول

سو تکلف اور اس کی سیدھی بات

انھیں خیالات سے مجبور ہو کر جا بجا مرزا مرحوم نے کہا ہو؎

مشکل ہو زبس کلام میرا اے دل   سُن سُن کے اُسے سخنورانِ کامل

آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش   گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

ظاہر ہو کہ آج نہ مرزا غالب زندہ ہیں نہ اُن کے معاصرین اور قدرداں موجود ہیں نہ وہ قابلیت و فن دانی ہو مگر اس نئی اور مغربی دنیا کی روشنی میں ایک پُرانے اور ایشیائی شاعر کے موتیوں کی چمک غالب نظر آتی ہو۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اگر مرزا غالب شعرا کی طرح حلقۂ متصوفین میں بھی شامل ہوتے تو آج اُن کے قطعے کو ملفوظاتِ کرامت میں شامل کیا جاتا جو اپنے مرنے سے پیشتر فرما گئے ہیں ؎

"تا ز دیوانم کہ سرمستِ سخن خواہد شدن
ایں مے از قحطِ خریداری کہن خواہد شدن
کوکبم را در عدم اوجِ قبولی بودہ است
شہرتِ شعرم بہ گیتی بعدِ من خواہد شدن"

یہی مقبولیتِ عام جو مرزا کے مرحوم کے انتقال سے چالیس پینتالیس سال بعد پیدا ہوئی ہے۔ موجودہ اشاعت کی اصلی محرک ہے اور اسی تحریک نے نہ صرف مہتمم مطبع نظامی کو بلکہ اکثر احباب کو آمادہ کر دیا کہ مرزا کے کلام کا صحیح اور دلکش ایڈیشن شائع کیا جائے۔ اب سے پہلے چند در چند ایڈیشن دیوان غالب کے شائع ہو چکے ہیں جن میں تین نسخے ایسے ہیں جو مرزا کے مرحوم کی زندگی میں شائع ہوئے اور ایک آدھ کی تصحیح بھی مرزا سے منسوب کی گئی ہے۔ ان کے سوا چار پانچ نسخے متفرق مطبعوں سے نکلے ہیں۔ نیز ذہین شراح نے بذیل شرح دیوان کا بڑا حصہ چھاپ دیا ہے۔ مگر ان سب مطبوعہ نسخوں میں کوئی نسخہ ایسا نہیں دیکھا گیا

جبکہ انکم دس پانچ غلطیوں کا حال نہ ہو۔ ایسی صورت میں کہ خود مرزا کی زندگی میں دیوان شائع ہوا اور واقفین فن شرح بھی ان کا کلام چھاپیں پھر بھی ایک نہیں بیسیوں غلطیوں کا رہ جانا تعجب کی بات ہے۔

ہم نے اس دیوان میں جن باتوں کا التزام کیا ہے۔ اُن کی تفصیل یہ ہے کہ سب سے پہلے عمدہ کاغذ۔ دلفریب خط۔ موزوں تقطیع۔ صاف ستھری چھپائی کا خصوصیت سے انتظام کیا ہے۔ اور پھر آج کل کی رعایت کتابت سے تمام اُن نشانیوں کو بہ احتیاط تمام جا بجا منضم کیا ہے۔ جن کی بدولت معمولی اُردو خواں بھی بہ آسانی شعر کو پڑھ سکیں۔ پھر حتی الوسع صحت اشعار کا بھی خاص لحاظ رکھا گیا ہے اور مختلف دواوین اور شرحوں اور کلام مرزا کے حافظوں سے تصدیق و مقابلہ کیا ہے۔ ان اہتماموں کے بعد بھی اگر کوئی فروگذاشت رہ گئی ہو تو اس کو بجز اقتضائے بشریت اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ہیچ بشر خالی از خطا نبود۔

اس دیوان کی تحریک اشاعت اور ترتیب و تدوین کے متعلق خصوصیت کے ساتھ مجھے اپنے عزیز دوست فخر قوم سید راس مسعود صاحب بی۔ اے بیرسٹر ایٹ لا [illegible] مرحوم کا جن کی متواتر تحریک اور اصرار خاص نے مجھے آمادہ کیا کہ میں آج موجودہ حیثیت سے دیوان غالب کو شائع کروں شکریہ ادا کرنا ہے۔

اس دیوان میں ناظرین کرام کو کچھ کلام ایسا بھی ملیگا جو اب تک کے موجودہ دواوین میں نہیں ہے۔ اگرچہ اس کلام کے سوا ہم کو اور کلام بھی

مرزا سے منسوب ملا۔ مگر بعد تنقید و تحقیق جو کلام اُن کا متحقق ہوا وہی اس میں شامل کیا گیا۔ کیونکہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ مرزا غالب ہی کا نکھرا کلام بہ امتیازی فوقیت رکھتا ہے جو دوسروں کے کلام سے تمیز ہو سکتا ہے اور اسی معیار نے ہم کو کھوٹی ٹکسال سے کھرے سکوں کے الگ کرنے کا موقعہ دیا ورنہ سے

ہزار نکتۂ باریک تر ز مو اینجاست
نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

کسی شاعر کے کلام کے مطالعہ سے قبل اُس کے مختصر حالات سے واقف ہونا نہایت ضروری ہے۔ اس لیے چند احباب کا اصرار تھا کہ مرزا کی سوانح عمری بھی دیوان سے قبل دی جائے۔ لیکن چونکہ اس مضمون پر مولانا حالی مرحوم کی ایک مبسوط تصنیف یادگار غالب شائع ہو کر ملک کے تمام علم دوست احباب کے ہاتھوں تک پہنچ چکی ہے۔ لہذا اسی کتاب سے مرزا کی لائف کی مندرجہ ذیل اطلاعوں پر قناعت کی جاتی ہے:

نام:۔ مرزا اسد اللہ خاں معروف بہ مرزا نوشہ

خطاب:۔ نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ۔

تخلص:۔ غالب ریختہ میں ابتداءً اسد لکھتے تھے۔

خاندان:۔ ایبک ترک سلسلۂ نسب تور ابن فریدوں سے ملتا ہے

ولادت:۔ ۸ رجب ۱۲۱۲ھ بمقام آگرہ۔

تعلیم:۔ اوّل اوّل شیخ معظم ہندی سے تعلیم پائی اُس کے بعد

عبدالصمد نومسلم ایرانی سے جن کا آتش پرستی کے زمانہ میں ہرمزد نام تھا فارسی زبان حاصل کی۔	
مرزا کی شادی ۱۲۲۵ھ میں نواب فخرالدولہ کے چھوٹے بھائی مرزا الٰہی بخش کے یہاں ہوئی تھی۔	تاہل:-
زمانہ طفولیت آگرے میں گزرا۔ ۵۰ برس کے قریب دلی میں رہے لیکن کبھی کوئی ذاتی مکان نہیں خریدا ہمیشہ کرایہ کے مکان میں رہتے رہے	مسکن:-
کوئی اولاد صلبی نہیں چھوڑی۔ ابتدا میں سات بچے ہوئے مگر کوئی زندہ نہیں رہا۔	اولاد:-
مرزا کو فن سخن میں اپنے کمال پر بہت کچھ ناز تھا جو بالکل بجا تھا۔ سلامتی طبع محققانہ نظر ان کا حصہ تھا۔ اور بایں ہمہ وہ حق پسند بھی تھے۔ شاعری میں ان کو باقاعدہ کسی سے تلمذ حاصل نہ تھا۔ لیکن وقت پسندی کو چھوڑ کر جب وہ سلاست کی طرف متوجہ ہوئے تو کہنا پڑتا ہے کہ صفائی زبان میں انھوں نے میر تقی مرحوم کی تقلید کی جن کے وہ بڑے معتقد تھے چنانچہ فرماتے ہیں ؎ غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں پھر کہتے ہیں ؎	شاعری:-

ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانہ میں کوئی میر بھی تھا

تصانیف:- دیوان اردو مشہور ہے کہ اس کو مولانا فضل الحق صاحب خیرآبادی کی رائے سے مرزا نے اپنے بڑے دیوان سے منتخب کیا تھا۔ اس زمانہ میں اکثر غزلیں جو اس دیوان میں نہیں پائی جاتیں غالب کے غیر مطبوعہ کلام کے نام سے شائع ہو رہی ہیں (ہمارا گمان تو خیال ہی ہے یہ وہی کلام ہے جس کو مرزا نے اپنے انتخاب میں نہیں لیا تھا)۔ عود ہندی۔ اردوئے معلیٰ۔ کلیات نثر و نظم فارسی قاطع برہان۔ پنج آہنگ۔ مہر نیم روز (خاندان تیموریہ کی نامکمل تاریخ ہمایوں کے حالات تک) دستنبو (حالات غدر) گل رعنا۔ (انتخاب دیوان اردو فارسی) لطائف غیبی دسبد چین وغیرہ متفرق رسالے۔

شعر فہمی و علمی مشاغل: کیسا ہی مشکل مضمون ہو وہ ایک سرسری نظر میں تہ کو پہنچ جاتے تھے۔ تصوف اور معارف کی کتابیں اکثر مطالعے میں رہتی تھیں۔

بذلہ گوئی اور ظرافت:- مرزا کی تقریر میں اُن کی تحریر اور اُن کی نظم و نثر سے کچھ کم لطف نہ تھا۔ بقول مولانا حالی مزاج میں اس قدر ظرافت تھی کہ اگر ان کو بجائے حیوان ناطق کے حیوان

ظریف کہا جائے تو بجا ہے۔ حسن بیان حاضر جوابی بات میں بات پیدا کرنا اُن کی خصوصیات میں سے تھا

اخلاق و فراخ حوصلگی اور مروت نہایت وسیع الاخلاق اور کثیر الاحباب تھے۔ جو شخص اُن سے ملنے جاتا کیسا ہی مغموم ہوتا خوش ہو کر آتا۔ فراخ حوصلہ ایسے کہ کوئی سائل اُن کے در سے خالی نہ پھرتا۔ محتاجوں کی حتی الامکان مدد کرتے۔

خودداری:— بغیر پالکی یا ہوادار کے کبھی باہر نہ نکلے۔ عمائد شہر میں سے جو لوگ اُن کی ملاقات کو نہ آتے وہ بھی اُن کے مکان پر نہ جاتے مرزا کی خودداری کی ایک مشہور مثال ہے کہ جب دہلی کالج کی پروفیسری کے لیے بلائے گئے تو صرف اس بات پر بغیر ملے چلے آئے کہ مسٹر ٹامسن جنھوں نے بلایا تھا استقبال کو نہیں آئے۔

معاش:— مرزا کو سات سو روپیہ سالانہ کی پنشن ملتی تھی۔ غدر کے بعد تین سال تک یہ پنشن عارضی طور پر بند رہی تھی اس زمانہ میں مرزا کی نہایت عسرت سے بسر ہوئی۔ غدر کے دو سال بعد دربار رامپور سے سو روپیہ ماہوار ملنے لگے تھے جو وقت وفات تک جاری رہے لیکن یہ تنخواہ بھی اُن کے خرچ کو کافی نہ ہوتی تھی

کبھی فراغت نصیب نہ ہوئی۔ ایک موقع پر فرمایا ہے:
"میں کپڑے کھاتا ہوں"

مذہب:۔ مرزا اسلام کی حقیقت پر نہایت پختہ یقین رکھتے تھے۔ توحید وجودی کے قائل تھے جس کا پتہ اُن کی شاعری سے ملتا ہے۔ اُن کو اہلبیت سے نہایت محبت تھی اور غالباً تفضیلی تھے۔ مولانا فخر قدس سرہ العزیز کے خاندان میں مرید تھے۔ اِسی وجہ سے اُن کی تجہیز و تکفین اہلِ سنت کے طریق پر عمل میں آئی۔

وفات اور دفن:۔ مرزا نے ۷۳ برس چار مہینے کی عمر میں ۱۸ فروری ۱۸۶۹ء کو دہلی میں انتقال کیا اور درگاہ حضرت نظام الدین اولیا محبوب الٰہی میں دفن ہوئے

زاویہ نشین گمنامی
خاکسار نظامی بدایونی

بدایوں روہیل کھنڈ
۱۷ جنوری ۱۹۱۵ء

اردو
دیوان غالب
مع شرح نظامی

دیباچہ جو خود مصنف نے وقتِ ترتیبِ دیوان ہٰذا بزبانِ فارسی لکھا

مشامِ شمیم آشنایان را صلا و نہاد انجمن نشینان را مژدہ کہ نسخۂ از سامان مجمرہ گردانی آمادہ و دودے از عود ہندی
دست بہم دادہ است چہ بایستے بہ رنگ غنچہ در بیجا نالی شکستہ بے اندام[1] تراشیدہ بلکہ بہ تیز دستگی سکالندہ بہ کالبد ریختہ
کردہ لیسویان خراشیدہ اید و دل نفس گداختگی ہائے شوق بہ جستجوی آتش پارسی است نہ آتشے کہ در گلخن ہا نیز نہاد
افسردہ و خاموش و از کفِ خاکستر بہ مرگ خود شبیہ پوش بنی چہرہ سے مسلم ہست تا پاکی[2] بہ جوان مردہ ہا[3]
شکستن و از دیوانگی بہشت شمع مزار گشتہ آدینجن ہر آئینہ بدل گداختن ایزدہ و بہ بزم افروختن بہ انشا ید تیغ آتش
صبح برافروزندہ و نقش پرست بادافراہ[4] ہم در آتش سوزندہ بیک پیمانہ کہ گروہ ہندو ریختہ آن را بخشندہ
آذر لعل[5] و آتش ہست کہ بہ چشم روشنی ہوشنگ[6] از بہ دل تافتہ و در ایوان لہراسپ[7] تا دو ہا بافتہ و فروغ است
و لالہ را رنگ و صبح را تپش و کردہ را چراغ بخشندہ یزداں و در انجمن برافروزندہ اسپام کہ شرارے از آن آتش ہمانا کہ
در خاکستر خویش یافتہ بجا و گداز سینہ تافتہ ہم و آتش[8] سمیران بہ بادہ بودہ کر کم کرد بہ روزگاران آثار بہ فراہم تو آمد کہ مجموعہ
سا افروزی فی چراغ و از نتیجہ عود و بال شناسائی دماغ تو اند بخشیدہ ہمانا نگارندہ را بہ نامہ را آں بدو سرت کہ پس از انتخاب دیوانِ
بے گرد آوردن ہرا بہ دیوان فارسی بہ جیزہ و بہ تقاضہ کہ بال این خریدہ فن[9] پیش از کرے خویش نشیند امید کہ سخن سرایان سخنور ستایش
پراگندہ ابیاتی را کہ خارج ازین اوراق یابند از تراوش رگِ کلک این نامہ سیاہ نشناسند و جامہ گرد آورندہ
ستائش و نکوہش آن اشعار ممنون و ماخوذ نسگالند یارب ایں لعبے ستی ناشنیدہ و ادعتی بہ پیدائی نا رسیدہ یعنی
نقش پذیر آمدہ نقاش کہ بیدل اسد اللہ خان موسوم و میرزا نوشہ معروف و غالب متخلص است جہان را اکبر آبادی مولد و
دہلی مسکن است فرجام کار نجفی مدفن نیز باد تمام شد بست و چہارم شہر ذی قعدہ سنہ ۱۲۴۹ ھ

لہ بے اندام = بے قطع سلہ نا پاکی = بے قراری سلہ نا بار شکستن = نا شائستہ کرنا کہ بادافراہ = سزا ہ پژوہندہ = محقق ۔ لہ لعل وہ آتش = بیقرار شد ۔ ہوشنگ = ایک آتش پرست بادشاہ فارس کا نام ہے ۔ لہراسپ = ایک آتش پرست بادشاہ کا نام ہے جو کیخسرو کا جانشین ہوا ۔ وہ ۔۔۔ و ہوشنگی ۔ فریب ۔ بجیدہ ۔ چاہ

عشترل ۱۲

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بیت

۱ نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا	کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا
۲ کاو کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ	صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

۱ نقش. تصویر۔ کاغذی پیرہن :۔ فریادیوں کا لباس۔ الفاظ کو نثر کی صورت میں رکھنے سے یہ مطلب ہوتا ہے۔ نقش (تصویر) بہ لباس کاغذی کس کی بیداد تحریر کا فریادی ہے؟

عود ہندی میں خود مرزا نے جو مطلب لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ: ہستی موجب ملال و آزار ہے اس لیے تصویر بھی بزبان حال فریاد کرتی ہے کہ مجھ کو ہست کر کے کیوں رنج ہستی میں مبتلا کر دیا۔ مولانا طباطبائی کے نزدیک شعر ادائے مطلب سے قاصر ہے وہ فرماتے ہیں کہ شوخیِ تحریر کا لفظ محض حشو نہیں ہے مطلع بنانے کے لیے لایا گیا ہے اس کی جگہ ہستی بے اعتبار یا ہستی پُر ملال وغیرہ کی ضرورت تھی تاکہ وجہ ملال اور باعث فریاد کا اظہار ہوتا لیکن واقعہ یہ ہے کہ شوخی کا لفظ نہایت پُر مغز ہے اور ان سب معانی پر حاوی ہے۔ مولانا طباطبائی کا یہ کہنا کہ ہستی کے بدلے شوخی کا لفظ لانے کو قرینہ ہستی کے حذف پر پیدا نہیں ہوا صحیح نہیں ہے کیونکہ خود پیکر کے لفظ سے جو تصویر کے ساتھ لایا گیا ہے ہستی یعنی جسم کا حذف ظاہر ہے اور شعر میں جو استفہام ہے وہ ایک اشارہ ہے جواب صریح و بدیہی کی جانب اور اس قسم کا سوال جس کا جواب بدیہی اور ملزوم ہو حسن کلام پر دال ہے اور جو تاکید و اثبات اس قسم کے کنایوں سے ہوتی ہے وہ صراحت میں ممکن نہیں۔ اور اگر غور کیا جائے تو غالب نے اس شعر میں وہی مطلب ادا کیا ہے جو مولانا روم کے مشہور شعر بشنو از نے چوں حکایت می کند الخ سے ادا ہوتا ہے اسی لیے اس شعر کو مہمل قرار دینا ظلم ہے

۲ کاو کاو = بہت کاوش و کاہش۔ مطلب یہ ہے کہ عاشق کے لیے فرقت کی راتوں کا کاٹنا ایسا ہی مشکل ہے جیسا فرہاد کے واسطے جوئے شیر کا لانا۔ کاو کاو سے کوہ کنی اور صبح کے سپیدہ کو جوئے شیر سے جو مشابہت ہے وہ ظاہر ہے

جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

بس کہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

(۳)

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحرا مگر بہ تنگیِ چشمِ حسود تھا

آشفتگی نے نقشِ سویدا کیا درست
ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا

---

۱ جذبہ کشش۔ دم شمشیر تلوار کی باڑھ۔ مطلب یہ ہے کہ میرے شوق شہادت میں ایسی کشش ہے کہ اس کی وجہ سے سینۂ شمشیر سے دم شمشیر باہر کھنچا آتا ہے گویا گلے ملنے کے لیے بیتاب ہے۔ گویا دم سینے میں رہتا ہے مگر جذبۂ بے اختیار سے تلوار کا دم لبوں پر آگیا ہے اور ظاہر ہے کہ تلوار کی باڑھ باہر کی طرف ہوتی ہے۔ ۱۲

۲ یعنی سماعت کا شوق کتنی ہی کوشش کرے مگر میری تقریر کے مطلب سے آگاہ نہیں ہو سکتا اور اپنے خیالات کو دوسروں کے لیے بے معنی بتانا یہ شعرا کا ایک پامال مضمون ہے مصرع اول میں آگہی فاعل ہے اور دامِ شنیدن پر اضافت مجازی مفعول ہے ایک دوسری جگہ کہا ہے

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

۳ آتش زیر پا بیقرار۔ موئے آتش دیدہ وہ بال جو آگ کی گرمی سے حلقہ دار اور کمزور ہو گیا ہو اور اس کی تشبیہ حلقۂ زنجیر سے ظاہر ہے مطلب یہ ہے کہ میں عالم اسیری میں بھی اتنا بے قرار ہوں کہ زنجیر کی کڑیاں موئے آتش دیدہ کی مانند ٹوٹ جاتی ہیں۔

۴ بروئے کار آنا مرد میدان بننا۔ مگر استفہامیہ۔ تنگی چشم حسود مثل چشم حاسد کے تنگ ۱۲

۵ سویدا دل پر ایک سیاہ نقطہ۔ سودا کی تصغیر۔ داغ کی پونجی دھواں ہے جس طرح دھوئیں سے داغ پیدا ہوتا ہے اسی طرح پریشانی خاطر سے نقش سویدا درست ہوتا ہے یعنی دل پر ایک سیاہ نقطہ پیدا ہوتا ہے شاعر نے سویدا کو داغ سے اور آشفتگی کو دود سے نسبت دی ہے اپنی زندگی کو پر اسرار اور اپنے خیالات کو دوسروں کے لیے بے معنی بتانا شعرا کا دستور رہا ہے ۱۲

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز
لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا

ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی[۱]
میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود[۲] تھا

۳

کہتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا[۳]
دل کہاں کہ گم کیجے ہم نے مدعا پایا

عشق سے طبیعت نے[۴] زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا

دوست دارِ دشمن[۵] ہے اعتمادِ دل معلوم
آہ بے اثر دیکھی نالہ نارسا پایا

---

[۱] داغِ عیوبِ برہنگی سے شاعر کا مطلب انسانی صفات سے معرّا ہونا ہے۔ ننگِ وجود ننگِ ہستی

[۲] سرگشتۂ خمار رسوم و قیود۔ رسوم و قیود کی بے لطف کیفیت میں مبتلا خمار اُس بے کیفی اور بدمزگی کو کہتے ہیں جو نشہ اترنے کے وقت ہوا کرتی ہے سرگشتہ کے لفظی معنے ہیں سر پھرا ہوا شعر کا مطلب یہ ہے کہ آزادیِ محبت کا مقتضا یہ تھا کہ موت کے لیے بھی کسی بات کی شرط کا پابند نہ ہوتا اور بغیر تیشے کے ہی مرجاتا ۱۲۔

[۳] یہ کہنا کہ دل اگر پڑا پایا تو نہ دیں گے ثابت کرتا ہے کہ دل پا لیا ہے صرف چھیڑنے کے لیے چھپایا جاتا ہے۔ پس ہم نے مدعا پا لیا یعنی سمجھ گئے کہ دل آپ کے پاس ہے ۱۲۔

[۴] عشق ایک ایسا درد ہے جس کی دوا نہیں۔ اور پھر زندگی کا مزہ وہی ہے گویا بغیر عشق زندگی بہت دردناک تھی ۱۲

[۵] دوست دار دشمن۔ دشمن یعنی رقیب کو عزیز رکھنے والا۔ اعتمادِ دل معلوم یعنی دل پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ مطلب یہ ہے کہ آہ کی بے اثری اور نالہ کی نارسائی ثابت کر رہی ہے کہ خود ہمارا دل ہمارا ساتھی نہیں ہے بلکہ دشمن کا خیر خواہ ہے ورنہ آہ بے اثر اور نالہ نارسا کرنا ۱۲

سادگی[1] و پرکاری، بےخودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

غنچہ[2] پھر لگا کھلنے، آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا، گم کیا ہوا پایا

حالِ دل نہیں معلوم، لیکن اس قدر یعنی
ہم نے بارہا ڈھونڈا، تم نے بارہا پایا

شورِ پندِ[3] ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا
آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا

۴۴

دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا
آتشِ خاموش کے مانند، گویا جل گیا

دل میں ذوقِ[4] وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

میں عدم[5] سے بھی پرے ہوں، ورنہ غافل بارہا
میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

[1] سادگی، بھولا پن۔ پرکاری، چالاکی۔ شاعر کہتا ہے کہ حسینوں کا تغافل بھی عشاق کی جرأت آزمانے کے لیے یعنی اُن کا دل دیکھنے کے لیے ہوتا ہے گویا اُن کا ظاہری بھولا پن فی الواقع چالاکی ہے اور اُن کی بےخودی یا بےخبری اصلاً ہوشیاری ہے ۱۲

[2] مطلب یہ ہے کہ ہمارا جوشِ جنوں تازہ ہو گیا ہے کیونکہ فصلِ بہار ہے۔ غنچہ اور دل کی تشبیہ عام ہے اسی باعث غنچے نے شاعر کے خوں گشتہ دل کی تصویر اُس کے سامنے پیش کر دی ۱۲

[3] آپ سے اشارہ ناصح کی طرف ہے بطور طنز و تشنیع استعمال ہوا ہے ذوق کہتا ہے "واہ رے شورِ محبت خوب ہی چھڑکا نمک"۔ شور اور نمک قابلِ لحاظ ہیں ۱۲

[4] مولانا طباطبائی نے آگ سے آتشِ رشک مراد لی ہے۔ بہتر ہوتا کہ آگ لگنے سے یاس و ناکامی کی تباہی و بربادی سمجھی جاتی جس کے بعد ذوقِ وصل و یادِ یار تک سب جاتا رہا تو زیادہ موزوں ہوگا ۱۲ [5] بالِ عنقا، بازوئے عنقا۔ شاعر اپنی فنا کو مبالغے کے ساتھ بیان کیا ہے وہ اپنی ہستی کو عدم سے بھی پرے ظاہر کرتا ہے۔ بالِ عنقا جلنے کے یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ جس جگہ وہ ہے وہاں عنقا کو بال کشائی کا یارا نہیں ہے۔ یہ کلمہ نہیں ہے ورنہ دلی میں رائج ہے ۱۲

عرض[۱] کیجے جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

دل نہیں، تجھ کو دکھاتا، ورنہ داغوں کی بہار
اس[۲] چراغاں کا کروں کیا، کارفرما جل گیا

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل
دیکھ کر طرزِ[۳] تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

شوق[۴] ہر رنگ رقیبِ سروساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

۵

زخم[۵] نے داد نہ دی تنگیِ دل کی یارب
تیر بھی سینۂ بسمل سے پرافشاں نکلا

۱ؑ عرض کرنا = پیش کرنا۔ جوہر اندیشہ = سوچ بچار یا فکر کرنا۔ شاعر کہتا ہے کہ فکر کا جوہر جو مجھ میں موجود ہے اسے کس کے سامنے پیش کروں اس میں اس قدر حرارت ہے کہ وحشت کا کچھ یوں ہی سا خیال آنے سے صحرا جل کر خاک ہو گیا۔ اظہارِ وحشت کی صورت میں خدا معلوم کیا ہوتا۔ عرض کو جوہر سے تناسب الفاظ بالصورت ہے ۱۲

۲ؑ کارفرما = کام کرنے والا یعنی دل۔ چراغاں = یہ لفظ چراغ کی جمع نہیں ہے بلکہ اُس روشنی کو کہتے ہیں جو کسی عام جلسہ یا خوشی کے موقع پر ہوتی ہے اور اس معروف معنی کے علاوہ ایک سزا کا نام ہے جو یہ تھی کہ مجرم کے سر میں چند جگہ گہرے زخم کر دیے جاتے تھے اور اُن زخموں میں شمع جلاتے تھے

۳ؑ طرزِ تپاک سے مراد ظاہری تپاک اور منافقانہ برتاؤ ہے یعنی اس منافقانہ گرمجوشی سے میں افسردگی اور سرد مہری بہتر سمجھتا ہوں اور اسی کا آرزومند ہوں ۱۲

۴ؑ شوق = عشق۔ ہر رنگ = ہر طرح۔ بہر حال۔ رقیب = دشمن۔ رنگ کا لفظ تصویر کی مناسبت سے استعمال ہوا ہے۔ اس شعر کا مطلب صاف ہے صرف پردہ کا لفظ فریب دیتا ہے۔ دراصل نفس معنی پر اس لفظ کا کوئی اثر نہیں پردۂ تصویر سے مراد تصویر ہے اور اضافت مجازی ہے پردہ کی رعایت عریانی کے ساتھ ظاہر ہے۔ شاعر کے نزدیک قیس کی تصویر عریاں ہی کھینچی جا سکتی ہے ۱۲۔

۵ؑ داد نہ دی = تدبیر نہ کی۔ پرافشاں = پھڑکتا ہوا یعنی سراسیمہ اور پریشان ۱۲

بوئے گل۔ نالۂ دل۔ دودِ چراغِ محفل	جو تری بزم سے نکلا۔ سو پریشاں نکلا
دلِ حسرت زدہ تھا مائدۂ[1] لذتِ درد	کام یاروں کا بقدرِ لب و دنداں نکلا
تھی[2] نوآموزِ فنا۔ ہمتِ دشوار پسند	سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

دل میں پھر گریے نے اک شور اٹھایا غالب

آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا

دھمکی میں مر گیا۔ جو نہ بابِ نبرد[3] تھا	عشقِ نبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا
تھا[4] زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا	اڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

[1] مائدہ کھانا دینے والا۔ مجازاً یعنی دسترخوان۔ شاعر کہتا ہے کہ میرے ہمدموں میں سے ہر شخص بقدر استعداد خود کامیاب ہوا۔ ۱۲

[2] بعض شرح و اکثر دیوانوں میں ہے نوآموزِ فنا ہے۔ بعض میں ہے نوآموزِ فنا۔ مگر ایک پرانے نسخے میں جو مرزا کی زندگی میں طبع ہوا ہے "تھی نوآموزِ فنا" ہے جو "ہے" اور "سے" کے مقابل میں قریب الفہم ہے۔ یعنی میری ہمت ایسی دشوار پسند تھی کہ درسِ فنا اس کے لیے ایک معمولی نوآموزی کا سا کام تھا اس لیے سخت مشکل ہے کہ یہ دشوار کام بھی آسان ہے یعنی افسوس کہ ہمارے مراحلِ فنا بھی بآسانی طے ہو گئے ۱۲۔

[3] بابِ نبرد۔ لائقِ نبرد یا جنگ کے قابل عشقِ نبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا۔ یعنی عشق جواں مرد جنگ جو کو مقابلہ کے لیے چاہتا تھا ۱۲۔

[4] یعنی موت کے کھٹکے کی وجہ سے زندگی ہی میں چہرے پر ایسی اداسی اور زردی چھا رہی تھی جیسے مرنے کے وقت ہوتی ہے ۱۲۔

تالیفِ[۱] نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں
مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

دل تا جگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب
اس رہ گزر میں جلوۂ گل آگے گرد[۲] تھا

جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہِ عشق کی
دل بھی اگر گیا تو وہی[۳] دل کا درد تھا

احباب چارہ سازیِ وحشت نہ کر سکے
زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

یہ لاشِ بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

شمارِ[۴] سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا ع تماشائے بیک کف بردنِ صد دل پسند آیا

۱ میں اُس وقت وفا کا عادی تھا جب کہ میری طفلی اور ناتجربہ کاری کا عالم تھا ۱۲۔
۲ گرد تھا۔ خاک بھی نہ تھا۔ بے وقعت تھا یعنی کبھی ہم بھی رنگین طبع تھے اور اب تو دل جگر سب مغموم رکھتے ہیں ۱۲۔
۳ وہی اُسی طرح یا یہ اشارہ ہے دل کے جانے کی طرف۔ دوسری صورت میں یہ معنی ہوئے کہ دل نہ رہا تو بجائے خود ایک درد ہو گیا۔ میر لکھتا ہے

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا ؛ دم کے جانے کا نہایت غم رہا

۴ شمارِ سبحہ۔ تسبیح کے دانوں کا شمار کرنا۔ مرغوب آیا۔ مرغوب ہوا۔ صد دل۔ بیک کف بردن۔ ایک ہاتھ میں سو سو دل لینا۔ پسند آیا۔ پسند ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ معشوق کو تسبیح کا شمار کرنا جس میں سو سو دانے ہوتے ہیں اس وجہ سے پسند آیا ہے کہ اس میں اُس کی خواہش کے مطابق ایک ہی وار میں سو سو دل کھینچ لینے کی مشابہت موجود ہے۔ شمارِ سبحہ (آیا) کا فاعل ہے۔ مرغوب آنا فارسی محاورہ مرغوب آمدن کا لفظی ترجمہ ہے جس طرح خوش آمدن کا خوش آنا۔ لیکن اول الذکر اردو میں کم استعمال کیا جاتا ہے ۱۲

بفیضِ بے دلی[1]۔ نومیدیِ جاوید آساں ہے
کشایش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا

ہوائے[2] سیرِ گل۔ آئینۂ بے مہریِ قاتل
کہ اندازِ بخوں غلتیدنِ بسمل پسند آیا

جراحت[3] تحفہ۔ الماس ارمغاں۔ داغِ جگر ہدیہ
مبارکباد اسدؔ غمخوارِ جانِ دردمند آیا

۸

دہر میں نقشِ وفا۔ وجہِ تسلی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

---

[1] دنیا کی طرف سے بیدلی کے سبب ہمیشہ کی مایوسی کا برداشت کرلینا ہمارے لیئے آسان ہے۔ دوسرے مصرعہ میں شاعر کہتا ہے کہ ہمارا عقدۂ مشکل کشایش کو پسند آگیا ہے یعنی اب ہماری مشکل کبھی آسان نہ ہوگی کیونکہ کشایش کو جو عقدہ پسند آگیا ہو اُس کا حل ہونا معلوم۔ بیدلی کے معنی ہیں دل سے محرومی۔ مثلاً "منِ بیدل بہ جمالِ تو عجب حیرانم" مجازاً کم ذوقی۔ اور بے حسی کو بھی کہتے ہیں۔ مثلاً بے دلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق بے دلی بمعنی افسردگی وکم ذوقی بھی دوسرے مطلب کے لئے مفید ہے۔ یعنی دنیا سے افسردگی اور بے لطفی پیدا ہوجانے کی وجہ سے ہم کو امید عزیز نہ رہی۔ اس لئے نومیدی جاوید کی وہ دل آزاری اور جاں کاہی ہمارے لیئے ختم ہوگئی ورنہ مایوس ہونا اور ہمیشہ کے لیئے مایوس ہونا تھا حقیقتاً ایک سخت مشکل کام جس کو کشایش نے آسان کرنے کے لیئے انتخاب فرمایا اور یوں آسان کردیا کہ ہمیں بے دلی عطا فرمادی ۱۲۔

[2] ہوائے سیرِ گل: سیرِ گل کی خواہش۔ آئینۂ بے مہریِ قاتل۔ قاتل کی سخت دلی کا ثبوت پہلے مصرعہ میں فعل "ہے" محذوف ہے۔ اندازِ بخوں غلتیدنِ بسمل۔ بسمل کا خون میں لوٹنے کا انداز مطلب یہ ہے کہ قاتل کا سیرِ گل دیکھنے کے لیے جانا اُس کی جفاجوئی کی دلیل ہے کہ محبتِ گل کی تماشائے گل اُسے صرف اس وجہ سے پسند ہے کہ گل کو خون میں لوٹنے والے بسمل سے مشابہت ہے ۱۲۔

[3] جراحت بالکسر: زخم۔ الماس: بالفتح ہیرا اور جوہردار تلوار کی ایک قسم "غمخوارِ جانِ دردمند" عشق سے مراد ہے ۱۲۔

سبزۂ خط سے ترا کاکلِ سرکش نہ دبا
یہ زمرد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

دل گزرگاہِ خیالِ مے و ساغر ہی سہی
گر نفس جادۂ سرمنزلِ تقوی نہ ہوا

ہوں ترے وعدہ نہ کرنے میں بھی راضی کہ کبھی
گوش منت کشِ گلبانگِ تسلی نہ ہوا

کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالب
ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسی نہ ہوا

۱ زمرد:۔ سبز رنگ کا ایک قیمتی پتھر۔ افعی: سانپ۔ سبزۂ خط کو زمرد سے تشبیہ دی ہے اور کاکل کو افعی سے۔ اپنے معشوق سے شاعر کہتا ہے کہ زمرد کے عکس سے سانپ تو اندھا ہو جاتا ہے لیکن تیرا سبزۂ خط کیسا زمرد ہے کہ زلف کے سانپ پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوا۔ سبزۂ خط نکل آنے کے باوجود زلف کا زہریلا اثر یعنی دلفریبی بدستور باقی ہے ۱۲۔

۲ مصرعۂ ثانی کے معنی کہنے سے شعر کا مطلب صاف ہو جاتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر سانس پرہیزگاری کی منزل پر پہنچنے کی راہ نہیں بن سکتی تو دل شراب اور جام کے خیال کی گزرگاہ بن سکتا ہے۔ یعنی اگر متقی بننا ممکن نہیں تو رند ہی سہی ۱۲

۳ گلبانگ:۔ آوازِ خوش ۱۲۔

۴ حریف:۔ مقابل۔ حریف دمِ عیسی کو برداشت نہ کر سکا۔

۹ [1] ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاق نسیاں کا

[2] بیاں کیا کیجیے بیداد کاوش ہائے مژگاں کا
کہ ہر اک قطرۂ خوں دانہ ہے تسبیح مرجاں کا

[3] نہ آئی سطوت قاتل بھی مانع میرے نالوں کو
لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا

دکھاؤں گا تماشہ۔ دی اگر فرصت زمانے نے
مرا ہر داغ دل۔ اک تخم ہے سرو چراغاں کا

[4] کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے
کرے جو پرتو خورشید عالم شبنمستاں کا

۱ طاق نسیاں کا:۔ اضافت مجازی ہے گلدستہ اور طاق کی رعایت ظاہر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم بیخودان محبت ایک عالم کو بھلا بیٹھے ہیں اور زاہد جس باغ فردوس کی تعریف میں اس قدر رطب اللسان ہے ہم اس کا خیال ترک کر چکے کسی چیز کو طاق پر رکھنا۔ اس کا خیال ترک کر دینا یہی ترکیب ایک جگہ اور بھی ہے۔ یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں۔ لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں۔ یا طاق نسیاں کے معنی میں بام نسیاں بھی فارسی میں مستعمل ہے ۱۲

۲ قطرۂ خون کو مرجان یعنی مونگا کے دانے سے جو تسبیح میں پڑا ہو تشبیہ دی ہے یعنی مژگان یار نے ہر قطرۂ خون میں سوراخ کر دیا ہے ۱۲۔

۳ سطوت:۔ رعب۔ نیستاں۔ نے پیدا ہونے کی جگہ۔ نے وہ چیز جس سے نالے کے مانند آواز پیدا ہوتی ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ میں نے رعب معشوق سے مرعوب ہو کر بطور عجز دانت میں تنکا لیا تھا۔ لیکن اس کا رعب میرے نالوں کو نہ روک سکا اور وہ تنکا جو اظہار عجز کے لیے دانت میں لیا تھا ریشۂ نیستاں بن گیا یعنی نالہ کشی کی جڑ بن گیا۔ فارسی محاورہ ہے خس بہ دندان گرفتن جس سے مراد ہے اظہار عجز کرنا۔ یہ محاورہ ایران اور ترکستان کا ہے اور یہ محاورہ اس فوجی رسم سے پیدا ہوا ہے کہ مغلوب اپنے دانتوں میں تنکا لیکر فاتح سے طالب امان ہوتے تھے ۱۲۔

۴ شبنمستاں مرکب ہے شبنم اور ستاں سے یعنی وہ جگہ جو شبنم سے بھیگی ہوئی ہو اس شعر میں آئینہ خانہ کی مثال شبنمستاں سے تشبیہ مرکب ہے ۱۲۔

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

اُگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشا کر
مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغِ مردہ ہوں میں بے زباں گورِ غریباں کا

ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے
دلِ افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا

بغل میں غیر کی آج آپ سوتے ہیں کہیں ورنہ
سبب کیا خواب میں آ کر تبسم ہائے پنہاں کا

نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا
قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا غالبؔ
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

لہ تعمیر و تخریب فلسفہ کی مشہور اصطلاحیں ہیں جس کے معنی بنانا اور بگاڑنا ہیں۔ مضمر۔ پوشیدہ۔ ہیولیٰ فلسفہ کی اصطلاح میں مادہ کو کہتے ہیں۔ خون گرم۔ سرگرمی۔ دہقان کے معنی کاشتکار کے ہیں۔ یہاں دہقاں سے مراد حرارت غریزی سے ہے اور خرمن حیات جسمانی سے استعارہ ہے خون گرم سرگرمی برقِ خرمن ہے۔ شعر کا خلاصہ یہ ہے کہ وجود انسانی درحقیقت فانی ہے فانی عنصروں سے بنایا گیا ہے۔ اس سے بھی زیادہ صاف مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ میرا وجود میری فنا کی دلیل ہے جس طرح دہقان کی سرگرمی خود اس کی خرمن دکھایان کے لیے بجلی کا کام کرتی ہے۔ غرض یہ ہے کہ نہ دہقان اپنی سرگرمی کوشش سے خرمن اکٹھا کرتا نہ بجلی اس کو برباد کرتی۔ اس شعر میں فلسفیوں کی اصطلاحیں ہیں اور شاعرانہ استعاروں میں جس خوبی سے انسانی ہستی بے ثبات کا نقشہ کھینچا گیا ہے وہ غالب ہی کا حصہ ہے ۱۲ سلہ چراغ مردہ: بجھا ہوا چراغ۔ چراغ کی لو اور آدمی کی زبان کی تشبیہ ظاہر ہے۔ بجھے ہوئے چراغ میں لو نہیں ہوتی، اس لیے اسے بے زبان آدمی کو تشبیہ دی ہے ۱۲ سلہ اس شعر میں خیال یار کو یوسف اور دل افسردہ کو حجرہ زنداں سے تشبیہ دی ہے سلہ لہو پانی ہونا یعنی رونا۔ مژگانِ سرشک آلودہ: آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی پلکیں ۱۲ سلہ جادۂ راہِ فنا کو دنیا کے اجزائے پریشاں کا شیرازہ اس لیے کہا گیا کہ تمام اوراقِ عالم فنا ایک ہی رشتہ میں سیئے ہوئے ہیں ۱۲

مصرع اول	نمبر	مصرع ثانی
۱؎ نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا	۱۰	حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا
۲؎ محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے		کہ موجِ بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا
۳؎ سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی	۱۱	عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا
۴؎ بقدرِ ظرف ہے ساقی خمارِ تشنہ کامی بھی		جو تو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

۱؎ یک بیاباں ماندگی۔ کثرتِ ماندگی۔ ذوق۔ ذوقِ رہ نوردی۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح موج کا ذوقِ روانی کبھی کم نہیں ہوتا اسی طرح میرا ذوقِ رہ نوردی بھی کم نہیں ہونا چاہیے میں کتنا ہی کیوں نہ تھک جاؤں یک بیاباں مقدار اور کثرت کے لیے ایک دوسری جگہ بھی استعمال ہوا ہے۔ ع یک بیاباں جلوۂ گل فرشِ پا انداز ہے ۱۲

۲؎ شاعر کہتا ہے کہ پہلے مجھے چمن سے عشق تھا اور اب یہ حال ہے کہ بوئے گل سے ناک میں دم آتا ہے یعنی جی بیزار ہوتا ہے ۱۲

۳؎ سراپا رہنِ عشق۔ ہمہ تن مبتلائے عشق۔ ناگزیرِ الفتِ ہستی۔ فارسی محاورہ ہے یعنی محبت زندگی پر مجبور ہوں۔ افسوس حاصل کا۔ خرمن کے نقصان کا افسوس۔ مطلب یہ کہ ادھر تو مبتلائے عشق ہوں۔ فنا کر دینا جس کا خاصہ ہے اور ادھر اپنی زندگی کو عزیز رکھتا ہوں جو مقتضائے فطرت ہے۔ پس میری مثل اس دہقان کی سی ہے جو بجلی کو پوجتا بھی ہو اور اپنے خرمن کی بربادی پر متاسف بھی ہو۔

۴؎ خمیازہ:۔ انگڑائی مجازاً بڑے کام کا نتیجہ اس شعر کا مطلب صاف ہے شاعر کہتا ہے کہ اگر ساقی کا ظرف دریا کی سی حیثیت رکھتا ہے تو میرا حوصلہ بھی اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ میں دریا کو نوش کر سکتا ہوں ۔۱۲

محرم[1] نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا — یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا ۱۲

رنگِ[2] شکستہ صبحِ بہارِ نظارہ ہے — یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا

تو اور سوئے غیر نظرہائے تیز تیز — میں اور دکھ تری مژہ[3] ہائے دراز کا

صرفہ[4] ہے ضبطِ آہ میں میرا وگرنہ میں — طعمہ ہوں ایک ہی نفسِ جاں گداز کا

ہیں بس[5] کہ جوشِ بادہ سے شیشے اچھل رہے — ہر گوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا

۱؎ محرم :- جو حرم یعنی پردہ نشینوں میں آتا جاتا ہو۔ مجازاً وہ شخص جو بھیدوں سے واقف ہو مثلاً محرم راز۔ حجاب یعنی پردہ جس کو پردہ ساز کے ساتھ لفظی مناسبت حاصل ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ تو بھید کی باتوں سے خود ناواقف ہے یا یہ کہ تیرے پاس گوش شنوا نہیں ورنہ دنیا میں جو بظاہر تجھے پردہ نظر آتا ہے وہ بھی پردہ ساز کی طرح اسرار الٰہی ظاہر کر رہا ہے۔ یعنی جو چیزیں بظاہر مانع کشف راز معلوم ہوتی ہیں وہ درحقیقت کاشف راز ہیں ۱۲

۲؎ اس شعر میں شاعر نے اپنے رنگ شکستہ یعنی اڑے ہوئے رنگ کو بہار نظارہ کی صبح سے تشبیہ دی ہے اور چونکہ صبح کے وقت پھول کھلتے ہیں۔ اس لیے وہ اپنے معشوق سے کہتا ہے کہ صبح کے وقت میرے منہ پر ہوائیاں اڑتے ہوئے دیکھ کر تو بھی اپنے ناز کے پھول کو کھلانے یعنی سرگرم ناز ہو ۱۲۔

۳؎ مژہ ہائے دراز :- دل میں گھر کرنے والی مژگاں ۱۲

۴؎ صرفہ :- فائدہ۔ طعمہ بالضم۔ خورش و لقمہ۔ نفس جاں گداز۔ جان کو گھلا دینے والی سانس یعنی روح کو تحلیل کرنے والی آہ۔

۵؎ گوشۂ بساط :- بزم عیش (جس کے کونوں پر شراب چنی ہوئی ہو) فرش کا گوشہ۔ شیشہ باز بازی گروں کا ایک فرقہ ہے جو سر پر شیشہ رکھ کر ناچتے ہیں۔ ان کا کمال یہ ہے کہ باوجود حرکات رقاصی شیشہ ان کے سر سے نہیں گرتا ۱۲

کاوش کا دل کرے ہے تقاضا۔ کہ ہے ہنوز
ناخن پہ قرض۔ اُس گرہِ نیم باز کا

تاراج کاوشِ غمِ ہجراں ہوا اسدؔ
سینہ کہ تھا۔ دفینہ گہر ہائے راز کا

۱۳

بزمِ شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا
رکھیو یا رب! یہ درِ گنجینۂ گوہر کھلا

شب ہوئی پھر۔ انجمِ رخشندہ کا منظر کھلا
اِس تکلف سے۔ کہ گویا بتکدے کا در کھلا

گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب
آستیں میں دشنہ پنہاں۔ ہاتھ میں نشتر کھلا

گو نہ سمجھوں اُس کی باتیں۔ گو نہ پاؤں اُس کا بھید
پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھلا

ہے خیالِ حسن میں حسنِ عمل کا سا خیال
خلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا

منہ نہ کھلنے پر ہے۔ وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھ کر نقاب اُس شوخ کے منہ پر کھلا

۱ گرہ نیم باز مراد دل سے ہے یعنی جو دل بوجہ تنگی گرہ ہو کے رہ گیا ہے نیم باز سے یہ اشارہ ہے کہ یہ دل پہلے بھی لذتِ کاوش سے بہرہ مند ہو چکا ہے مگر وہ ناتمام رہا ۱۲

۲ تاراج بمعنی غارت فارسی میں تاراج دادن اور تاراج کردن دونوں مستعمل ہیں غالب نے اردو میں تاراج ہونا استعمال کیا ہے مطلب یہ ہے کہ اے اسد میرے سینے کو جس میں بہت سے راز پوشیدہ تھے غمِ ہجراں نے غارت کر دیا یعنی معشوق کی جدائی کے غم نے مجھے رسوا کیا ۱۲۔

۳ دشنہ بالفتح بمعنی خنجر ایک شارح نے بجائے دشنہ کے دست لکھ کر اس کی شرح لکھی ہے برایجاد بندہ ہے ۱۲۔

۴ پری پیکر کھلا معشوق بے تکلف ہوا ۱۲۔

۵ ترجمہ نگاہیں معشوق کے چہرۂ رنگیں کے خیال سے سرور اندوز ہیں جس طرح کوئی بہشت کا منظر سامنے ہو۔ گویا خیال اور حسنِ عمل دونوں کا ایک ہی ثمرہ ہے ۶ منہ پہ کھلا یعنی نقاب منہ پر کھلا معلوم

در پہ رہنے کو کہا۔ اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصہ میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

کیوں اندھیری ہے شبِ غم ہے بلاؤں کا نزول
آج اُدھر ہی کو رہے گا دیدۂ اختر کھلا

کیا رہوں غربت میں خوش؟ جب ہو حوادث کا یہ حال
نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بر اکثر کھلا

اُس کی اُمت میں ہوں میں۔ میرے رہیں کیوں کام بند
واسطے جس شہ کے غالب۔ گنبدِ بے در کھلا

عطیہ

رام بابو سکسینہ

(ن) (۱۴)

شب کہ برقِ سوزِ دل سے۔ زہرۂ ابر آب تھا
شعلۂ جوالہ۔ ہر اک۔ حلقۂ گرداب تھا

واں کرم کو عذرِ بارش۔ تھا عناں گیرِ خرام
گریہ سے یاں پنبۂ بالش۔ کفِ سیلاب تھا

۱ پہلے مصرعہ کا جزو اول سوال اور اُسی شعر کے دوسرے مصرعہ میں اُس کا جواب دیا گیا ہے یعنی ستاروں کا رُخ آسمان کی طرف پھرا رہے گا۔ ۱۲

۲ غربت = مسافرت۔ کھلا خط وہ روانہ ہوتا ہے جس میں خبرِ مرگ لکھی جاتی ہے ۱۲

۳ گنبدِ بے در = آسمان۔ گنبدِ بے در کے کھلنے سے واقعۂ شبِ معراج کی طرف اشارہ ہے ۱۲

۴ زہرہ بفتحِ اول = بمعنی پتّا دلیری و شجاعت۔ جوالہ = گھومنے والا گردش کرنے والا مطلب یہ ہے کہ رات کو دل کی تپش جو مثلِ برق تھی اس سے ابر کا پتّا پانی ہو گیا تھا اور اُس کے اثر سے جو بھنور پانی میں پڑتا تھا شعلۂ جوالہ کی طرح چکر کھا رہا تھا۔ ۱۲

۵ پنبۂ بالش = تکیہ کی روئی۔ کفِ سیلاب = سیلاب کے جھاگ یعنی اُس کا کرم بارش کی وجہ سے نہ ہو سکا اور یہاں بوجہ گریہ تکیے کی روئی کفِ سیلاب نظر آتی تھی ۱۲۔

واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال
یاں ہجوم اشک میں ۔ تار نگہ نایاب تھا [1]
جلوۂ گل نے ۔ کیا تھا ۔ واں چراغاں آب جو
یاں رواں مژگان چشم تر سے ۔ خون ناب تھا
یاں سر پُرشور بے خوابی سے ۔ تھا دیوار جو [2]
واں وہ فرق ناز محو بالش کم خواب تھا
یاں ۔ نفس کرتا تھا روشن ۔ شمع بزم بیخودی
جلوۂ گل واں بساط صحبت احباب تھا [3]
فرش سے تا عرش ۔ واں ۔ طوفاں تھا ۔ موج رنگ کا
یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا

---

[1] مولانا طباطبائی کو یہ اعتراض ہے کہ آب جو کے لفظ کے بعد لفظ "کو" کی ضرورت ہے اور یہ حذف صحیح نہیں ہے ۔ آب جو اور آب جو دو لفظ ہیں اور دونوں کے معنی مختلف ہیں آب جو نہر کا پانی اور آب جو بہ ترکیب مقلوب پانی کی نہر شعر میں نہر کا پانی مراد ہے اگر پانی کی نہر مراد لی جائے تو فی زمانہ لفظ "کو" محذوف کرنا ضرور متروک ہے مگر متقدمین کے یہاں ایسے حذف کی بکثرت مثالیں ملیں گی ۱۲

[2] دیوار جو ۔ دیوار کی تلاش کرنے والا ۔ شاعر نے سر کو دیوار تلاش کرنے والا کہا ہے مطلب یہ ہے کہ ہجر میں نیند نہ آنے کی وجہ سے میرا سر دیوار سے ٹکرانے کے لیے دیوار کا متلاشی تھا ۔ فرق ناز ۔ معشوق کا سر ۱۲

[3] موج رنگ کا طوفان تھا ۔ فصل گل کا جوش تھا ۔ سوختن کا باب تھا ۔ سوختن کا مصدر گردانا جا رہا تھا یعنی جلنا ہی جلنا تھا ۱۲

نالہ ہائے[۱] اس رنگ سے خوں نابہ ٹپکانے لگا
دل کہ ذوقِ کاوشِ ناخن سے لذت یاب تھا

نالۂ دل میں شب اندازِ اثر نایاب تھا[۲]
تھا سپند بزمِ وصلِ غیر گو بیتاب تھا

مقدمِ سیلاب[۳] سے دل کیا نشاط آہنگ ہے
خانۂ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا

نازشِ ایامِ خاکستر نشینی کیا کہوں
پہلوئے اندیشہ وقفِ بسترِ سنجاب تھا[۴]

۹۵

---

[۱] اس رنگ سے خوں نابہ ٹپکانے لگا: یوں بہنے لگا۔ کاوشِ ناخن استعارہ ہے کاوشِ غم سے ۱۲۔ مندرجۂ بالا اشعار قطعہ بند ہیں اور قطعہ میں شاعر نے اپنی ناکامی اور معشوق کی بے پروائی کا مقابلہ کیا ہے اور اس چھٹے شعر میں وہ دوسری غزل کی طرف جو اسی قافیہ ردیف میں لکھی ہے اشارہ کرتا ہے ۱۲

[۲] نایاب تھا: نہ تھا۔ سپند کالا دانہ جو دفعِ نظرِ بد کے لیے جلاتے ہیں مطلب یہ ہے کہ رات کو میرے دل نے جو نالہ کیا وہ بے اثر تھا یعنی میرے لیے مفید نہ تھا۔ بلکہ بجائے اس کے کہ اس سے مجھے فائدہ پہنچتا وہ باوجود بے تابی رقیب کی بزمِ وصل کے لیے سپند بن گیا۔ یعنی اس نے رقیب کی بزمِ وصل کو نظرِ بد سے بچانے کی خدمت انجام دی ۱۲

[۳] مقدمِ سیلاب: سیلاب کا آنا مقدم بالفتح کسی جگہ سے واپس آنے کو کہتے ہیں۔ نشاط آہنگ: مسرور۔ سازِ صدائے آب شاعر نے فارسی ترکیب چھاپ بنا کر جل ترنگ کا مفہوم ادا کیا ہے جل ترنگ ایک ہندوستانی باجا ہوتا ہے جس میں سات پیالوں میں کم و بیش پانی رکھا جاتا ہے اور اسے سارنگی کے پردوں سے ملا دیا جاتا ہے۔ آہنگ و سازنہ میں جو مناسبت ہے وہ ظاہر ہے ۱۲ [۴] پہلوئے اندیشہ: پہلوئے خیال۔ سنجاب: دیکھو نوٹ صفحہ ۱۸

کچھ نہ کی[1] اپنے جنونِ نارسا نے ۔ ورنہ ۔ یاں
ذرّہ ذرّہ ۔ روکشِ خورشیدِ عالمتاب تھا

آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے ؟
کل تلک تیرا بھی دل مہر و وفا کا باب تھا

یاد کر وہ دن ۔ کہ ہر اک حلقہ تیرے دام کا
انتظارِ صید میں ۔ اک دیدۂ بیخواب تھا

میں[2] نے روکا رات غالبؔ کو وگرنہ دیکھتے
اس کے سیلِ گریہ میں ۔ گردوں کفِ سیلاب تھا

ایک[3] ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب	۱۲	خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

بالکل سر ایک جانور کا نام ہے جس کے پوست سے پوستین بناتے ہیں اور اس پوستین کو بھی سنجاب کہتے ہیں جس کا رنگ خاکی ہوتا ہے اسی وجہ سے خاکستر نشینی اور بستر سنجاب کا مقابلہ پر لطف ہے شاعر نے اس شعر میں قناعت پر اظہار فخر کیا ہے کہ مجھے خاک نشینی میں بھی بستر سنجاب کے مزے ملتے تھے ۱۲

[1] کچھ نہ کی ۔ کچھ نہ ہو سکا جنونِ نارسا ۔ عشق ناتمام ۱۲ ۔ روکش ۔ مقابل یعنی جنونِ نارسا نے اکتسابِ فیض سے محروم رکھا ۔ ورنہ یاں تو ذرہ ذرہ چشمۂ نور تھا ۱۲

[2] یعنی اس کے سیلابِ گریہ کی بلندی آسمان تک پہونچ جاتی ۱۲

[3] ایک ایک قطرہ کا حساب دینا پڑا ۔ یعنی میرے جگر کا سارا خون آنکھوں سے قطرہ قطرہ ہو کر ٹپک گیا اور چونکہ میرا جگر مژگانِ یار کے ذریعے سے خون ہوا تھا ۔ اس لیے وہ خون اسی کی امانت تھی

اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو ۱؎	توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا
گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں ۲؎	جاں دادۂ ہوائے سرِ رہ گزار تھا
موجِ سرابِ دشتِ وفا کا نہ پوچھ حال ۳؎	ہر ذرہ مثلِ جوہرِ تیغ آب دار تھا

کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو پر اب ۴؎
دیکھا تو کم ہوئے پہ غمِ روزگار تھا

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا ۵؎	۱۷	آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

۱؎ ماتمِ یک شہر آرزو۔ ہزاروں آرزوؤں کا خون۔ یک شہر آرزو میں۔ وہی ترکیب ہے جو یک بیاباں ماندگی میں ہے (ملاحظہ ہو صفحہ ۱۰۔ نوٹ نمبر ۵) تمثال۔ تصویر۔ مطلب یہ ہے کہ جب تو نے وہ آئینہ جس میں تیری تصویر تھی توڑ ڈالا تو میری ہزاروں آرزوؤں کا خون ہو گیا۔ یعنی مجھے انتہا درجہ کا رنج ہوا ۱۲

۲؎ ہوا:- آرزو۔ رہ گزار سے مراد رہ گزرِ معشوق ہے ۱۲

۳؎ سراب بالفتح:- وہ ریت جو دور سے چمکتی ہے اور پیاسے کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دریا بہ رہا ہے۔ اسی مناسبت سے موجِ سراب کہا گیا ہے اور جس طرح سراب سے پیاسا دھوکا کھاتا ہے۔ اسی طرح وفا محض سراب ہے۔ دنیا میں اس کا وجود نہیں ہے شاعر کا مطلب یہ ہے دشتِ وفا کے سراب کا ہر ذرہ مثلِ جوہرِ تیغ کے عشاق باوفا کا قاتل ہے ۱۲

۴؎ کم ہوئے پہ بھی زیادہ نکلا ۱۲

۵؎ انساں ہونا:- یعنی انسانِ کامل ہونا۔ جو حقیقی صفاتِ آدمیت اور سیرتِ انسانی کا نمونہ ہو۔ مولانا حالی نے یادگارِ غالب میں اس شعر کے پہلے مصرعہ کو اس طرح لکھا ہے۔ بس کہ مشکل ہے ہر اک کام کا آساں ہونا۔ لیکن عام دیوانوں میں اسی طرح ہے جیسا ہم نے لکھا ہے اس شعر کا

گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی — در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

وائے دیوانگیٔ شوق کہ ہر دم مجھ کو — آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا

جلوہ ازبسکہ تقاضائے نگہ کرتا ہے — جوہرِ آئینہ[۱] بھی چاہے ہے مژگاں ہونا

عشرتِ قتل گہِ اہلِ تمنا مت پوچھ — عیدِ نظارہ[۲] ہے شمشیر کا عریاں ہونا

لے گئے خاک میں ہم داغِ تمنائے نشاط — تو ہو اور آپ بصد رنگ گلستاں[۳] ہونا

عشرتِ پارۂ دل زخمِ تمنا[۴] کھانا — لذتِ ریشِ جگر غرقِ نمکداں ہونا

مطلب یہ ہے کہ دنیا میں آسان سے آسان کام بھی دشوار ہے۔ اس کی دلیل مصرعۂ ثانی میں بیان کی ہے کہ آدمی جو کہ عین انسان ہے۔ اس کا بھی انسان یعنی انسانِ کامل بننا مشکل ہے

۱ آئینہ سے آئینۂ فولادی مراد ہے۔ کیونکہ جوہر اُسی میں ہوتا ہے۔ آئینہ کو آنکھ سے تشبیہ دی ہے ۱۲

۲ شمشیر کو ہلال سے جو نسبت ہے وہ ظاہر ہے۔ شمشیرِ عریاں کو ہلالِ عید سمجھ کر عشاق خوش ہوتے ہیں۔ عیدِ نظارہ سے مراد وہ عید ہے جس میں معشوق کی دید نصیب ہو۔ مولٰنا طباطبائی نے اپنی شرح میں لکھا ہے کہ اس میں ہلال کا لفظ آنا ضروری تھا۔ بغیر اس کے شعر کا مطلب ناتمام رہ گیا ہے لیکن عید کا لفظ موجود ہونے سے ذہنی وجود ہلال کا پیدا ہوتا ہے جیسے روزِ روشن کے نام سے ذہنی وجود آفتاب کا۔ آگے چلکر لفظ شمشیر موجود ہے جو ہلال سے مشابہ ہے اور رویتِ ہلال کے وقت شمشیر دیکھنے کی مناسبت موجود ہے۔ موجودِ ذہنی کا محذوف رکھنا ایک خوبی ہے نہ کہ قابلِ گرفت۔ الکنایۃ ابلغ من الصریح مشہور مقولہ ہے ۱۲

۳ بصد رنگ گلستاں ہونا۔ خوشی سے باغ باغ ہونا ۱۲۔

۴ زخمِ تمنا کھانا۔ آرزو پوری ہونا ۱۲

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ	ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

حیف اُس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

۱۸

شب خمارِ شوقِ ساقی[1] رستخیز اندازہ تھا
تا محیطِ بادہ۔ صورت خانۂ خمیازہ تھا

یک قدم وحشت سے۔ درسِ دفترِ امکاں کھلا
جادہ اجزائے دو عالم[2] دشت کا شیرازہ تھا

---

[1] شوقِ ساقی۔ ساقی کی آمد کا شوق۔ رستخیز اندازہ۔ قیامت کی مثل۔ خمیازہ انگڑائی۔ محیطِ بادہ۔ ظرفِ شراب کا وہ خط جہاں تک شراب بھری ہو۔ مطلب یہ ہے کہ رات ساقی کی آمد کے شوق نے قیامت بپا کر رکھی تھی۔ یہاں تک کہ خود شراب بھی خمیازہ کش تھی گویا ساقی کے شوق میں تمام شراب خانہ میں صورت خانۂ خمیازہ کی کیفیت نظر آ رہی تھی ۱۲۔

[2] دو عالم دشت۔ اکثر شارحین کے نزدیک دو عالم بھی بیان کثرت ہے جس سے کثرت بیابانی مراد ہے۔ دو عالم دشت میں اضافت مقلوب قرار دی جائے تو اس کی اصل صورت ہوگی۔ دشت دو عالم جس میں اضافت اضافت مجازی ہوگی۔ مطلب یہ کہ دونوں عالم ایک دشت تھے جس میں جادۂ وحشت ایک شیرازہ تھا اور اس میں دفتر صحرائے کائنات کے تمامی اجزا منسلک تھے (پہلے دو عالم کو وحشت کی رعایت سے دشت فرض کیا ہے۔ اور پھر دشت دو عالم کو درس کی رعایت سے ایک دفتر قرار دیا ہے) خلاصہ یہ کہ عقل کی مدد سے رازِ ہستی نہ معلوم ہوا۔ بلکہ جس وقت ذرا فہم وشعور سے بیگانگی پیدا ہوئی۔ یعنی نشۂ معرفت نے اثر کیا ایک لخت تمام اسرارِ سربستہ کا انکشاف ہو گیا صوفیہ کے یہاں عقل کو اکتساب معرفت

مانع وحشت خرامی ہائے لیلیٰ کون ہے ؟

خانۂ مجنونِ صحرا گرد۔ بے دروازہ تھا

پوچھ مت۔ رسوائی اندازِ استغنائے حُسن

دست مرہونِ حنا۔ رخسار رہنِ غازہ تھا

نالۂ دل نے دیئے اوراقِ لختِ دل۔ بہ باد[1]

یادگارِ نالہ۔ ایک دیوانِ بے شیرازہ تھا

۱۸

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا؟[2]

زخم کے بھرنے تلک۔ ناخن نہ بڑھ آئنگے کیا؟

بے نیازی حد سے گزری۔ بندہ پرور کب تلک

ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا؟

حضرتِ ناصح گر آئیں۔ دیدہ و دل فرشِ راہ

کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا؟

ہیں سے راہ قرار دیتے آئے ہیں ۱۲

[1] دیئے اوراق دل بہ باد۔ یہ محاورہ فارسی محاورہ اوراق دل بہ باد دادن سے لیا گیا ہے اور اس شعر میں دل کو دیوان سے اور دل کے ٹکڑوں کو اوراق دیوان سے نسبت دی گئی ہے۔ اس شعر کا مطلب یہ ہے۔ نالۂ دل نے اوراق کو پریشان کر دیا۔ اور دل ایک دیوان بے شیرازہ کی طرح ہو گیا ۔۱۲

[2] پہلے اور دوسرے مصرعہ میں کیا مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے شاعر کہتا ہے کہ

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لاینگے کیا؟

گر کیا ناصح نے ہم کو قید "اچھا یوں سہی"
یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جاینگے کیا؟

خانہ زادِ زلف ہیں۔ زنجیر سے بھاگینگے کیوں؟
ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبرانیگے کیا؟

لہ ہے اب اس معمورے میں قحطِ غمِ الفت اسد
ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں۔ کھاینگے کیا؟

۲۰

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

ترے وعدے پر جیئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا[عہ]
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

دوستوں کو میرے ناخن کاٹنے سے کیا فائدہ کیا پھر بڑھ نہ آئینگے ۱۲

لہ شاعر کہتا ہے کہ شہرِ دہلی میں آج کل غمِ الفت کا قحط ہو یعنی معشوقوں کی کمی ہو ۱۲

عہ ایک فارسی شاعر میر عبداللہ بیامی کہتے ہیں ؎

بیم از وفا ندارد بدہ وعدۂ کرمن ÷ از ذوقِ وعدۂ تو بہ فردا نمیرسم

فارسی شاعر نے اپنے شعر میں صرف یہ بیان کیا ہے کہ وعدۂ وصل کرنے میں اس خیال سے پس و پیش نہ کر کہ اس کا ایفا کرنا پڑیگا۔ کیونکہ میں تیرے وعدہ کی خوشی میں کل تک نہ زندہ ہی نہ رہونگا اور نہ میں ہونگا نہ مجھے وعدہ ایفا کرنے کی نوبت آئے گی۔ ایک غیر انصاف پسند نکتہ چین نے غالب کے اس شعر کو مندرجۂ بالا فارسی شعر کا ترجمہ لکھا ہو لیکن اس نے غور نہیں کیا کہ غالب کے شعر میں جو چوچلا پایا جاتا ہے اور اس کے سننے سے سامع کے دل پر جو اثر ہوتا ہے فارسی شعر میں اس کا پتا نہیں۔ وعدے کو جھوٹ جان کر

تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا
کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیر نیم کش[1] کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا

رگ سنگ[2] سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غم عشق گر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شب غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

[3] یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

اس پر زندہ رہنا ایک نئی بات ہے ۱۲

[1] تیر نیم کش: وہ تیر جسے چھوڑتے وقت کماندار نے کمان کو پورا نہ کھینچا ہو ۱۲

[2] عاشق کا غم اگر شرار بنکر پتھر میں پوشیدہ ہوتا تو اس کا یہ اثر ہوتا کہ رگ سنگ سے ایسا لہو ٹپکتا جو بند ہونے کا نام نہ لیتا ۱۲

[3] اس مقطع کو ابو ظفر شاہ نے سن کر فرمایا تھا کہ "کبھی ہم تو جب بھی ایسا نہ سمجھتے" مرزا نے کہا "حضور تو اب بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں مگر یہ اس لیئے ارشاد ہوا کہ کہیں میں اپنی ولایت پر مغرور نہ ہو جاؤں" ۱۲

۲۱

ہوس[1] کو ہے نشاطِ کار کیا کیا ؎ نہ ہو مرنا۔ تو جینے کا مزا کیا؟

تجاہل پیشگی سے۔ مدعا کیا؟ ؎ کہاں تک۔ اے سراپا ناز کیا کیا؟

نوازش[2] ہائے بیجا دیکھتا ہوں ؎ شکایت ہائے رنگیں کا۔ گلا کیا؟

نگاہِ[3] بے محابا چاہتا ہوں ؎ تغافل ہائے تمکیں آزما کیا؟

فروغِ شعلۂ خس یک نفس ہے ؎ ہوس[4] کو۔ پاسِ ناموسِ وفا کیا؟

نفس[5] موجِ محیطِ بیخودی ہے ؎ تغافل ہائے ساقی کا گلا کیا؟

دماغِ[6] عطرِ پیراہن نہیں ہے ؎ غمِ آوارگی ہائے صبا۔ کیا؟

---

[1] نشاطِ کار:- کام کرنے کی اُمنگ۔ اس شعر میں بالکل اچھوتے طریقے سے اس فطرت انسانی کا بیان ہوا ہے کہ انسان کو جس قدر تھوڑی سی فرصت ہوتی ہے اُسی قدر زیادہ سرگرمی سے وہ کام انجام دیتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ دنیا میں جس قدر چہل پہل ہے وہ اس یقین کی بدولت ہے کہ دنیا میں زندہ رہنے کا زمانہ تھوڑا ہے ۱۲

[2] نوازش ہائے بیجا: غیروں پر مہربانی۔ شکایت ہائے رنگیں: وہ شکایتیں جو بطریق محبت ادا کی جائیں نہ بطور شکوہ ۱۲۔

[3] نگاہِ بے محابا: نگاہِ بے تکلف:- بے حجاب۔ تغافل تمکیں آزما:- وہ چشم پوشی جو صبر کی آزمائش کے لیے کی جائے ۱۲

[4] ہوس:- رقیب کی جھوٹی محبت کی طرف اشارہ ہے کہ رقیب کی محبت شعلۂ خس کی طرح دم بھر کی ہے اس کو ناموسِ وفا کا پاس نہیں ہے ۱۲ [5] اس شعر میں شاعر نے دنیا سے اپنی بے تعلقی کا اظہار کیا ہے وہ کہتا ہے کہ جس شخص کو دنیا کی ہوس نہ ہو اُسے دنیا کی بے وفائی کا کیا غم ہو سکتا ہے ۱۲

[6] عطرِ پیراہن:- عطرِ پیراہنِ یار۔ اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں پیراہنِ یار کی خوشبو سونگھنے کا دماغ ہی نہیں اس لیے ہمیں اس کا بھی غم نہیں کہ صبا اس کی خوشبو کو کیوں پھیلا رہی ہے ۱۲

دلِ[1] ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر
ہم اس کے ہیں، ہمارا پوچھنا کیا؟

محابا[2] کیا ہے؟ میں ضامن، ادھر دیکھ
شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا؟

سن[3] اے غارت گرِ جنسِ وفا سن
شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا؟

کیا[4] کس نے جگرداری کا دعوے
شکیبِ خاطرِ عاشق، بھلا کیا؟

یہ[5] قاتل وعدۂ صبر آزما کیوں؟
یہ کافر فتنۂ طاقت ربا کیا؟

بلائے جاں ہے غالبؔ اس کی ہر بات
عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

(۲۲)

درخورِ قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا
پھر غلط کیا ہے؟ کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

---

[1] سازِ انا البحر — وہ باجہ جس سے یہ آواز نکلتی ہے کہ میں دریا ہوں ۱۲
[2] محابا کیا ہے — تامل کیا ہے ۱۲
[3] شکستِ دل کو شاعر نے شکستِ قیمتِ دل سے تعبیر کیا ہے مطلب یہ ہے کہ شکستِ دل کی صدا اگر تجھے اچھی معلوم ہوتی ہے تو دل شکنی کیے جا اور یہ صدا سنے جا۔ بھلا میرے دل کی صدائے شکست کی تجھے کیا پروا ہے جو تامل کرے ۱۲
[4] جگرداری — استقلال ۱۲
[5] یہ کافر فتنۂ طاقت ربا — اشارہ ہے وعدۂ صبر آزما کی طرف جس کا ذکر مصرعۂ اولیٰ میں آیا ۱۲ –

بندگی[1] میں بھی - وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ - ہم
اُلٹے پھر آئے - درِ کعبہ - اگر وا نہ ہوا

سب کو مقبول ہے - دعویٰ تری یکتائی کا
روبرو - کوئی بُت آئینہ سیما نہ ہوا

کم نہیں - نازشِ ہم نامیِ چشمِ خوباں[2]
تیرا بیمار بُرا کیا ہے ؟ گر اچھا نہ ہوا

سینے[3] کا داغ ہے وہ نالہ - کہ لب تک نہ گیا
خاک کا رزق ہے وہ قطرہ - جو دریا نہ ہوا

نام کا میرے ہے وہ دُکھ - کہ کسی کو نہ ملا
کام میں میرے ہے وہ فتنہ - کہ برپا نہ ہوا

ہر بُنِ مُو سے دمِ ذکر - نہ ٹپکے خوں ناب[4]
حمزہ کا قصہ ہوا عشق کا چرچا نہ ہوا

قطرے[5] میں دجلہ - دکھائی نہ دے ؟ اور جزو میں کُل
کھیل لڑکوں کا ہوا - دیدۂ بینا نہ ہوا

---

[1] خود بیں وہ شخص جو دوسرے کی بات پسند نہ کرے ۱۲
[2] ہم نامیِ چشمِ خوباں - اس وجہ سے کہا ہے کہ معشوق کی آنکھ کو بیمار کہتے ہیں ۱۲
[3] سینے کا داغ ہے - قابلِ شرم ہے - خاک کا رزق ہے - رائیگاں ہے ۱۲
[4] نہ ٹپکے خوں ناب ؟ کیوں نہ ٹپکے - یعنی ضرور ٹپکے استفہام اقراری ہے ۱۲ -
[5] اس شعر کے پہلے مصرعہ میں بھی استفہام اقراری کی خوبی موجود ہے - یعنی دیدۂ بینا کو ہر جزو میں کُل کا تماشا نظر آتا ہے ۱۲

تھی خبر گرم کہ غالب کے اُڑیں گے پُرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

اسدؔ ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سر و پا ہیں[۲۳]
کہ ہے سر پنجۂ مژگانِ آہو پشت خار اپنا

پئے نذرِ کرم تحفہ ہے شرم نارسائی کا[۲۴]
بخوں غلطیدۂ صد رنگ، دعویٰ پارسائی کا
نہ ہو حُسنِ تماشا دوست رسوا بے وفائی کا
بہ مہرِ صد نظر ثابت ہے دعویٰ پارسائی کا

سلہ جنوں جولاں: مجنونوں کی طرح پریشان پھرنے والا اپنی بے سر و پائی اس سے ظاہر کی ہے کہ پشت خارتک نہ رہی۔ پنجۂ مژگانِ آہو کو اپنا پشت خار قرار دیا ہے جس سے اپنی انتہائی وحشت کا اظہار منظور ہے۔ پشت خار اس آلہ کو کہتے ہیں جس سے پیٹھ کھجاتے ہیں اور جو اکثر آزاد فقیروں کے پاس رہتا ہے ۱۲

سلہ پئے نذرِ کرم: درگاہِ خداوندی میں نذر گزراننے کے لیے میری شرم نارسائی کا تحفہ (یعنی شرم نارسائی کی طرف سے تحفہ) میری پرہیزگاری کا وہ دعویٰ جس کا سو گنا ہوں کے ہاتھ خون ہو چکا ہے

سلہ حُسنِ تماشا دوست: وہ حُسن جو اپنی نمائش کو دوست رکھے۔ رسوائی وفائی کا: فارسی ترکیب رسوائے بے وفائی کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر میرے یار کا حُسن دوسروں کو اپنا جلوہ دکھانا پسند کرتا ہے تو اس پر الزامِ بے وفائی عائد نہیں ہو سکتا۔ اگر میرے سوا اس کے سو دیکھنے والے بھی ہوں تو یہ سو نگاہیں اس کے دعویٰ پارسائی پہ مُہر کرتی ہیں ۱۲

زکاتِ[۱] حسن دے۔ اے جلوۂ بینش۔ کہ مہر آسا
چراغِ خانۂ درویش ہو کاسہ گدائی کا

نہ[۲] مارا جان کر بے جرم۔ قاتل۔ تیری گردن پر
رہا مانند خونِ بے گنہ۔ حق آشنائی کا

تمنائے[۳] زباں۔ محوِ سپاسِ بے زبانی ہے
مٹا جس سے تقاضا شکوۂ بے دست و پائی کا

وہی[۴] اک بات ہے۔ جو یاں نفس۔ واں نکہتِ گل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے۔ مری رنگیں نوائی کا

۱ے شاعر اپنے معشوق سے کہتا ہے کہ اپنے حسن کی زکات دے تاکہ سورج کے فقیر کا کاسۂ گدائی اس کے گھر کا چراغ بنجائے مطلب یہ ہے کہ معشوق کے حسن سے جو معدن نور ہے اگر چالیسواں حصہ زکاۃ میں مال کا چالیسواں حصہ سال بھر کے بعد دیا جاتا ہے بھی عاشق کو مل جائے گا تو عاشق کا دل معرفت الٰہی کے نور سے مالا مال ہو جائیگا ۱۲

۲ے اس شعر میں قاتل کو مخاطب کیا گیا ہے "اے" حرف ندا محذوف ہے بعض نسخوں میں قاتل کی جگہ غافل ہے لیکن سب سے پرانے نسخے میں جو ۱۸۴۱ء میں مطبع احمدی دہلی میں چھپا ہے اور جس کی کاپیوں کی صحت خود مرزا نے کی ہے غافل نہیں بلکہ قاتل ہے مطلب یہ ہے اے قاتل تو نے بے جرم جانکر مجھے نہیں مارا اس لیے آشنائی کا حق تیری گردن پر خون بے گناہ کی طرح رہا یعنی حق آشنائی کا یہ تھا کہ تو مجھے قتل کر دیتا ۱۲

۳ے شاعر کہتا ہے زبان کی تمنا اس شکر میں محو ہے کہ اس کو بے زبانی کی نعمت عطا ہوئی ہے اس وجہ سے بے دست و پائی کے شکوہ کا تقاضہ بھی مٹ گیا۔ یعنی بے دست و پائی کے شکوہ کا تقاضہ تھا کہ مجھے بیان کر مگر بے زبانی کے سبب وہ تقاضا اس کا مٹ گیا گویا بے زبانی کا احسان ہوا کہ مجھے شکوہ کے بجائے تسلیم کا درجہ ملا ۱۲ ۴ے "وہی اک بات" اشارہ ہے جلوۂ حسن کی طرف، اور جلوۂ چمن سے [illegible] مراد ہے ۱۲

وہاں[1] ہر شہرتِ پیغارہ جو زنجیرِ رسوائی
عدم تک بے وفا چرچا ہے تیری بے وفائی کا

نہ دے نامہ کو اتنا طول غالبؔ مختصر لکھ دے
کہ حسرت سنج ہوں عرضِ ستم ہائے جدائی کا

۲۵

گر نہ اندوہِ شبِ فرقت بیاں ہو جائیگا
بے تکلف داغِ مہ مہرِ دہاں ہو جائیگا

زہرہ[2] گر ایسا ہی شامِ ہجر میں ہوتا ہے آب
پرتوِ مہتاب سیلِ خانماں ہو جائیگا

لے تو لوں سوتے میں اُس کے پاؤں کا بوسہ مگر
ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائیگا

دل کو ہم صرفِ وفا سمجھے تھے کیا معلوم تھا
یعنی یہ پہلے ہی نذرِ امتحاں ہو جائیگا

سب کے دل میں ہے جگہ تیری جو تو راضی ہوا
مجھ پہ گویا اک زمانہ مہرباں ہو جائیگا

[1] پیغارہ بمعنی طعنہ۔ یہ شعر نہایت پیچیدہ ہے خاصکر زنجیرِ رسوائی کی ترکیب نہایت دقیق ہے۔ ہماری رائے میں اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ ہر طعنہ زنِ معشوق کا منہ تیرے حق میں زنجیرِ رسوائی بن گیا۔ یعنی تیری بیوفائی کی شہرت جو تجھ کو رسوا کرنے والی تھی ایک معشوق سے گذر کر دوسرے تک اور دوسرے سے تیسرے تک پہونچی اور اس شہرت کا سلسلہ یوں ہی دور تک چلا گیا اور اس طرح سے زنجیرِ رسوائی کی صورت پیدا ہو گئی اور جب معشوقوں کے گروہ میں جو خود بے وفا ہوتے ہیں تیری بے وفائی کا چرچا اس حد تک پہونچ گیا تو گویا عدم تک پہنچ گیا یعنی اس کی کچھ حد نہایت ہی نہیں ہے۔ یہی دہن کو چونکہ شاعر عدم باندھتے ہیں۔ اس لیے اس شعر میں عدم کا لفظ خاص مناسبت رکھتا ہے ۱۲

[2] اس شعر میں پرتوِ مہتاب (چاندنی) کو سیلِ آب سے تشبیہ دی ہے مطلب یہ ہے کہ شب ہجر کی چاندنی عاشق کے لیے موجب آزار ہوتی ہے ۱۲

گر نگاہِ گرم[1] فرماتی رہی تعلیمِ ضبط
شعلہ خس میں جیسے، خوں رگ میں نہاں ہو جائیگا

باغ میں مجھ کو نہ لیجا ورنہ میرے حال پر
ہر گلِ تر ایک چشمِ خوں فشاں ہو جائیگا

وائے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو
اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہو جائیگا

فائدہ کیا؟ سوچ، آخر تو بھی دانا ہے اسدؔ
دوستی ناداں کی ہے، جی کا زیاں ہو جائیگا

۲۲

درد منت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا، برا نہ ہوا

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو؟
اک تماشا ہوا، گلا نہ ہوا

ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں
تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

ہے خبر گرم اُن کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

کیا[2] وہ نمرود کی خدائی تھی؟
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

۱؎ نگاہِ گرم = نظرِ عتاب ۱۲
۲؎ یادگارِ غالب میں مولانا حالی نے اس شعر کا مطلب یہ لکھا ہے کہ کیا میری بندگی نمرود کی خدائی تھی جس سے مجھے سوا نقصان کے کچھ فائدہ نہ ہوا۔ یہاں بندگی سے مراد عبادت نہیں بلکہ عبودیت ہے۔ اگر "وہ" کا اشارہ بندگی کی طرف نہ سمجھا جائے بلکہ "وہ" سے معشوق کا غرورِ حسن سمجھا جائے تو مطلب دوسرا ہو جاتا ہے ۱۲

جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی — حق تو یہ ہو کہ حق ادا نہ ہوا
زخم گر دب گیا۔ لہو نہ تھما[1] — کام گر رک گیا۔ روا نہ ہوا
رہزنی ہے۔ کہ دلستانی ہے! — لے کے دل۔ دلستاں روانہ ہوا

کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا

گلہ ہے شوق[2] کو دل میں بھی تنگیِ جا کا — گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا
یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخ مکتوب — مگر ستم زدہ ہوں۔ ذوقِ خامہ فرسا کا
حنائے[3] پائے خزاں ہے۔ بہار اگر ہے یہی — دوامِ کلفتِ خاطر ہے عیش دنیا کا
غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو — مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا[4] کا

[1] مرزا غالب کے وقت میں تھنبا لکھا جاتا تھا چنانچہ اصل نسخہ مطبوعہ [illegible] میں اس لفظ کا یہی املا ہے۔ لیکن زمانۂ موجودہ میں تھنبا متروک ہے تھما لکھا جاتا ہے ۱۲

[2] شوق کو۔ اضطرابِ شوق کو۔ گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا۔ دریا گہر میں سما گیا۔ گہر کو دل سے اور شوق کو اضطراب دریا سے مشابہت ہے ۱۲

[3] حنائے پائے خزاں۔ خزاں کے پاؤں میں لگی ہوئی مہندی کی لالی۔ بہار کی ناپائداری کی طرف یہ اشارہ ہے ۱۲

[4] خندۂ بیجا۔ خندۂ گل۔ گلوں کی ہنسی کسی موقع و محل سے نہیں ہوتی۔ اس لیے خندۂ بے محل سے تعبیر کیا ۱۲

ہنوز[۱] محرمیِ حسن کو ترستا ہوں
کرے ہے ہر بُنِ مو کام چشمِ بینا کا

دل اُس کو پہلے ہی ناز و ادا سے دے بیٹھے
ہمیں دماغ کہاں حسن کے تقاضا کا

نہ کہہ[۲] کہ گریہ بہ مقدارِ حسرتِ دل ہے
مری نگاہ میں ہے جمع و خرج دریا کا

فلک[۳] کو دیکھ کے کرتا ہوں اُس کو یاد اسدؔ
جفا میں اس کی ہے اندازِ کارفرما کا

۲۸

قطرۂ[۴] مے بس کہ حیرت سے نفس پرور ہوا
خطِ جامِ مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا

اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا
غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

۱ محرمیِ حسن کو ترستا ہوں۔ یعنی کُنہِ ذات تک رسائی نہیں۔ دوسرے مصرعے کے شروع میں لفظ "اگرچہ" محذوف ہے ۱۲

۲ حسرتِ دل کو دریا کا منبع (یعنی جمع کہا گیا ہے) اور آنسوؤں کو جو حسرتیں دل سے نکلتے ہیں دریا کے خرج سے نسبت دی ہے۔

۳ کارفرما: معشوق کی طرف اشارہ ہے ۱۲

۴ نفس پرور: نفس کو پالنے والا یعنی دم کا سادھنے والا ساکت اور منجمد سے مراد ہے خود مرزا نے اپنے ایک خط میں اس شعر کی شرح لکھتے ہوئے لکھا ہے کہ اس مطلع میں خیال تو دقیق نظم کیا گیا ہے لیکن لطف زیادہ نہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ قطرہ جو شیشے میں بے جنبش رہا افراطِ حیرت سے ٹپکنا بھول گیا۔ برابر بوندیں جو تھم رہ گئیں تو پیالے کا خط اس لڑی کی صورت بن گیا جس میں موتی پروئے گئے ہوں ۱۲

(۲۹)

جب بہ تقریبِ سفر یار نے محمل باندھا
تپشِ شوق نے ہر ذرہ پہ اِک دل باندھا

اہلِ[1] بینش نے بہ حیرت کدۂ شوخیِ ناز
جوہرِ آئینہ کو طوطیِ بسمل باندھا

یاس[2] و امید نے یک عربدہ میداں مانگا
عجزِ ہمت نے طلسمِ دلِ سائل باندھا

نہ[3] بندھے تشنگیِ ذوق کے مضموں غالبؔ
گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

۳۰

میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

ہے ایک تیر جس میں دونوں چھدے پڑے ہیں
وہ دن گئے کہ اپنا دل سے جگر جدا تھا

---

[1] حیرت کدہ سے مراد آئینہ ہے اور جب آئینہ میں عکسِ یار موجود ہو تو اس میں شوخیِ ناز کی موجودگی بھی شامل ہوئی اس شوخیِ ناز کے اثر سے جوہرِ آئینہ اہلِ بینش کو طوطیِ بسمل معلوم ہونے لگا ۱۲

[2] عربدہ: بالفتح۔ لغوی معنی جنگجوئی۔ عربدہ میداں: میدانِ جنگ۔ طلسم باندھا: طلسم بنایا ۱۲

[3] تشنگیِ ذوق کے مضموں نہ بندھے۔ ذوقِ سخن کی تشنگی برابر قائم رہی ۱۲

درماندگی میں غالبؔ۔ کچھ بن پڑے تو جانوں
جب رشتہ بے گرہ تھا۔ ناخن گرہ کشا تھا

۳۱

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو۔ ویراں ہوتا
تنگیٔ دل کا گلہ کیا۔ یہ وہ کافر دل ہی
بحر۔ گر بحر نہ ہوتا۔ تو بیاباں ہوتا
کہ اگر تنگ نہ ہوتا۔ تو پریشاں ہوتا
[1] بعد یک عمر ورع۔ بار تو دیتا بارے
کاش رضواں ہی۔ در یار کا درباں ہوتا

۳۲

نہ تھا۔ کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
[2] ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا
ہوا جب غم سے یوں بے حس۔ تو غم کیا۔ سر کے کٹنے کا
نہ ہوتا گر جدا تن سے۔ تو زانو پر دھرا ہوتا

ہوئی مدت کہ غالبؔ مرگیا پر یاد آتا ہی
وہ ہر اک بات پہ کہنا۔ کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

[1] بعد یک عمر ورع:۔ پرہیزگاری کی مدت معینہ ۱۲

[2] ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا:۔ میری ہستی نے مجھ کو برباد کر دیا۔ اس شعر میں نیستی کی ہستی پر نہایت خوبی سے ترجیح ثابت کی گئی ہی۔ پہلے مصرعہ میں ہر طرح سے خدا کا ہونا بتا کر شاعر کہتا ہی کہ اگر میں نہ ہوتا تو یہ دیکھنا چاہیئے کہ کیا ہوتا۔ یعنی خدا ہوتا ۱۲

۳۴

یک ذرّہ زمیں نہیں بے کار باغ کا / یاں جادہ[1] بھی فتیلہ ہی لالے کے داغ کا

بے مے کسے ہی طاقتِ آشوبِ[2] آگہی / کھینچا ہی عجزِ حوصلہ نے خطِ ایاغ کا

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل / کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہی دماغ کا

تازہ نہیں ہی نشۂ فکرِ سخن مجھے / تریاکیِ قدیم ہوں دودِ چراغ[3] کا

سو بار بندِ عشق سے آزاد ہم ہوئے / پر کیا کریں کہ دل ہی عدو ہی فراغ کا

بے خونِ دل ہی چشم میں موجِ نگہ غبار[4] / یہ مے کدہ خراب ہی مے کے سراغ کا

---

[1] جادہ: پگڈنڈیا۔ یعنی روش۔ فتیلہ: بتی۔ پہلا مصرعہ صاف ہی۔ یعنی موسم بہار میں ہر جگہ پھول ہی کھلے نظر آتے ہیں چپہ بھر زمین اس سے خالی نہیں ہی۔ یہاں تک کہ روشیں بھی گل ہائے لالہ کی کثرت کی وجہ سے گویا لالے کے داغ کا فتیلہ بنی ہوئی ہیں ۱۲۔

[2] آشوب: شور و غوغا، ہنگامہ۔ آگہی میں یعنی ہوش کی حالت میں انسان کا مبتلائے افکارِ دنیوی ہونا لابدی ہی اس لیے آشوبِ آگہی کہا گیا۔ شاعر کہتا ہی کہ آشوبِ آگہی کا مقابلہ (یعنی افکارِ دنیوی سے نجات حاصل کرنا) بغیر شراب کے ناممکن ہی لیکن یہاں ہماری پست حوصلگی نے ایاغ (جامِ شراب) پر خط کھینچ دیا ہی۔ یعنی ایک ساغر سے (اور ساغر بھی وہ جو ایک حد تک بھرا ہوا ہو) یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔

[3] دودِ چراغ: فکرِ کلام، روشن۔ تریاکی: فارسی لغت میں اس شخص کو کہتے ہیں جو افیون کھانے کا عادی ہو یہاں محض عادی سے مراد ہی اور تریاکی ایک مشہور فارسی شاعر کا تخلص بھی تھا ۱۲

[4] شاعر کہتا ہی کہ میری آنکھ سے اشکوں کی راہ خونِ دل نہیں آیا اس لیے موجِ نگہ غبار بن رہی ہی۔ یعنی بغیر خوں فشانی کے گویا خاک اڑ رہی ہی اور یہ مے کدہ (یعنی آنکھ) مے (خونِ دل) کے تجسس میں خراب ہی ۱۲

باغِ شگفتہ تیرا[۱] بساطِ نشاطِ دل
ابرِ بہار خمکدہ کس کے دماغ کا

۱۴

وہ مری چینِ جبیں سے غمِ پنہاں سمجھا
رازِ مکتوب بہ بے ربطیِ عنواں سمجھا

یک[۲] الف بیش نہیں صیقلِ آئینہ ہنوز
چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

شرحِ اسبابِ گرفتاریِ خاطر مت پوچھ
اس قدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا

بدگمانی[۳] نے نہ چاہا اُسے سرگرمِ خرام
رُخ پہ ہر قطرہ عرق۔ دیدۂ حیراں سمجھا

۱ بعض شارحین نے تیرا کو بساطِ نشاطِ دل کے ساتھ مضاف کیا ہے۔ ہماری رائے میں یہ غلط ہے "تیرا" کا تعلق باغِ شگفتہ سے ہے۔ شاعر اپنے معشوق سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ جب تیرے حسن کا شگفتہ باغ میرے سرورِ دل کا سبب ہے تو ابرِ بہار میری مستی کا باعث نہیں ہو سکتا ۱۲

۲ اس شعر کی شرح خود مرزا کی لکھی ہوئی اردوئے معلّٰی میں موجود ہے وہ لکھتے ہیں "پہلے یہ سمجھنا چاہیے کہ آئینہ عبارت فولاد کے آئینہ سے ہے ورنہ حلبی آئینوں میں جوہر کہاں اور ان کو کون صیقل کرتا ہے۔ فولاد کی جس چیز کو صیقل کرو گے بے شبہ پہلے ایک لکیر پڑے گی اس کو الفِ صیقل کہتے ہیں جب یہ مقدمہ معلوم تو اب اس مفہوم کو سمجھیے مصرعہ

چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

یعنی ابتدائے سنِ تمیز سے مشقِ جنوں ہے۔ اب تک کمالِ فن نہیں حاصل ہوا آئینہ تمام صاف نہیں ہو گیا ہے بس وہی ایک الفِ صیقل کی جو ہے۔ چاک کی صورت الف کی سی ہوتی ہے اور چاکِ جیب تا حدِ جنوں ہیں سے ہے"۔ غالب "

۳ قطرۂ عرق پہ فکِ اضافت استعمال ہوا ہے یعنی قطرہ عرق۔ اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ معشوق خود اپنے سے بھی بدگمان ہے۔ اسے اس بدگمانی نے سرگرمِ خرام ہونے دیا کیونکہ خرام سے پسینے کی بوندیں اس کے رُخ پر نمودار ہو جائیں جو عاشق کے دیدۂ حیراں لگا

عجز سے اپنے یہ جانا کہ وہ بدخو ہوگا ‖ نبضِ خس سے تپشِ شعلۂ سوزاں سمجھا

سفرِ عشق میں کی ضعف نے راحت طلبی ‖ ہر قدم سائے کو میں اپنے شبستاں سمجھا

تھا گریزاں مژۂ یار سے دل تا دمِ مرگ ‖ دفعِ پیکانِ قضا اس قدر آساں سمجھا

دل دیا جان کے کیوں اس کو وفادار اسدؔ
غلطی کی کہ جو کافر کو مسلماں سمجھا

۳۵

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا ‖ دل جگر تشنۂ فریاد آیا

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز ‖ پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

سے مشابہ سمجھی جاتیں ۱۲ ؎ نبضِ خس :- عجز کی نبض ٹٹولنا۔ شاعر نے اپنے عجز کو خس کہا ہے۔ تپش حرارت :- شعلۂ سوزاں معشوق کی بدخوئی شاعر کہتا ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ جس قدر عاجزی کروں گا معشوق کی بدخوئی بڑھے گی اور معشوق کی بدخوئی عاشق کی بربادی کا باعث ہوا کرتی ہے مطلب یہ ہے کہ میرا عجز اور یہی میری ہلاکت کا سبب ہوگا ۱۲

؎ شبستان :- رات گزارنے کی جگہ۔ اس شعر کی ترکیب صاف ہے۔ اگر استعاروں کو دور کر دیا جائے تو مطلب یہ نکلتا ہے کہ انسان غایت ناکامیابی کی حالت میں یاس و ناامیدی ہی سے تسکین و تسلی پانے کا آرزومند ہوتا ہے ۱۲

؎ دوسرے مصرع میں آیا بمعنی ہوا۔ دل جگر میں حرفِ عطف محذوف ہے ۱۲

؎ اس شعر میں دوست کو رخصت کرتے وقت کی دردناک کیفیت کے تھوڑے وقفے سے یاد آنے کی حالت کو قیامت سے تعبیر کیا ہے ۱۲

[۱] سادگی ہائے تمنا یعنی
پھر وہ نیرنگِ نظر یاد آیا

[۲] عذرِ واماندگی اے حسرتِ دل
نالہ کرتا تھا جگر یاد آیا

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی
کیوں ترا راہ گزر یاد آیا

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی!
گھر ترا خُلد میں گر یاد آیا

آہ وہ جرأتِ فریاد کہاں!
دل سے تنگ آ کے جگر یاد آیا

پھر ترے کوچہ کو جاتا ہی خیال
دلِ گم گشتہ مگر یاد آیا

[۳] کوئی ویرانی سی ویرانی ہی!
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

[۴] میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ
سنگ اُٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

---

[۱] پہلے مصرعہ میں "دیکھیے" محذوف ہی۔ نیرنگِ نظر معشوق کی صفت ہی۔ مطلب یہ ہی کہ پہلے معشوق کے ملنے میں کوئی کامیابی ہوئی جو اب پھر یاد آیا ۱۲

[۲] اس شعر کا مطلب یہ ہی حسرتِ دل کا تقاضا یہ تھا کہ نالہ کیا جائے اور نالہ تھا واماندہ جگر کو نالہ کرنا ہی دشوار تھا۔ نالہ اپنی واماندگی کا عذر کر رہا تھا کہ جگر یاد آگیا۔ پس نالہ بے سبب رہا۔ جگر یاد آیا سے مطلب ہی خوف معلوم ہوا۔

[۳] اس شعر میں صنعتِ ابہام ہی۔ یعنی یہ معنی بھی نکلتے ہیں کہ ہمارا گھر اس قدر ویران ہی کہ دشت کی ویرانی اس کی یاد کو تازہ کرتی ہے۔ ۱۲

[۴] میں نے مجنوں کی بجائے اپنے سر میں پتھر مارا ۱۲

۳۶

ہوئی[1] تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا
آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

تم سے بیجا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ
اس میں کچھ شائبۂ خوبیِ تقدیر بھی تھا

تو مجھے بھول گیا ہو تو پتا بتلا دوں
کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا

قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد
ہاں کچھ اک رنجِ گرانباریِ زنجیر بھی تھا

بجلی اک[2] کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے۔ کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

یوسف اُس کو کہوں۔ اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی
گر بگڑ[3] بیٹھے تو میں لائقِ تعزیر بھی تھا

دیکھ کر غیر کو ہو کیوں نہ کلیجہ ٹھنڈا
نالہ کرتا تھا ولے طالبِ تاثیر بھی تھا

پیشے میں عیب نہیں رکھیئے نہ فرہاد کو نام
ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا

ہم تھے مرنے کو کھڑے پاس نہ آیا۔ نہ سہی
آخر اُس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

[1] عناں گیر کے لغوی معنی باگ کو پکڑنے والے کے ہیں یہاں مراد روکنے والے سے ہے یہ فارسی ترکیب ہے اُس کا اُردو استعمال غالب کے لیے مخصوص ہے۔ غالب کے معترض کہتے ہیں کہ غالب کا یہ شعر عرفی کے اِس فارسی شعر کا ترجمہ ہے ٭ زغیرت ہیچ دانا باز ناید در گہِ جاناں ٭ بہانا دستِ امیدِ کسے واندعنانش را۔ لیکن جو لوگ غالب پر یہ اعتراض کرتے ہیں وہ حکیم افلاطون کے اِس قول کو بھول جاتے ہیں کہ آسمان کے نیچے کوئی نئی چیز نہیں ہے وہ ہی پہلی چیزیں رنگ اور صورت بدل کر بار بار آیا کرتی ہیں یہی حالت شاعروں کے تخیل کی ہے اور اسی کو توارد کہتے ہیں۔ غالب نے تاخیر کی وجہ ظاہر کرنے کے لیے عناں گیر کا جو لفظ استعمال کیا ہے وہ قابلِ داد ہے ۱۲

[2] پہلے مصرعہ میں معشوق کی ایک جھلک دیکھ لینے کو بجلی کا کوندنا بتایا ہے۔ نہایت لطیف کنایہ ہے ۱۲

[3] مصرعہ ثانی میں تھا کا فاعل "وہ" محذوف ہے ۱۲

ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانہ میں کوئی میرؔ بھی تھا

۳۷
لب[۵۱] خشک در تشنگی مردگاں کا — زیارت کدہ ہوں دل آزردگاں کا
ہمہ[۵۲] ناامیدی ہمہ بدگمانی — میں دل ہوں فریب وفا خوردگاں کا

۳۸
تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا — اوروں پہ ہے وہ ظلم کہ مجھ پر نہ ہوا تھا
چھوڑا[۵۳] مہ نخشب کی طرح دست قضا نے — خورشید ہنوز اُس کے برابر نہ ہوا تھا
توفیق[۵۴] باندازۂ ہمت ہے ازل سے — آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

۵۱ مصرعہ اول کے آخر میں "ہوں" محذوف ہے۔ تشنگی استعارہ ہے آرزو و شوق سے مطلب یہ ہے کہ میں گویا لب خشک ہوں اُن لوگوں کا جو آرزو و شوق میں مر گئے اور میں گویا زیارت گاہ ہوں آزردہ دل لوگوں کا۔ اس شعر میں اظہار ناکامی کا بیان کیا گیا ہے ۱۲

۵۲ فریب وفا خوردگاں: جو لوگ وفا کا فریب کھائے ہوئے ہیں ۱۲

۵۳ ماہ نخشب: وہ مصنوعی چاند جس کو مقام نخشب میں حکیم نخشبی مشہور بہ ابن مقنع نے تیار کیا تھا۔ یہ چاند ایک کنوئیں سے نکلا کرتا تھا۔ لیکن روشنی اس کی چار فرسنگ یعنی ۱۲ میل سے زیادہ نہ پھیلتی تھی (ایک فرسنگ ۳ میل کے برابر ہوتا ہے) شاعر کہتا ہے کہ ویسے معشوق کے مقابلہ میں خورشید ماہ نخشب کی طرح ناقص ہے ۱۲

۵۴ نہایت دقیق خیال ادا کیا گیا ہے۔ پہلے مصرعہ میں دعویٰ ہے اور دوسرے میں ثبوت۔ دعویٰ یہ ہے کہ جس قدر ہمت عالی ہوتی ہے۔ اُسی کے اندازہ سے طاقت اُس کی تائید کرتی ہے۔ ثبوت یہ ہے کہ قطرۂ اشک جس کو آنکھوں میں جگہ ملی اگر اس کی ہمت دریا میں موتی بننے پر قناعت کر لیتی تو اس کو آنکھوں میں جگہ ملنے کا رتبہ حاصل نہ ہوتا ۱۲

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم ۔۔۔ میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

[۱] میں سادہ دل آزردگیِ یار سے خوش ہوں ۔۔۔ یعنی سبقِ شوق مکرر نہ ہوا تھا

[۲] دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک ۔۔۔ میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

[۳] جاری تھی اسدؔ داغِ جگر سے مرے تحصیل
آتش کدہ جاگیرِ سمندر نہ ہوا تھا

۳۹

[۴] شب کہ وہ مجلس فروزِ خلوتِ ناموس تھا ۔۔۔ رشتۂ ہر شمع خارِ کسوتِ فانوس تھا

---

[۱] اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ یار اظہارِ شوق سے آزردہ ہو گیا۔ میں سادہ دل اس لیے خوش ہوں کہ اظہارِ شوق کا سبق ہنوز ایک ہی بار پڑھا تھا۔ اس کی تکرار کی نوبت نہیں پہونچی تھی۔ اگر یار آزردہ نہ ہو جاتا تو تکرار کی ضرورت باقی رہتی۔ اب تکرارِ سبق کا موقع خوب ملا ۱۲

[۲] معاصی؛ جمع معصیت بمعنی گناہ۔ تنک آبی۔ پانی کی کمی۔ تر دامن گنہگار کو کہتے ہیں۔ شعر کے معنی یہ ہیں کہ میں اس درجہ گنہگار ہوں کہ باوجودیکہ دنیا کے گناہوں کا دریا پانی کی کمی کی وجہ سے خشک ہو گیا مگر ابھی ہمارے دامن کا پایہ تک تر نہ ہوا ۱۲

[۳] سمندر۔ بڑے چوہے کی برابر ایک جانور کو کہتے ہیں جو بڑے بڑے آتش کدوں میں جہاں مدتہا دراز تک آگ جل چکی ہو پیدا ہوتا ہے اور آگ ہی سے اس کی زندگی وابستہ ہے آگ سے جدا ہونے پر وہ مر جاتا ہے۔ زمانۂ حال کی تحقیقات علم الحیوانات میں اس جانور کا کہیں ذکر نہیں آیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ عنقا کی طرح صرف شاعروں کے خیال ہی میں اس کا وجود ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ آتش کدہ اس زمانہ سے میرے داغِ جگر سے آتش مزاجی کی تحصیل کرتا ہے جبکہ اس میں سمندر کا وجود بھی نہ تھا۔ خلاصہ یہ کہ آتش اور آتش کدہ اور سمندر سب شاعر ہی کے داغِ جگر سے پیدا ہوئے ہیں ۱۲ [۴] رشتۂ شمع

مشہدِ عاشق سے کوسوں تک جو اُگتی ہے حنا
کس قدر یا رب ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا

حاصلِ الفت نہ دیکھا جز شکستِ آرزو
دل بہ دل پیوستہ[۵] گویا اک لبِ افسوس تھا

کیا کہوں بیماریِ غم کی فراغت کا بیاں
جو کہ کھایا خونِ دل بے منتِ کیموس[۶] تھا

۴۰

آئنہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

قاصد کی اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریے
اُس کی خطا نہیں ہے یہ میرا قصور تھا

۴۱

عرضِ نیازِ[۷] عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لیے ہوئے
ہوں شمعِ کشتہ درخورِ محفل[۸] نہیں رہا

موم بتی میں جو تاگا ہوتا ہے اُسے رشتۂ شمع کہا گیا ہے۔ کسوتِ پیراہن خار، کسوت تھا۔ بے چین تھا۔ فارسی کے محاورے میں خار در پیراہن بودن کے معنی بے چین ہونے کے ہیں۔ غالب نے اسی محاورے کو اردو میں لیا ہے۔ کسوتِ فانوس اس لیے کہا کہ پہلے زمانہ میں لوہے کی قندیل بنا کر اُس پر کپڑا چڑھاتے تھے۔ شاعر کا مطلب یہ ہے کہ معشوق کے خلوت خانے میں اُس کے دیدار سے شمع بے چین اور بیقرار تھی

۵ دل بہ دل پیوستہ: معشوق کے دل سے دل ملا ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ محبت کا نتیجہ مایوسی کے سوا اور کچھ نہ دیکھا۔ اگر معشوق کے دل سے دل بھی ملا تو گویا وصل کی حالت بھی لبِ افسوس بن گئی ۱۲

۶ کیموس: اصطلاحِ طب میں غذا کی وہ صورت جو طبخِ دوم میں یعنی معدہ میں پہنچنے کے بعد پانی کی طرح رقیق ہو کر خون بن جاتی ہے ۱۲

۷ نیاز: نیازمندی ۱۲

۸ محفل استعارہ ہے ہستی سے ۱۲

مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں
شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا

بر روئے شش جہت درِ آئینہ باز ہے
یاں[۱] امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا

وا کر دیے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

دل[۲] سے ہوائے کشتِ وفا مٹ گئی کہ واں
حاصل سوائے حسرتِ حاصل نہیں رہا

بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسدؔ
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

(۴۲)

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف
عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

ذرّہ۔ ذرّہ[۳]۔ ساغرِ خانۂ نیرنگ ہے
گردشِ مجنوں بہ چشمک ہائے لیلیٰ آشنا

---

۱ ہر شخص کے سامنے شاعر اس شعر میں زمانہ کی ناقدر شناسی کا شاکی ہے جس طرح آئینہ قبولِ عکس میں امتیاز نہیں کرتا۔ اسی طرح زمانہ ناقص و کامل میں فرق نہیں کرتا ۱۲

۲ ہوائے کشتِ وفا سے آرزوئے وفا مراد ہے اور واں اشارہ ہے اسی کشتِ وفا کی طرف ۱۲

۳ یعنی دنیا کا ہر ایک ذرہ جو گردش و انقلاب میں مبتلا ہے اس کی یہ گردش نیرنگیٔ فلک کے اشارے سے ہے جس طرح سے مجنوں کی گردش چشم ہائے لیلیٰ کے اشارہ کی پابند تھی دوسرا مصرعہ بر سبیل تمثیل بطور تشریح۔ مصرعۂ اول کہا گیا ہے ۱۲

شوق[1] ہے۔ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز
ذرّہ۔صحرا دست گاہ۔و قطرہ۔دریا آشنا

ہیں[2]۔اوسا اک آفت کا ٹکڑا وہ دل وحشی کہ ہے
عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا

شکوہ سنجِ رشکِ ہم دیگر نہ رہنا چاہیے
میرا زانو مونس اور آئینہ تیرا آشنا[3]

ربطِ یک شیرازۂ وحشت ہیں۔اجزائے بہار
سبزہ بیگانہ۔صبا آوارہ۔گُل ناآشنا

کوہ کن۔نقاشِ یک تمثالِ شیریں تھا اسدؔ
سنگ سے سر مار کر۔ہووے نہ پیدا آشنا[4]

[1] شوق: عشق۔ارباب عجز یعنی عشاق کے حق میں ان کا عشق ہی نازش کے سامان پیدا کر دیتا ہے اور اُن کو اپنے عجز پر ناز کرنے کا حوصلہ دلاتا ہے کیونکہ ذرہ ذرہ ٹکڑا صحرا پیدا ہوتے ہیں اور قطرہ قطرہ بہم ہو کر دریا ہو جاتا ہے ۱۲

[2] ہیں کے بعد لفظ "ہوں" محذوف ہے ۱۲

[3] یہ شعر عام مطبوعہ دیوانوں میں نہیں ہے۔ سنہ ۱۲۳۷ھ کے لکھے ہوئے قلمی دیوان سے لیا گیا ہے ۱۲

[4] فرہاد چاہتا تھا کہ پتھر کو تراش کے شیریں کی ایک تمثال بنالے لیکن وہ ایسا بھی نہ کر سکا۔شاعر طنزیہ کہتا ہے کہ بھلا کہیں پتھروں سے سر پھوڑنے سے معشوق پیدا ہوا کرتے ہیں۔مطلب یہ ہے کہ شاعر کے نزدیک فرہاد کا عشق کامل نہ تھا

(۴۳)

ذکر اُس پری وش کا۔ اور پھر بیاں اپنا
بن گیا۔ رقیب۔ آخر۔ تھا جو رازداں اپنا

مَے[۱] وہ کیوں بہت پیتے بزمِ غیر میں یارب
آج ہی ہوا منظور اُن کو امتحاں اپنا

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے اُدھر ہوتا کاشکے مکاں اپنا

دے[۲] وہ جس قدر ذلّت ہم ہنسی میں ٹالینگے
بارے آشنا نکلا اُن کا پاسباں اپنا

دردِ دل لکھوں کب تک؟ جاؤں اُن کو دکھلادوں
اُنگلیاں فگار اپنی خامہ خوں چکاں اپنا

گھستے گھستے مٹ جاتا آپ نے عبث بدلا
ننگِ سجدہ سے میرے سنگِ آستاں اپنا

---

[۱] شاعر تعجب سے کہتا ہے کہ بزمِ غیر میں اُنھوں نے کثرت سے شراب کیوں پی لی کیا اُنھیں اپنے استقلال اور خودداری کا امتحان منظور تھا؟ استفہام انکاری ہے مطلب یہ ہے کہ امتحان منظور نہ تھا بلکہ شراب کے نشہ سے بے تکلف ہونا منظور تھا ۱۲

[۲] وہ کی ضمیر پاسبان کی طرف ہے شاعر کہتا ہے کہ یہ خوب ہوا کہ معشوق کے در کا پاسبان ہمارا جان پہچان نکل آیا اب اس کے جان پہچان نکل آنے سے اُس ذلت کو جو اُس کے ہاتھوں سے ہمیں پہنچے گی ہم ہنسی میں ٹال دیا کریں گے اور یہ ظاہر کریں گے کہ ہمارا اُس کا مذاق ہوتا ہے ۱۲۔

تا کرے نہ غمازی کر لیا ہی دشمن کو
دوست کی شکایت میں ہم نے ہم زباں اپنا

ہم کہاں کے دانا تھے۔ کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالبؔ دشمن آسماں اپنا

۴۴

سرمۂ مفت نظر ہوں۔ مری قیمت یہ ہی
کہ رہے چشمِ خریدار پہ احساں اپنا

رخصتِ[1] نالہ مجھے دے۔ کہ مبادا ظالم
تیرے چہرے سے ہو ظاہر غمِ پنہاں اپنا

۴۵

غافل۔ بہ وہم ناز۔ خود آرا ہی۔ ورنہ یاں
بے شانۂ صبا نہیں طرۂ گیاہ کا

بزمِ قدح سے عیشِ تمنا نہ رکھ کہ رنگ
صیدِ ز دام جستہ ہی۔ اس دام گاہ کا

[1] یعنی اگر نالہ کی اجازت نہ ملے گی تو ہم اُس کو ضبط کریں گے اور اُس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اُس کا اثر تجھے محسوس ہوگا ۱۲

[2] صیدِ ز دام جستہ :۔ دام سے نکلا ہوا شکار بزمِ عیش کے رنگ کو شاعر نے صیدِ ز دام جستہ کہا ہی۔ مطلب یہ ہی کہ اس بزمِ عیش کا رنگ ایسا شکار ہی جو کسی کے قبضہ میں نہیں رہ سکتا۔ عیش سے دنیا کی ناپائیداری کی طرف اشارہ ہی

۱۲

رحمت اگر قبول کرے، کیا بعید ہے
شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے
پُرگل[۱] خیالِ زخم سے دامن نگاہ کا

[۲]
جاں در ہوائے یک نگہِ گرم ہے اسد
پروانہ ہے وکیل ترے داد خواہ کا

۴۶

جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا؟
کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا؟

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا؟

لاگ[۳] ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ
جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا؟

ل پُرگل۔ پھولوں سے بھرا ہوا۔ زخم کو پھول سے مشابہت دی ہے۔ مقتل کو میں خوش خوش شوقِ شہادت میں جا رہا ہوں۔ زخموں کی بہار میری نظروں میں سمائی ہوئی ہے ۱۲

ک ہوا۔ شوق آرزو۔ نگہ گرم: نظرِ محبت۔ مطلب یہ ہے کہ اسد کی جان ایک نگاہ محبت کی آرزو میں ہے گویا وہ تیری ایک نگاہِ گرم میں جان دینے کو تیار ہے اور اپنا مقصد کے لیے تیری بزم میں اس نے پروانے کو اپنا وکیل کر دیا ہے۔ پروانہ بھی شمع کے عشق میں اپنی جان دے دیتا ہے ۱۲۔ ستہ لاگ: دشمنی لگاؤ: محبت ان دونوں لفظوں کا ماخذ ایک اور معنی مختلف ہیں۔ ان دونوں لفظوں کے ایک جگہ جمع ہونے نے شعر کی خوبی کو بڑھا دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ معشوق کو ہمارے ساتھ دوستی ہے نہ دشمنی اگر دشمنی ہوتی جب بھی ایک تعلق تو ہوتا ہم اسی کو دوستی سمجھ لیتے لیکن جب کچھ بھی نہ ہو تو کس بات پر دھوکا کھائیں ۱۲

ہو لیے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ
یا رب اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا؟

موجِ خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے
آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا؟

عمر بھر دیکھا کیا مرنے کی راہ
مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں[1] کیا؟

پوچھتے ہیں وہ کہ "غالب" کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

۴۷

[2] لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

[3] حریفِ جوششِ دریا نہیں خودداریِ ساحل
جہاں ساقی ہو تو باطل ہے دعویٰ ہوشیاری کا

[1] دکھلائیں کا مرجع خدا ٹھہرایا ہے ۱۲
[2] بغیر کثافت کے لطافت جلوہ گر نہیں ہوتی مطلب یہ ہے کہ بے تعلق مادہ جلوۂ مجرد ذات نہیں ہو سکتا دوسرے مصرعہ میں اس بیان کا مثالی ثبوت دیا گیا ہے یعنی بادِ بہاری کے جلوے کے نمودار ہونے کا چمن ہی ذریعہ ہوتا ہے ۱۲
[3] یعنی ساحل لاکھ اپنے تئیں بچائے مگر جب دریا طغیانی پر آتا ہے تو ساحل محفوظ نہیں رہ سکتا اسی طرح جہاں تو ساقی ہو وہاں ہوشیاری کا دعویٰ چل ہی نہیں سکتا ۱۲

(۱۴۸)

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا[۱] — درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

تجھ سے[۲] قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد — تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا

دل ہوا کشمکشِ[۳] چارۂ زحمت میں تمام — مٹ گیا گھسنے میں اس عقدے کا وا ہو جانا

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم۔ اللہ اللہ — اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

ضعف[۴] سے گریہ مبدل بہ دمِ سرد ہوا — باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال — ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

ہے[۵] مجھے ابرِ بہاری کا برس کر کھلنا — روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا

گر نہیں نکہتِ گل کو ترے کوچے کی ہوس — کیوں ہے گردِ رہِ جولانِ صبا ہو جانا

---

۱ درد جب حد سے گزرتا ہے۔ مریض فنا ہو جاتا ہے یعنی مریض کو موت کے آ جانے سے درد کی تکلیف سے نجات ہو جاتی ہے اور وہ جس عالم سے یہاں آتا ہے اُسی طرح سدھار جاتا ہے۔ گویا جزو اپنے کل میں مل جاتا ہے اور یہی انسانی ہستی کا عین مقصد ہے جس طرح قطرہ کا دریا میں مل جانا اس کا مقصد اور اس کے لیے باعثِ مسرت ہے ۱۲۔

۲ قفلِ ابجد۔ وہ قفل ہے کہ حلقوں پر حروف ابجد کندہ ہوتے ہیں اور جس وقت تک ان سب حروف کے ترتیب پانے سے حروف ابجد با ترتیب نہیں ہو جاتے قفل نہیں کھلتا۔ بات بننا = ترتیب پورا اترنا ۱۲۔

۳ زحمتِ دل کے دور کرنے کی اس قدر کوشش کی گئی کہ دل ہی تمام ہو گیا۔ گویا ایک گرہ تھی جو گھس کر اس قدر تنگ ہو گئی کہ اس کا کھلنا ناممکن ہو گیا۔

۴ مسئلہ استحالۂ عناصر جس کو حکمائے جدید مانتے ہیں غالب سے بھی پوشیدہ نہ تھا۔ اس شعر میں اسی مسئلہ کی طرف شاعر نے اشارہ کیا ہے ۱۲

۵ اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ روتے روتے تمام ہو جانا میرے نزدیک ایک معمولی بات ہے جیسے بہار کے بادل کا برس کر کھل جانا۔ بالکل اچھوتی تشبیہ ہے ۱۲

دیکھ برسات میں سبز آئینے کا ہو جانا	تاکہ تجھ پر کھلے اعجازِ ہوائے صیقل[1]

[2] بخشے ہے جلوۂ گل - ذوقِ تماشا غالبؔ
چشم کو چاہیئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

ردیف ب

(۴۹)

پھر ہوا وقت - کہ ہو بال کشا - موجِ شراب[3]
دے بطِ مے کو - دل و دستِ شنا - موجِ شراب

پوچھ مت - وجہ سیہ مستیِ اربابِ چمن[4]
سایۂ تاک میں ہوتی ہے - ہوا موجِ شراب

---

[1] ہوائے صیقل - بعض شارحین ہوا بمعنی خواہش کہتے ہیں - ہماری رائے میں اصلی ہوا سے مراد ہے - مطلب یہ ہے کہ موسم برسات میں آئینۂ فولاد پر بھی زنگ آجاتی ہے وہ گویا سبزہ ہے جس کو ہوائے صیقل نے پیدا کیا ہے ۱۲

[2] یعنی ایسا جلوۂ گل ذوقِ تماشا بخشتا ہے - دوسرے مصرعہ میں ذوقِ تماشا کی تفسیر ہو گئی ہے ۱۲

[3] موجِ شراب - دل کشا ہو یعنی موجِ شراب اپنا اثر دکھلائے یعنی دورِ شراب شروع ہو اور بطِ شراب کی صراحی جو بط کی شکل ہے - دل و دستِ شنا - شناوری کا دل و دست پھر اپنا اثر دکھلاتا ۱۲

[4] اربابِ چمن - باغ کے درخت اور پودے ۱۲

[1] جو ہوا غرقۂ مے - بختِ رسا رکھتا ہے
سر سے گزرے پہ بھی ہے بالِ ہما موجِ شراب

ہے یہ برسات وہ موسم کہ عجب کیا ہے اگر
موجِ ہستی کو - کرے فیضِ ہوا - موجِ شراب

[2] جس قدر روحِ نباتی ہے - جگر تشنۂ ناز
دے ہے تسکیں - بدمِ آبِ بقا - موجِ شراب

[3] بس کہ دوڑے ہے - رگِ تاک میں خوں ہو ہو کر
شہپرِ رنگ سے ہے - بال کشا - موجِ شراب

[4] موجۂ گل سے چراغاں ہے گزرگاہِ خیال
ہے تصور میں زبس جلوہ نما - موجِ شراب

لہ موجِ شراب کا سر سے گزرنا - نشہ کا حد سے گزر جانا ۱۲

ٹہ روحِ نباتی: قوتِ نامیہ - یعنی وہ قوت جس سے نباتات اور حیوانات بڑھتے ہیں جگر تشنہ - شائق - جگر تشنۂ ناز یعنی مشتاقِ ناز - ناز سے یہاں اینڈنا اور تننا مراد ہے مطلب یہ ہے کہ جس قدر قوتِ نمو مشتاقِ ناز ہے اُسی قدر موجِ شراب آبِ حیات بن کر اُس کو سیراب کرتی ہے یعنی شراب سے قوتِ نمو کے حسن اور اُس کے ناز میں ترقی ہوتی ہے ۱۲

سٹہ مولانا طباطبائی نے خون کے لفظ کو بلا اعلان نون باندھنے کو غیر فصیح بتایا ہے - لیکن یہ معلوم کر لینا چاہیے کہ غالب کے وقت تک یہ استعمال غیر فصیح نہ تھا - متروکات کی بحث تو اساتذہ لکھنؤ نے قائم کی ہے اور جہاں تک ہمارا خیال ہے رشک لکھنوی کے زمانے سے نون کو بلا ترکیب فارسی بہ اخفائے نون لکھنا ترک ہوا ہے - لیکن پھر بھی بعض اساتذہ متاخرین لکھنؤ نے اس کا استعمال جائز رکھا مثلاً منشی امیر احمد مینائی ذیل کے شعر میں اس کے بہت قائل تھے ز چھاپر نہ جمار نگ حنا میرے بعد سے موجۂ گل - موجِ شراب کو موجِ گل سے نسبت دی گئی ہے جو موجِ گل کو چراغاں کہنا کیا ہے

نشّے[۱] کے پردے میں ہے محوِ تماشائے دماغ
بس کہ رکھتی ہے سرِ نشو و نما - موجِ شراب

ایک[۲] عالم پہ ہیں طوفانیِ کیفیتِ فصل
موجۂ سبزۂ نوخیز سے تا موجِ شراب

شرحِ[۳] ہنگامۂ ہستی ہے - زہے موسمِ گل
رہبرِ قطرہ بہ دریا ہے - خوشا موجِ شراب

ہوش اڑتے ہیں مرے جلوۂ گل دیکھ اسدؔ
پھر ہوا وقت - کہ ہو بال کشا - موجِ شراب

[۱] "پردہ میں ہے" کا فاعل موجِ شراب ہے - سرِ نشو و نما = دماغ کے نشو و نما کا خیال ۱۲
[۲] طوفانی = جوش و خروش کا اظہار کرنے والی فصل سے موسمِ بارش مراد ہے - مطلب یہ ہے موسمِ برسات کی طوفانی کیفیت - موجِ سبزہ اور موجِ شراب پر یکساں اثر کر رہی ہے ۱۲
[۳] موسمِ گل کیا اچھا ہے کہ ہنگامۂ ہستی کی شرح ہے چونکہ موسمِ گل بھی ہنگامۂ ہستی کی مانند نمو شگفتگی اور چند روزہ ہے اس لیے اس کی شرح کہا گیا، اور "موجِ شراب" کیا ہی اچھی چیز ہے کہ دریا اور قطرہ کے ملانے کی رہبر ہے - چونکہ فنا قطرہ کو دریا سے ملا دیتی ہے - اس لیے شراب کی بیخودی کو جو فنا سے مشابہ ہے قطرہ کو دریا میں لانے کا رہبر کہا گیا ہے ۱۲
[۴] دیکھو محشی دیکھو کر ۱۲ -

ردیف ت

افسوس کہ دنداں کا کیا رزق فلک نے[۱]	۵۰	جن لوگوں کی تھی درخورِ عقدِ گہر انگشت
کافی ہے نشانی تری چھلّے کا نہ دینا		خالی مجھے دکھلا کے بوقتِ سفر انگشت

لکھتا ہوں اسدؔ سوزشِ دل سے سخنِ گرم
تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پہ انگشت

رہا گر کوئی تا قیامت سلامت	۵۱	پھر اک روز مرنا ہے حضرت سلامت
جگر کو مرے عشقِ خوں نابہ مشرب		لکھے ہے خداوندِ نعمت سلامت

[۱] جن لوگوں کی انگلیاں اس قابل تھیں کہ موتیوں کی لڑی بن جائیں یعنی وہ لوگ متمول اور آسودہ حال ہوتے اب وہ اُن کے دانتوں کا رزق بن گئی ہیں۔ یعنی اب وہ دندانِ حسرت سے انگلیاں کاٹ رہے ہیں "انگشتِ حسرت بہ دنداں" فارسی کا ایک محاورہ ہے شاعر نے اسی محاورہ سے یہ خیال کو لیا ہے۔ شاعر کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں اہلِ کمال افلاس کی حالت میں بسر کرتے ہیں۔ ایک شارح نے دیوان کے کسی نسخے میں دیکھ کر دنداں کی جگہ دیوان صحیح سمجھا ہے۔ دیوان دیوہ کی جمع الجمع ہے اور دیوہ کیڑے کو کہتے ہیں اور اس صورت میں شعر کا یہ مطلب ہوا کہ جو انگلیاں موتیوں کی لڑی بننے کے قابل تھیں انہیں کیڑے لپٹے ہوئے کھا رہے ہیں ان کی رائے میں سلکِ گہر کو کیڑوں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ ہماری رائے میں دنداں کو صحیح سمجھ کر جو معنی ہوتے ہیں وہ زیادہ اچھے ہیں ۱۲

علی الرغم[1] دشمن - شہیدِ وفا ہوں
مبارک مبارک - سلامت سلامت

نہیں[2] گر - سر و برگِ ادراکِ معنی
تماشائے نیرنگِ صورت سلامت

منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھ کر نقاب اُس شوخ کے منہ پر کھلا

منہ گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالبؔ ۵۲ یار لائے مرے بالیں پہ اُسے - پر کس وقت

۵۳

آمدِ[3] خط سے ہوا ہے سرد جو بازارِ دوست
دودِ شمعِ کشتہ تھا - شاید خطِ رخسارِ دوست

اے دلِ ناعاقبت اندیش - ضبطِ شوق کر
کون لا سکتا ہے تابِ جلوۂ دیدارِ دوست

خانہ[4] ویراں سازیِ حیرت تماشا کیجیے
صورتِ نقشِ قدم ہوں - رفتۂ رفتارِ دوست

عشق میں - بیدادِ رشکِ غیر نے مارا مجھے
کشتۂ دشمن ہوں آخر - گرچہ تھا بیمارِ دوست

[1] علی الرغم :- برخلاف و برعکس (رغم کے لغوی معنی خاک میں آلودہ ہونے کے ہیں)
اس شعر میں خلاف خواہشِ رقیب شہیدِ وفا ہونے پر مبارکباد دی گئی ہے ۱۲
[2] سر و برگ - سامانِ سفر - مطلب یہ ہے کہ اگر ہم عالمِ معنی کا ادراک نہیں کر سکتے تو
تماشائے صورت ہی سہی ۱۲
[3] خطِ رخسارِ دوست کو دودِ شمعِ کشتہ سے مشابہ کیا گیا ہے ۱۲
[4] خانہ ویراں سازیِ حیرت - خانہ ویرانی جو حیرت کے ہاتھوں ہوتی
رفتۂ رفتارِ دوست - معشوق کی چال کا وارفتہ یعنی شیدا ۱۲

چشمِ ما روشن۔ کہ اُس بے درد کا دِل شاد ہی
دیدۂ پُرخوں ہمارا۔ ساغرِ سرشارِ دوست

غیر یوں کرتا ہی میری پُرسش اُس کے ہجر میں
بے تکلف دوست ہو جیسے کوئی غمخوارِ دوست

تا کہ میں جانوں۔ کہ ہی اُس کی رسائی واں تلک
مجھ کو دیتا ہی پیامِ وعدۂ دیدارِ دوست

جب کہ میں کرتا ہوں اپنا شکوۂ ضعفِ دماغ
سر کرے ہی وہ۔ حدیثِ زلفِ عنبر بارِ دوست

چُپکے چُپکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہی اگر
ہنس کے کرتا ہی بیانِ شوخیِ گفتارِ دوست

مہربانی ہائے دشمن کی شکایت کیجیے
یا بیاں کیجے سپاسِ لذتِ آزارِ دوست

یہ غزل اپنی مجھے جی سے پسند آئی ہی آپ
ہی ردیفِ شعر میں **غالب** ز بس تکرارِ دوست

ردیف ج

گلشن[1] میں بندوبست بہ رنگِ دگر ہی آج	۵۳	قمری کا طوق۔ حلقۂ بیرونِ در ہی آج
آتا[2] ہی ایک پارۂ دل۔ ہر فغاں کے ساتھ		تارِ نفس۔ کمندِ شکارِ اثر ہی آج
اے عافیت کنارہ کر۔ اے انتظام چل		سیلابِ گریہ درپئے دیوار و در ہی آج
لو ہم مریضِ عشق کے بیمار دار ہیں	۵۴	اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج[3]؟

ردیف چ

نفس[4] نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ	۵۵	اگر شراب نہیں۔ انتظارِ ساغر کھینچ

[1] حلقۂ بیرونِ در: مجازاً وہ شخص ہی جسے اندر آنے کی اجازت نہ ہو۔ مطلب یہ ہی کہ باغ میں آج ایسی روک ٹوک ہی کہ قمری تک کا گزر نہیں ۱۲

[2] آج ہر تارِ نفس اثر کے شکار کرنے کو ایک کمند بنا ہوا ہی یعنی بد نصیبی سے اُلٹا اثر ہو رہا ہی کہ ہر آہ کے ساتھ ایک پارۂ دل باہر آتا ہی ۱۲

[3] کیا علاج: کیا مزا ۱۲

[4] نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ: ترک آرزو نہ کر ۱۲۔

کمالِ گرمیِ سعیِ تلاشِ دید نہ پوچھ
برنگِ خار مرے آئنے سے جوہر کھینچ

تجھے بہانۂ راحت ہے انتظار اے دل
کیا ہے کس نے اشارہ کہ نازِ بستر کھینچ

تری طرف ہے بحسرت نظارۂ نرگس
بکوریِ دل و چشمِ رقیب ساغر کھینچ

بہ نیم غمزہ ادا کر حقِ ودیعتِ ناز
نیامِ پردۂ زخمِ جگر سے خنجر کھینچ

لہ تلاش بروزن خراش، یعنی سعی و جستجو۔ لفظ ترکی ہے اس کا استعمال تلاش کرنے والے کے معنوں میں مثلاً تلاشی جیسا بولتے ہیں غلط ہے تلاشی صحیح ہے۔ ایک شارح نے اس شعر کے مصرع اول میں چار مضاف الیہ لفظوں کے جمع ہونے کو عیب بتایا ہے لیکن یہ کوئی عیب نہیں ہے شاعرین فارسی کے کلام میں جن کا شمار فصحا میں ہے بکثرت پائی جاتی ہیں۔ غالب بھی چونکہ فارسی کا دلدادہ تھا اس لیے اس نے شعر میں طولانی اضافت کا التزام قبول کیا۔ غالب کے اشعار کی مشکل پسندی پیچیدہ اشعار میں جن کا مطلب سمجھنے میں اہلِ فن مختلف الرائے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ اے مخاطب میری سرگرمی تلاش دید یعنی کمال اور فن کے قدر دانوں کی تلاش کی کوشش کا تو ذکر کر کیونکہ وہ تو ملتے ہی نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ تو میرے آئینہ دل سے کانٹے کی طرح سے جوہر نکال لے یعنی ایسی تدبیر کر کہ میرا کمال ہی مجھ سے سلب ہو جائے۔ شاعر زمانے کی شکایت کرتا ہے اور یہ دکھاتا ہے کہ اس زمانہ میں اہلِ کمال کی قدر نہیں بلکہ نااہل پوچھے جاتے ہیں اس لیے حسرت کے ساتھ وہ اپنے کمال کے سلب ہو جانے کی تمنا کرتا ہے ۱۲

عہ نازِ بستر کھینچنا یعنی بستر پر پڑے پڑے نیند کا انتظار کرنا۔ شاعر اپنے دل سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ تو جو معشوق کے انتظار کے حیلہ سے بستر پر پڑا ہوا ہے تیری آرام طلبی ہے ورنہ معشوق کی طرف سے اشارہ بھی نہیں ہوا ہے ۱۲

سہ چونکہ نرگس معشوق کی طرف حسرت کے ساتھ نظارہ کناں ہے۔ اس لیے شاعر نے اس کو اپنا رقیب کہا ہے اور عاشق کو اپنے معشوق کی طرف رقیب کا گھورنا گوارا نہیں ہو سکتا پس شاعر اس کے اندھے ہو جانے کی خواہش کا اظہار اپنے معشوق پر نہایت لطیف پیرایہ میں کرتا ہے اور معشوق سے کہتا ہے کہ تو شراب رقیب کے دل و چشم کی کوری پر پی یعنی اس کے اندھے پن کی خواہش کی یاد میں سلونی دستور ہے کہ شراب کسی کی یاد پر پیتے ہیں چنانچہ جامِ صحت وغیرہ کی رسم مغربی تہذیب میں جاری ہے ۱۲

سکہ نیام تلوار کا غلاف یعنی میان۔ نیام سے خنجر کھینچنے یعنی الف نکال ڈالنے سے نیم رہتا ہے یہ لفظی صنعت ہے ایک شارح صاحب معترض ہیں کہ اس خنجر سے معنی کا خون ہو گیا یا اس لفظی صنعت نے ان کی رائے میں شعر کو بے معنی کر دیا حالانکہ شعر کا مطلب صاف ہے شاعر کہتا ہے کہ زخم سے خنجر باہر کھینچا جائیگا تو تکلیف زیادہ ہوگی اور عاشق کو یہ تکلیف ہی عزیز ہے اس کو اس تکلیف سے لطف زیادہ آئیگا جیسا کہ نیم غمزہ سے آتا ہے اور اس طرح ناز کی امانت پوری ادا ہو جائیگی ۱۲ نیم و نیام کی صنعت بجائے خود قائم ہے اور شعر کا مطلب بھی موجود ہے ۱۲

بروئے سفرہ کباب دل سمندر کھینچ		مرے قدح میں ہے صہبائے آتش پنہاں[۱]

ردیف د

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہل جفا میرے بعد

منصب شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا
ہوئی معزولی انداز و ادا میرے بعد

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

(۱) میرے جام دل میں آتش پنہاں یعنی عشق کی شراب سرخ بھری ہوئی ہے۔ شراب سرخ ہوتی ہے اور آگ کا رنگ بھی سرخ ہوتا ہے شراب کی گرمی اور آگ کی گرمی سے بھی مناسبت ہے بس ضرورت ہے کہ دسترخوان پر سمندر کے دل کے کباب بھی چنے جائیں۔ سمندر کے دل کے کباب اس لیے کہا گیا کہ دل چھپا ہوا ہوتا ہے۔ چونکہ شراب بھی چھپی ہوئی آگ کے مانند ہے اس لیے اس کے میل کے لیے سمندر (ایک جانور ہوتا ہے جو آتشکدہ میں رہتا ہے اور جب آگ سے باہر آتا ہے مر جاتا ہے) کے دل کے کباب شاعر نے طلب کیے ہیں۔ کھینچ فارسی محاورہ کا ترجمہ ہے اردو میں دسترخوان پر کھانے کے لیے کھینچنا نہیں بولتے ہیں۔ اس شعر میں صرف الفاظ کی خوبی رکھی گئی ہے ۱۲-

خوں ہے دل خاک میں[۱] احوالِ بتاں پر یعنی
اُن کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد

[۲] درخورِ عرض نہیں جوہرِ بیداد کو جا
نگہِ ناز ہے سرمے سے خفا میرے بعد

[۳] ہے جنوں اہلِ جنوں کے لیے آغوشِ وداع
چاک ہوتا ہے گریباں سے جدا میرے بعد

[۴] کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق؟
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی
کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد[۵]

---

۱ خاک میں یعنی قبر میں۔ مطلب یہ ہے کہ قبر میں پڑا پڑا دل میرا احوالِ بتاں پر افسوس کرتا ہے کہ انھوں نے میرے سوگ میں مہندی لگانا چھوڑ دی ہے ۱۲

۲ درخورِ عرض نہ اظہار کے قابل۔ شاعر کہتا ہے کہ جوہرِ بیداد کے اظہار کے لیے اب کوئی مناسب جگہ باقی نہیں رہی اس لیے معشوق کی نگاہِ ناز سرمے سے خفا ہے یعنی اُس نے میرے بعد سرمہ لگانا چھوڑ دیا کیوں کہ میں تو ہوں ہی نہیں اب سرمہ لگا کر نشانۂ بیداد کس کو بنایا جائے

۳ آغوشِ وداع ہے یعنی رخصت ہو رہا ہے شاعر کہتا ہے کہ میرے بعد جنون اہلِ جنوں سے رخصت ہو رہا ہے اور چاک گریباں سے جدا ہوتا ہے مطلب یہ ہے کہ میں نے جنون اور چاک گریباں کا قصہ ہی تمام کر دیا۔۱۲

۴ اس شعر میں لفظ مکرر نے عجیب خوبی پیدا کر دی ہے اولاً مصرعِ اول کو سوالیہ لہجے میں پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ معشوق کہتا ہے "کوئی ہے جو مئے مرد افگنِ عشق کا حریف ہو؟" یعنی کوئی ہے جو غالب کی برابری کرے جب کوئی اس آواز پر سامنے نہیں آتا تو وہ پھر مایوسانہ لہجے میں کہتا ہے "کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق" یعنی کوئی نہیں ہوتا

۵ شاعر کہتا ہے کہ مرنے سے پہلے مجھ کو اس بات کا غم ہے کہ میرے بعد کوئی مہر و وفا کی ہمدردی کرنے والا بھی نہ ملے گا ۱۲

آئے ہے بیکسیِ عشق پہ رونا غالبؔ
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد[۱]

ردیف ر

٥٩

بلا سے ہیں جو یہ پیشِ نظر در و دیوار
نگاہِ شوق کو ہیں بال و پر در و دیوار

وفورِ اشک نے کاشانے کا کیا یہ رنگ
کہ ہو گئے مرے دیوار و در، در و دیوار[۲]

نہیں ہے سایہ۔ کہ سُن کر نوید مقدمِ یار
گئے ہیں چند قدم پیشتر در و دیوار[۳]

ہوئی ہے کس قدر ارزانیِ مَے جلوہ
کہ مست ہے ترے کوچے میں ہر در و دیوار

جو ہے تجھے سرِ سودائے انتظار تو آ
کہ ہیں۔ دُکانِ متاعِ نظر۔ در و دیوار

ہجومِ گریہ کا سامان کب کیا میں نے؟
کہ گر پڑے نہ مرے پاؤں پہ در و دیوار

سلہ مصرعِ ثانی میں سیلابِ بلا سے عشق مراد ہے شاعر کہتا ہے کہ اس کے مرنے کے بعد عشق کا قدر شناس کوئی دنیا میں باقی نہ رہیگا۔ کیونکہ وہ سیلابِ بلا ہے اور اس لیے سوا غالب کے ایسا کون جواں مرد ہے جو اس بلا کو اپنے گھر مہمان بنانا پسند کرے ۱۲

سلہ دیوار و در۔ در و دیوار ہو گئے لفظوں کا یہ اُلٹ پھیر نہایت بامزہ ہے مطلب یہ ہے کہ دیوار مسمار ہو کر دروازہ کا کام دینے لگی یعنی جہاں پر دیوار کھڑی نظر آتی تھی وہاں راستہ چلنے لگا اور دروازہ کے منہدم ہونے سے اُس کی مٹی کا انبار بطور دیوار کے ہو گیا ۔۱۲

سلہ ۔سایہ ۔ در و دیوار کا سایہ ہے۔ ہر چیز کا سایہ اُس سے آگے بڑھتا ہے شاعر کہتا ہے کہ میرے در و دیوار کا سایہ جو اُس سے آگے بڑھ کر پڑتا ہے گویا یہ در و دیوار ہیں جو یار کے استقبال کے لیے چند قدم آگے کو بڑھ گئے ہیں ۱۲

غالبؔ نہ کر حضور میں تو بار بار عرض
ظاہر ہے تیرا حال سب اُن پر کہے بغیر

۵۹

کیوں جل گیا نہ تابِ رخِ یار دیکھ کر
جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

آتش پرست کہتے ہیں اہلِ جہاں مجھے
سرگرمِ نالہ ہائے شرر بار دیکھ کر

کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا
رکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر

آتا ہے[1] میرے قتل کو پر جوشِ رشک سے
مرتا ہوں اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر

ثابت[2] ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق
لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر

وا حسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ
ہم کو حریصِ لذتِ آزار دیکھ کر

بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ
لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر

زنّار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال
رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُرخار دیکھ کر

کیا[3] بدگماں ہے مجھ سے کہ آئینے میں مرے
طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھ کر

---

[1] جوشِ رشک سے مرتا ہوں یعنی تلوار کی اس خوش قسمتی پر کہ وہ معشوق کے ہاتھ میں ہے رشک کرتا ہوں ۱۲

[2] جب تو شراب پی کر چلتا ہے تو تیری رفتارِ مستانہ کو دیکھ کر موجِ مے کو لرزہ آجاتا ہے اس بات سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ خونِ خلق کا باعث یہی شیشۂ شراب ہے کہ تو شراب پیتا ہے تیری رفتارِ مستانہ سے خلق کا خون [illegible]

[3] اپنے معشوق کی انتہائی بدگمانی کو بیان کرتا ہے مطلب اس شعر کا یہ ہے کہ میرے آئینۂ دل پر زنگار یعنی حسرت و مایوسی کو دیکھ کر وہ طوطی کا عکس جانتا ہے یعنی کسی دوسرے معشوق کی محبت کو اس مایوسی کا باعث سمجھتا ہے حالانکہ یہ یاس و افسردگی خود اس کی لاپروائی اور بے مہری کی پیدا کی ہوئی ہے ۱۲

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی۔ نہ طور پر[1]	دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

سر پھوڑنا وہ غالبؔ شوریدہ حال کا
یاد آگیا مجھے۔ تری دیوار دیکھ کر

لرزتا ہو مرا دل۔ زحمتِ مہرِ درخشاں پر
میں ہوں وہ قطرۂ شبنم۔ کہ ہو خارِ بیاباں پر
نہ چھوڑی حضرتِ یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی
سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہو زنداں پر
فنا تعلیم درسِ بیخودی ہوں اُس زمانہ سے
کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر
فراغت کس قدر رہتی مجھے تشویش مرہم سے
بہم گر صلح کرتے پارہ ہائے دلِ نمکداں پر

[1] اس شعر میں اُس آیت کی طرف اشارہ ہو جس میں خدا تعالیٰ نے فرمایا ہو "ہم نے امانت کو زمین آسمان اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا مگر وہ اس کے متحمل نہ ہوئے اور ڈر گئے اور انسان نے اُس کو اُٹھا لیا" مطلب یہ ہو کہ برق تجلی کے ہم مستحق تھے نہ کہ طور کیونکہ کوہِ طور تجلی کی تاب نہ لاسکا اس لیے جو کچھ اُس کو دیا گیا وہ اُس کے ظرف سے زیادہ تھا ۱۲

نہیں[1] اقلیمِ الفت میں کوئی طومارِ ناز ایسا
کہ پشتِ چشم سے جس کی نہ ہووے مُہر عنواں پر

مجھے اب دیکھ کر ابرِ شفق آلودہ یاد آیا
کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گُلستاں پر

بجز پروازِ شوقِ ناز کیا باقی رہا ہوگا؟
قیامت اک ہوائے تُند ہے خاکِ شہیداں پر

نہ لڑ ناصح سے غالب کیا ہوا گر اُس نے شدّت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

— ٦١ —

ہے بس کہ ہر اِک اُن کے اشارے میں نشاں اور
کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گُماں اور
یا رب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل اُن کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

[1] طومار = دفتر۔ پشتِ چشم سے مہر ہونا کنکھیوں سے دیکھنا اغماض و تغافل سے مراد ہے۔ شاعر کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح دفتر کے لوازمات میں مُہر کا ہونا ضروری سمجھا جاتا ہے اسی طرح محبت کی دنیا میں ناز و تغافل لازم و ملزوم ہیں ۱۲

ابرو سے ہی کیا اُس نگہِ ناز کو پیوند
ہی تیر مقرر۔ مگر اُس کی ہی کماں اور

تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم؟ جب اُٹھینگے
لے آئینگے بازار سے۔ جا کر۔ دل و جاں اور

ہرچند سُبک[1] دست ہوئے بُت شکنی میں
ہم ہیں۔ تو ابھی راہ میں ہی سنگِ گراں اور

ہی خونِ جگر جوش میں دل کھول کے روتا
ہوتے جو کئی دیدۂ خوں نابہ فشاں اور

مرتا ہوں اس آواز پہ۔ ہرچند سر اُڑ جائے
جلّاد کو۔ لیکن وہ کہے جائیں کہ "ہاں اور"

لوگوں کو ہی خورشیدِ جہاں تاب کا دھوکا
ہر روز دکھاتا ہوں میں اِک داغِ نہاں اور

---

[1] سُبک دست: مشّاق "ہم ہیں" یہ سمجھنا کہ ہم ہیں "خدا رسی کی راہ میں ایک چٹان کے مثل حائل ہی۔ شاعر کا مطلب یہ ہی کہ باوجود بُت شکنی میں مہارت حاصل کر لینے کے منزلِ عرفاں تک پہونچنے کے لیے خودی کو مٹا دینے کی ضرورت ہی۔ اس شعر میں سارا زور "ہم ہیں" پر دے کر پڑھنے سے خود بخود مطلب سمجھ میں آجاتا ہی ۱۲

لیناۂ اگر دل تمہیں دیتا۔ کوئی دم چین
کرتا۔ جو نہ مرتا۔ کوئی دن آہ و فغاں اور

پاتے نہیں جب راہ۔ تو چڑھ جاتے ہیں نالے[۲]
رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے انداز بیاں اور

۶۲

صفائے حیرتِ آئینہ ہے۔ سامانِ زنگ آخر
تغیر آب[۳] برجا ماندہ کا۔ پاتا ہے رنگ آخر

[۱] اس شعر میں تعقید لفظی واقع ہوئی ہے اور اسی نے شعر کو پُر لطف بنا دیا ہے۔ مرزا اپنے خط میں اس کے متعلق لکھتے ہیں "یہ بہت لطیف تقریر ہے لینا کو ربط ہے چین سے کرتا۔ مربوط ہے آہ و فغاں سے عربی میں تعقید معنوی اور لفظی دونوں معیوب ہیں۔ فارسی میں تعقید معنوی عیب اور تعقید لفظی جائز بلکہ فصیح اور بلیغ۔ ریختہ تقلید ہے فارسی کی حاصل معنی مصرعین یہ ہے کہ اگر دل تمہیں نہ دیتا تو کوئی دم چین لیتا۔ اگر نہ مرتا تو کوئی دن اور آہ و فغاں کرتا"

[۲] اس شعر میں نالوں سے مراد نغمی نالوں سے ہے آہ و نالہ مراد نہیں ہے شاعر کہتا ہے کہ مصیبت اور رنج کے سبب اس کی طبیعت جس قدر رکتی ہے یعنی متاثر ہوتی ہے اسی قدر زیادہ رواں ہوتی ہے یعنی زیادہ حسب حال مضمون سوجھتے ہیں اور یہ امر واقعہ ہے۔

[۳] آب برجا ماندہ:۔ ایک جگہ ٹھہرا ہوا پانی مطلب یہ ہے کہ جس طرح ایک جگہ ٹھہرے ہوئے پانی کا تغیر ایک رنگ پیدا کرتا ہے یعنی اس پہ کائی جم جاتی ہے اسی طرح آئینہ کی صفائی پر حیرت سے زنگ ہو جاتا ہے ۱۲۔

نہ کی سامانِ عیش و جاہ نے تدبیر وحشت کی[1]
ہوا جامِ زمرّد بھی۔ مجھے داغِ پلنگ آخر

جنوں کی دست گیری کس سے ہو؟ گر ہو نہ عریانی
گریباں چاک کا حق ہوگیا ہی میری گردن پر[2]

برنگِ[3] کاغذِ آتش زدہ نیرنگِ بیتابی
ہزار آئینہ دِل باندھے ہی۔ بالِ یک تپیدن پر

فلک[4] سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہی؟
متاعِ بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں۔ قرض رہزن پر

---

[1] تدبیر بمعنی علاج۔ شاعر کہتا ہی کہ سامانِ عیش و جاہ کے بہم ہونے سے میری وحشت کا علاج نہ ہوا بلکہ وحشت اور ترقی کر گئی اور جامِ زمرد جو منجملہ سامانِ عیش کے تھا داغِ پلنگ بن گیا یعنی سیاہ ہوگیا۔ مرزا نے جامِ زمرد اور داغِ پلنگ کا ذکر قصیدہ اول کے شعر نمبر ۳ میں بھی کیا ہی مگر وہاں بہار کی تاثیر سے داغِ پلنگ کا جامِ زمرد بن جانا بتایا ہی اور یہاں اپنے وحشت کے اثر سے جامِ زمرد کا داغِ پلنگ ہوجانا بیان کیا ہی ۱۲

[2] مصرعہ ثانی میں گریباں سے خطاب کیا گیا ہی۔ گریباں منادیٰ ہی۔ حرفِ ندا مخفی۔ مطلب ہی کہ اے گریباں چاک کا میری گردن پر حق ہوگیا ہی کہ اس نے مجھے عریاں کردیا ورنہ جنوں کی دستگیری بغیر عریانی کے نہیں ہوسکتی ۱۲ [3] مصرعہ اول کے آخر میں "ہی" محذوف ہی۔ نیرنگ شعبدہ۔ بال۔ باندھنا اس شعر کی تعریف ہوئی نیرنگِ بیتابی مثل کاغذِ آتش زدہ ہی کہ دل نے ایک ایک بالِ تپیدن پر ہزار ہزار آئینے باندھے ہیں شاعر نے اس شعر میں آئینہ متحرک کو اس شعلہ سے تشبیہ دی ہی جو کاغذِ آتش زدہ سے بلند ہو ۱۲ [4] متاعِ بردہ یعنی لٹی ہوئی پونجی تو بیسا قریب اسی مضمون کو نظیری نے فارسی میں اس طرح ادا کیا ہی ع نشاطِ رفتہ زدور زماں طلب دارم۔ کہ مدعا یہ ہی زمانہ سے تقاضا ہی نیز تیقن ہی کہ زمانہ نے جو ہمارا گزرا ہوا عیش لیا ہی وہ استقلال کے ساتھ تقاضا کرنے سے کبھی نہ کبھی ہمیں واپس مل جائیگا کیونکہ معاملہ بہ

ہم[1]-اور وہ بے سبب رنج آشنا دشمن- کہ رکھتا ہے
شعاعِ مہر سے تہمت نگہ کی چشم روزن پر

فنا کو سونپ گر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا
فروغِ طالعِ خاشاک ہے موقوف گلخن پر

اسدؔ[2]- بسمل ہے کس انداز کا! قاتل سے کہتا ہے
کہ مشقِ ناز کر- خونِ دو عالم میری گردن پر

ستم[3] کش مصلحت سے ہوں- کہ خوباں تجھ پہ عاشق ہیں
تکلف برطرف- مل جائے گا- تجھ سا رقیب آخر

شخص تقاضوں سے نارض نہیں ہوتا- غالب نے ایک دوسری بات پیدا کی ہے وہ فلک کو رہزن کہتا ہے اور بتاتا ہے کہ رہزن کسی کا مال لیکر واپس نہیں دیتا ہے اس سے تقاضا کرنا فضول ہے درحقیقت غالب نے نظیری کے خیال کو غلط ثابت کیا ہے ۱۲

[1] بے سبب رنج :- بلاوجہ رنجیدہ ہونے والا- آشنا دشمن :- معشوق- شاعر کہتا ہے کہ ہم کو بے سبب رنجیدہ ہونے والے دشمن سے کام پڑا ہے جو شعاعِ مہر کو تار نظر سمجھکر چشم روزن پر نگاہ کی تہمت کا الزام رکھتا ہے- بعض دیوانوں میں "رنج آزما" چھپ گیا ہے وہ غلط ہے ۱۲

[2] اس شعر میں لفظ "کس" استفہامیہ نہیں ہے بلکہ اظہار تعجب کے لیے استعمال ہوا ہے ۱۲

[3] تجھ سا رقیب :- تیری مثل وہ حسین جو تجھ پر عاشق ہو ۱۲

ردیف (ز)

[1] فارغ مجھے نہ جان کہ مانندِ صبح مہر	۶۶	ہے داغِ عشق زینتِ جیبِ کفن ہنوز
ہے نازِ مفلساں زرِ از دست رفتہ پر		ہوں گل فروشِ شوخیٔ داغِ کہن ہنوز
[2] مے خانۂ جگر میں یہاں خاک بھی نہیں		خمیازہ کھینچے ہے بتِ بیدادفن ہنوز
[3] حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز	۶۷	دعا قبول ہو یارب کہ عمرِ خضر دراز
[4] نہ ہو بہ ہرزہ بیاباں نوردِ وہمِ وجود		ہنوز تیرے تصور میں ہے نشیب و فراز

[1] اس شعر میں جیبِ کفن کو صبح سے اور داغِ عشق کو آفتاب سے تشبیہ دی گئی ہے مطلب یہ ہے کہ میں مرنے پر بھی عشق سے خالی نہیں ہوں ۱۲

[2] اس شعر میں شاعر نے خون کو شراب سے تشبیہ دی ہے اور معشوق کی نسبت کہا ہے کہ وہ میرے خونِ جگر کو شراب سمجھ کر پیتا ہے شاعر نے اپنے شعر میں معشوقِ ستم پیشہ کی خونخواری کا اس طرح نقشہ کھینچا ہے کہ باوجودیکہ میرے جگر میں خون کا ایک قطرہ تک باقی نہیں ہے لیکن وہ اس کی تمنا میں ابتک انگڑائیاں لے رہا ہے ۱۲

[3] فسونِ نیاز = دعائے نیاز اس شعر میں شاعر نے کمال حسرت کا اظہار کیا ہے وہ کہتا ہے کہ کسی مشکل مقصد کے حل ہونے کی دعا تو قبول نہیں ہوتی۔ اس لیے اب ایسی چیز طلب کریں گے جو پہلے ہی سے دی جا چکی ہو مثلاً عمرِ خضر کی درازی ۱۲

[4] اس شعر میں شاعر نے وحدت الوجود کے مسئلہ کی طرف اشارہ کیا ہے وہ کہتا ہے کہ تو بیہودگی سے وہمِ وجود کے بیابان میں بھٹکتا نہ پھر مطلب یہ ہے کہ تو وحدت الوجود کا عقیدہ اختیار کر ہنوز تیرے تصور میں نشیب و فراز ہیں یعنی ابتک تیرا تصور ناتمام اور ناقص ہے ۱۲

وصالِ[1] جلوہ تماشا ہے پر دماغ کہاں — کہ دیجیے آئینۂ انتظار کو پرداز

ہر ایک ذرۂ عاشق ہے آفتاب پرست — گئی نہ خاک ہوئے پر ہوائے جلوۂ ناز

نہ پوچھ[2] وسعتِ مے خانۂ جنوں غالب

جہاں یہ کاسۂ گردوں ہے ایک خاک انداز

٦٨

وسعتِ[3] سعیِ کرم دیکھ کہ سر تا سرِ خاک — گزرے ہے آبلہ پا ابرِ گہربار ہنوز

یک[4] قلم کاغذِ آتش زدہ ہے صفحۂ دشت — نقشِ پا میں ہے تپِ گرمیِ رفتار ہنوز

٦٩

کیوں[5] کر اس بت سے رکھوں جان عزیز — کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز؟

---

[1] وصال جلوہ تماشا: فارسی ترکیب ہے یعنی وصالِ یار جلوۂ حسن کا تماشا دکھانے والا ہے۔ پرواز یعنی صیقل۔ شاعر کہتا ہے کہ انتظار کے بعد جلوۂ حسنِ یار کا تماشا ممکن ہے لیکن انتظار کی طاقت کسے ہے ۱۲

[2] مے خانۂ جنوں: صحرائے جنوں۔ کاسۂ گردوں: آسمان۔ خاک انداز: وہ ظرف جس میں بھر کر کوڑا کرکٹ پھینکا جائے ۱۲

[3] شاعر نے اس شعر میں کریموں کی شان دکھائی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کریموں کو بخشش کرنے سے تنگ نہ آنا چاہیے بلکہ ابرِ گہربار کی مثال سے سبق لینا چاہیے کہ وہ باوجود آبلہ پائی کے مینہ برسانے میں سرگرم رہتا ہے۔ قطراتِ باراں کی بنا پر ابر کو آبلہ پا کہا ہے ۱۲

[4] کاغذ اور صفحہ کی مناسبت سے یک قلم کا لفظ بکسر کے معنی میں اس شعر میں استعمال کیا گیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ میں ایسا گرم رفتار ہوں کہ میرے نقشِ قدم میں اب تک وہ گرمی باقی ہے جس سے میدانِ دشت کاغذِ آتش زدہ بنا ہوا ہے

[5] مطلب یہ ہے کہ مذہبِ عشق میں محبوب سے جان عزیز رکھنا یعنی اس پر جان قربان نہ کرنا کفر ہے ۱۲

دل[۱] سے نکلا۔ پہ نہ نکلا۔ دل سے | ہی ترے تیر کا۔ پیکان عزیز

تاب لائے ہی بنے گی غالب
واقعہ سخت ہی اور جان عزیز

نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز | میں ہوں اپنی شکست کی آواز
تو۔ اور آرائشِ خمِ کاکل | میں اور اندیشہ ہائے دور دراز
لاف[۲] تمکیں فریب سادہ دلی | ہم ہیں۔ اور رازہائے سینہ گداز
ہوں گرفتارِ الفتِ صیاد | ورنہ باقی ہی طاقتِ پرواز
وہ[۳] بھی دن ہو کہ اُس ستمگر سے | ناز کھینچوں بجائے حسرتِ ناز
نہیں[۴] دل میں مرے وہ قطرۂ خوں | جس سے مژگاں ہوئی نہ ہو گلباز
اے[۵] ترا جلوہ۔ یک قلم۔ انگیز | اے ترا ظلم سر بسر انداز

۱ نہ نکلا دل سے: فراموش نہ ہوا ۱۲
۲ مطلب یہ ہی کہ عشق میں ہماری یہ شیخی کہ ہم بہت بڑے ثابت قدم ہیں ہماری سادہ دلی کے سبب سے ہی۔ کیونکہ ہمارے دل میں تو ایسے سینہ گداز راز بھرے ہوئے ہیں جن کے ہوتے ہوئے تمکین یعنی ثابت قدمی اور وقار کا باقی رہنا مشکل ہی ۱۲
۳ اس شعر میں لفظ "سے" بمعنی "کے لیے" آیا ہی ۱۲
۴ یعنی سارا خون پلکوں سے ٹپک گیا۔
۵ مصرعہ اولیٰ میں "اے" کے بعد "نازنین" اور مصرعہ ثانی میں "اے" کا منادیٰ "ظالم" محذوف ہی ۱۲۔

تو ہوا جلوہ گر مبارک ہو	ریزشِ سجدۂ جبینِ نیاز
مجھ کو پوچھا۔ تو کچھ غضب نہ ہوا^۱	ہیں غریب اور تو غریب نواز

اسد اللہ خاں۔ تمام ہوا
اے دریغا وہ رندِ شاہد باز

ردیف س

مژدہ اے ذوقِ اسیری۔ کہ نظر آتا ہے	۱۷	دامِ خالی قفسِ مرغِ گرفتار کے پاس
جگرِ تشنۂ آزار۔ تسلّی نہ ہوا^۲		جوئے خوں ہم نے بہائی بنِ ہر خار کے پاس
مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے		خوب وقت آئے تم اس عاشقِ بیمار کے پاس
ہیں بھی رُک رُک کے نہ مرتا جو زباں کے بدلے		دشنہ اِک تیز سا ہوتا مرے غمخوار کے پاس

۱؎ اس شعر کے مصرعۂ اولیٰ میں "کچھ غضب نہ ہوا" کے ٹکڑے نے عجب لطف پیدا کر دیا ہے نہایت کثیر المعنی ہے۔ اس جملہ کی جگہ اگر کوئی دوسرا ٹکڑا یہاں ختم کر دیا جائے مثلاً "مہربانی کی" تو وہ بات پیدا نہیں ہوتی ۱۲۔

۲؎ تشنۂ آزار۔ خواہش مند آزار۔ شاعر نے "تسلّی نہ ہوا" بمعنی متسلّی نہ ہوا یعنی تسلّی پانے والا نہ ہوا باندھا ہے۔ مولانا طباطبائی نے تسلّی نہ ہوا کو خلاف محاورہ بتایا ہے۔ لیکن یہ اعتراض غلط ہے کیونکہ اس کے متعلق میر تقی جیسے مسلم الثبوت استاد کی سند موجود ہے ۱۲

نہ تسلّی ہوا دلِ بیتاب   نہ تھما چشمِ تر سے خونِ ناب

دہنِ شیر میں جا بیٹھیے لیکن اے دل
نہ کھڑے ہوجیے خوبانِ دل آزار کے پاس

دیکھ کر تجھ کو چمن بسکہ نمو کرتا ہے
خود بخود پہنچے ہے گل گوشۂ دستار کے پاس

مر گیا پھوڑ کے سر غالبِ وحشی ہے ہے
بیٹھنا اُس کا وہ آ کر تری دیوار کے پاس

ردیف ش

۶۲

۱ نہ لیوے گر خسِ جوہر طراوت سبزۂ خط سے
لگا وے خانۂ آئینہ میں روئے نگار آتش

۲ فروغِ حسن سے ہوتی ہے حلِ مشکلِ عاشق
نہ نکلے شمع کے پا سے نکالے گر نہ خار آتش

۱ اس شعر میں جوہر آئینہ کو شاعر نے خسِ جوہر کہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جوہر آئینہ کو معشوق کے سبزہ خط سے طراوت پہنچ جاتی ہے ورنہ اس کے آتشیں رُخ کے عکس سے خانۂ آئینہ میں آگ لگ جائے ۱۲

۲ موم بتی میں جو ڈورا ہوتا ہے اسے خارِ شمع کہا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب موم بتی روشن ہوتی ہے تو ڈورا جل کر پائے شمع سے نکل جاتا ہے یعنی آتش سے شمع کی مشکل حل ہوتی ہے۔ اس شعر میں حل مشکل کو مونث باندھنے پر مولانا طباطبائی نے اعتراض کیا ہے جو بالکل غلط ہے۔ قواعد کے لحاظ سے حل (مضاف) مذکر اور مشکل (مضاف الیہ) مونث ہے۔ مرزا نے مضاف الیہ پر زور دینے کی غرض سے فعل کو مونث لکھا ہے اور یہ استعمال صرف میرزا کے یہاں مخصوص نہیں بلکہ اور شعرا نے بھی کیا ہے مثلاً نواب الٰہی بخش خاں معروف جو شاہ نصیر کے شاگرد

ردیف ع

١ جادۂ رہ خور کو وقتِ شام ہے تارِ شعاع	۷۳	چرخ وا کرتا ہے ماہِ نو سے آغوشِ وداع

٢ رخِ نگار سے ہے سوزِ جاودانیِ شمع	۷۴	ہوئی ہے آتشِ گل آبِ زندگانیِ شمع
زبانِ اہلِ زباں میں ہے مرگ خاموشی		یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانیِ شمع
کرے ہے صرف بہ ایمائے شعلہ قصہ تمام		بطرزِ اہلِ فنا ہے فسانہ خوانیِ شمع
غم اس کو حسرتِ پروانہ کا ہے اے شعلہ		ترے لرزنے سے ظاہر ہے ناتوانیِ شمع

اور ذوق کے ہمعصر تھے لکھتے ہیں ؎ "خرقِ عادت اپنے دیوانے کی دیکھیے: جس طرف کو وہ چلے پتھر چلے" ممکن ہے کہ خرقِ عادت کی نسبت یہ کہا جائے کہ یہ مرکب لفظ ہے تو حلِ مشکل کے لیے یہی کہا جا سکتا ہے اور ایسی حالت میں بالکل مشکل حل ہو جاتی ہے یعنی معترض کا اعتراض غائب ہو جاتا ہے"

١ یہ صرف ایک شعر ہے پوری غزل نہیں ہے غزل سے اس کا تعلق بھی نہیں ہے۔ شاید کسی قصیدہ کا مطلع ہے "تارِ شعاع" شاعر نے اس خط کو کہا ہے جو غروب کے بعد (اور طلوع سے کچھ قبل) ایک خط ابیض آسمان پر دکھائی دیتا ہے (اہلِ رصد کی زبان میں اس کو قرن الشمس کہتے ہیں) مطلب یہ ہے کہ شام کے وقت آفتاب سفر کرنے کو آمادہ ہے اور آسمان ماہِ نو کی آغوشِ وداع کی صورت میں ظاہر کرکے رخصتی معانقہ کے لیے تیار ہے ۱۲

٢ مطلب یہ ہے کہ معشوق کے رخ سے شمع کو سوزِ جاودانی ملا۔ آتشِ گل کو جو کہ چہرۂ معشوق ہے شمع کے لیے آبِ حیات قرار دیا ہے کیونکہ شمع اسی وقت تک زندہ سمجھی جاتی ہے جب تک کہ وہ روشن ہے بجھی ہوئی شمع کو شاعر شمعِ کشتہ کہتے ہیں۔ اور شعلہ کو

تیرے خیال سے روح اہتزاز[ل] کرتی ہے | بہ جلوہ ریزیِ باد و بہ پرفشانیِ شمع
نشاطِ داغِ غمِ عشق کی بہار نہ پوچھ | شگفتگی ہے شہیدِ[۲] گلِ خزانیِ شمع

جلے ہے دیکھ کے بالینِ یار پر مجھ کو
نہ کیوں ہو دل پہ مرے داغِ بدگمانیِ شمع

ردیف ف

بیمِ رقیب سے نہیں کرتے وداعِ ہوش | مجبور یاں تلک ہوئے اے اختیار حیف
جلتا ہے دل، کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گئے | اے ناتمامیِ[۳] نفسِ شعلہ بار حیف

مخاطب کر کے کہتا ہے کہ اے شعلہ تیرے لرزنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ حسرت پرواز غم سے شمع ناتواں ہوگئی ہے ۱۲

ل اہتزاز: جنبش سرور۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح ہوا کی جلوہ ریزی سے شمع کو حرکت ہوتی ہے اسی طرح تیرے خیال سے روح جنبش سرور میں آجاتی ہے ۱۲

۲ شہید: عاشق۔ گل خزانی: گل خزاں زدہ۔ مطلب یہ ہے کہ غم عشق کا داغ جو خوشی سے باغ باغ ہو رہا ہے اس کی کیفیت بہار نہ پوچھ اس کی شگفتگی شمع کے خزاں زدہ پھول کی عاشق ہے یعنی فنا ہونے والی ہے ۱۲

۳ ناتمامی: ادھورا پن۔ نفس شعلہ بار: اشتعال حرارت پیدا کرنے والی آہ ۱۲

ردیف ک

۴۵

زخم پر چھڑکیں کہاں طفلانِ بے پروا نمک
کیا مزہ ہوتا اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک

گردِ راہِ یار[۱] ہے سامانِ نازِ زخمِ دل
ورنہ ہوتا ہے جہاں میں کس قدر پیدا نمک

مجھ کو ارزانی رہے تجھ کو مبارک ہو جیو[۲]
نالۂ بلبل کا درد اور خندۂ گل کا نمک

شورِ جولاں[۳] تھا کنارِ بحر پر کس کا کہ آج
گردِ ساحل ہے بہ زخمِ موجۂ دریا نمک

داد دیتا ہے مرے زخمِ جگر کی واہ وا[۴]
یاد کرتا ہے مجھے دیکھے ہے وہ جس جا نمک

چھوڑ کر جانا تنِ مجروحِ عاشق حیف ہے
دل طلب کرتا ہے زخم اور مانگیں ہیں اعضا نمک

غیر کی منت نہ کھینچوں گا پئے توفیرِ درد
زخم مثلِ خندۂ قاتل ہے سر تا پا نمک

---

۱ اے معشوق کے رستہ کی گرد ہمارے زخمِ دل کے لیے شایانِ ناز ہے ورنہ دنیا میں نمک تو بہت پیدا ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نمک چاہے جس قدر زخمِ دل پر کیوں نہ چھڑکا جائے لیکن اس میں وہ مزہ نہیں ملتا جو زخمِ دل میں "راہ گردِ یار" کے پڑ جانے سے ملتا ہے ۱۲

۲ شعر کا مطلب صاف ہے۔ اس شعر میں مولانا طباطبائی نے "جیو" پر اعتراض کیا ہے کہ یہ لفظ متروک ہے لیکن انھیں یاد رکھنا چاہیے کہ جس زمانہ میں غالب نے یہ شعر لکھا تھا اس وقت یہ لفظ ٹکسال باہر نہ تھا۔ نہ صرف "ہو جیو" بلکہ "کیجیو" بھی لکھتے تھے میر انیس لکھتے ہیں ؎

راحت کے لیے صبح سرانجام کیجیو
زہرا کے گھر کو لوٹ کے آرام کیجیو ۱۲

۳ دریا کے کنارے کس معشوق کا گھوڑا آج گرمِ جولاں تھا کہ ساحل کی گرد موجِ دریا کے حق میں نمک بن گئی۔ مطلب یہ ہے کہ توسنِ یار کی گرم جولانی کے مقابل میں دریا کے جوش و خروش کی کچھ حقیقت نہیں۔ جولاں گھوڑے کے دوڑنے کو کہتے ہیں ۱۲ ۴ زخمِ جگر کی داد دینا۔ زخمِ جگر پر نمک چھڑکنا ۱۲

یاد ہیں غالبؔ تجھے وہ دن کہ وجدِ ذوق میں[۱]
زخم سے گرتا تو میں پلکوں سے چنتا تھا نمک

۷۶

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرہ پہ گہر ہونے تک

عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک[۲]

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک[۳]

یک نظر[۴] بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل
گرمیِ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

---

۱ اس شعر میں مصنف نے متکلم اور غالب کو دو شخص فرض کیا ہے متکلم غالب سے کہتا ہے کہ آگے میری حالت یہ تھی کہ میں اس نمک کو جو زخموں سے گرتا تھا فرطِ ذوق میں اپنی پلکوں سے چنا کرتا تھا اور تو اس حالت کو دیکھتا تھا۔ تجھے وہ حالت یاد ہے یا نہیں مولانا طباطبائی کا خیال غالباً اس تخیل کی طرف متوجہ نہیں ہوا اس لیے انھوں نے اس شعر کے مصرعۂ اول میں تجھے کے لفظ کو غلط بتایا ہے وہ کہتے ہیں کہ تجھے کی جگہ مجھے ہونا چاہیے۔ اس قسم کے استعمال کی مثالیں اور شعرا کے یہاں بھی ملتی ہیں مثلاً مصحفی فرماتے ہیں ؎ مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم : تیرے سینے میں بہت کام رفو کا نکلا ۱۲

۲ دل کا کیا رنگ کروں : دل کے سنبھالنے کے لیے کیا تدبیر کروں ۱۲

۳ معشوق کی نظرِ عنایت کو آفتاب کے عکس سے تشبیہ دی ہے ۱۲۔

۴ اس شعر میں انسان کو غافل کہہ کر مخاطب کیا "اے" محذوف ہے ۱۲

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج[۱]
شمع ہر رنگ میں جلتی ہو سحر ہونے تک

ردیف گ

گر تجھ کو ہو یقینِ اجابت دعا نہ مانگ
یعنی بغیر یک دلِ بے مدعا نہ مانگ[۲]

آتا ہو داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد[۳]
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

۱؎ اس شعر میں انسان کی زندگی کو شمع سے تشبیہ دی ہو ۱۲

۲؎ بغیر کے معنی یہاں سوا کے ہیں مطلب یہ ہو کہ دلِ بے مدعا کے سوا تو کسی اور چیز کے حاصل ہونے کی دعا نہ مانگ۔ یعنی جب دلِ بے مدعا ملنے کی دعا قبول ہو جائیگی اور وہ تجھے مل جائیگا تو دعا مانگنے کی ضرورت باقی نہ رہے گی ۱۲

۳؎ اس شعر میں نہایت شوخی سے شاعر خدا سے کہتا ہو کہ گناہوں کا حساب کیونکر دوں کیونکہ وہ شمار میں اس قدر زیادہ ہیں کہ جب اُن کو شمار کرتا ہوں تو مجھے اپنے دل کے داغ یاد آجاتے ہیں جو شمار میں اسی قدر ہیں جس قدر میرے گناہ ہیں۔ گناہوں اور داغوں کی گنتی میں برابری سے یہ ظاہر کیا ہو کہ جب میں نے گناہ کیا تو بوجہ عدم استطاعت اس کی تکمیل نہ کر سکا۔ اس لیے ہر گناہ کے ساتھ حسرت کا داغ بھی دل پہ لگتا رہا ۱۲

ردیف ل

۸۰

ہے کس[۱] قدر ہلاکِ فریبِ وفائے گل! — بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل

آزادیِ[۲] نسیم مبارک! کہ ہر طرف — ٹوٹے پڑے ہیں حلقۂ دامِ ہوائے گل

جو[۳] تھا سو موجِ رنگ کے دھوکے میں مر گیا — اے وائے نالۂ لبِ خونیں نوائے گل

خوش[۴] حال اُس حریفِ سیہ مست کا کہ جو — رکھتا ہو مثلِ سایۂ گل سر بپائے گل

ایجاد کرتی ہے اسے تیرے لیے بہار — میرا رقیب ہے نفسِ عطر سائے گل

شرمندہ رکھتے ہیں مجھے بادِ بہار سے — مینائے بے شراب و دلِ بے ہوائے گل

سطوت[۵] سے تیرے جلوۂ حسنِ غیور کی — خوں ہے مری نگاہ میں رنگِ ادائے گل

تیرے ہی جلوہ کا ہے یہ دھوکا کہ آج تک — بے اختیار دوڑے ہے گل در قفائے گل

---

۱ بلبل جو وفائے گل کی فریب کا کشتہ ہے اُس کی اس حماقت و سادگی پر خود پھول خندہ زن ہیں کہ اس نے خوب دھوکا کھایا ۱۲

۲ ہوائے گل: شوقِ گل مطلب یہ ہے کہ غنچۂ دل کے دام میں جو ہوائے گل مقید تھی گل کے کھل جانے سے شوقِ گل کا دام شکستہ ہو گیا یعنی ہوائے گل آزاد ہو گئی ۱۲

۳ مطلب یہ ہے کہ گل کا رنگ درحقیقت نوائے خموش اور نالۂ خوں چکاں ہے ہر شخص اس موجِ رنگ کا دھوکہ کھا کر فریفتہ ہو گیا ؟

۴ سایۂ گل سے عاشقِ سیہ مست اور گل سے معشوق مراد ہے۔ وجہ تشبیہ ظاہر ہے ۱۲

۵ سطوت: رعب۔ مطلب یہ ہے کہ تیرے حسنِ غیرت مند کے رعب سے گل کی ادا کا رنگ میری نگاہ میں خون نظر آتا ہے یعنی بھلا نہیں معلوم ہوتا ۱۲

غالبؔ۔ مجھے ہے اُس سے ہم آغوشی آرزو[۱]
جس کا خیال ہے گلِ جیبِ قبائے گل

ردیف م

۷۹
غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

محفلیں[۲] برہم کرے ہے گنجفہ بازِ خیال
ہیں ورق گردانیِ نیرنگِ یک بتخانہ ہم

باوجودِ یک جہاں ہنگامہ پیدائی نہیں
ہیں چراغانِ شبستانِ دلِ پروانہ ہم

ضعف[۳] سے ہے نے قناعت سے یہ ترکِ جستجو
ہیں وبالِ تکیہ گاہِ ہمتِ مردانہ ہم

دائم الحبس اس میں ہیں لاکھوں تمنائیں اسدؔ
جانتے ہیں سینۂ پُرخوں کو زنداں خانہ ہم

---

۱ اُس سے ہم آغوشی آرزو: غالبؔ نے اپنے مذاقِ طبع کے مطابق فارسی محاورۂ "از دے آرزوئے ہم آغوشی دارم" کا ترجمہ کیا ہے یعنی اُس سے ہم آغوشی کی آرزو ہے جس کے خیال کو گل نے اپنا زینتِ گریبان بنایا ہے ۱۲

۲ خیال کا محفلوں کو برہم کرنا: جو محفلیں برہم ہو گئی ہیں اُن کی برہمی کی یاد کو تازہ کرنا ہم ورق گردانیِ نیرنگِ بت خانہ ہیں یعنی ورق گردانندہ نیرنگِ بت خانہ ہیں ۱۲

۳ ہم نے جستجو ترک کر دی: یہ قناعت کی بنا پر نہیں ہے بلکہ ہم میں جستجو کی طاقت ہی نہیں ہے اس لیے ہم تکیہ گاہِ ہمتِ مرداں کے لیے وبال بن گئے یعنی مردوں کا یہ کام ہو کہ ہمت کو اپنا تکیہ گاہ جانتے ہیں لیکن یہاں یہ معاملہ بالعکس ہے ۱۲

متاعِ خانۂ زنجیر جُز صدا معلوم	۸۰	ہے[1] نالہ۔ حاصلِ دلبستگی فراہم کر
رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم رکھ لیجو میرے دعویٔ وارستگی کی شرم	۸۱	مجھ[2] کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دور وہ حلقہ ہائے زلف کمیں میں ہیں اے خدا

ردیف ن

لوں۔ دامِ بختِ خفتہ سے یک خوابِ خوش ولے
غالب۔ یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں

وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں؟	۸۳	وہ فراق اور وہ وصال کہاں؟

[1] اس شعر میں "کر" کی جگہ "کُن" رکھ دیا جائے تو بالکل فارسی شعر ہو جائے گا۔ ترجمہ یہ ہے کہ نالے سے حاصلِ دلبستگی اپنے قابو میں لا ورنہ خانۂ زنجیر میں بجز شور کے اور کیا رکھا ہے۔ شاعر نے دلبستگی کو زنجیر سے تشبیہ دی ہے وہ کہتا ہے کہ جس طرح خانۂ زنجیر میں بجز جھنکار کے اور کوئی سامان نہیں ہوتا اسی طرح تعلقِ خاطر کا ماحصل بھی صرف "نالہ" ہی نالہ ہے غرض یہ ہے کہ انسان جب دل گرفتہ ہوتا ہے تو اس کے دل کی بھڑاس صرف نالہ کرنے ہی سے نکل سکتی ہے"

[2] اس شعر میں بڑے لطیف پیرایہ میں اہلِ وطن کی شکایت کی ہے۔ کہتا ہے کہ اگر میں وطن میں مرتا تو چونکہ اہلِ وطن میں میرا کوئی ہمدرد اور غمخوار نہ تھا اس لیے میرا مردہ بے گور و کفن پڑا رہتا لیکن خدا کا شکر ہے کہ میں پردیس میں مرا اور وہاں جو کچھ گزری اسے کون جانتا ہے ۱۲۔

فرصتِ کاروبارِ شوق کسے ؟
ذوقِ نظارۂ جمال کہاں ؟

دل تو دل، وہ دماغ بھی نہ رہا
شورِ سودائے خط و خال کہاں ؟

تھی وہ اِک شخص کے تصوّر سے
اب وہ رعنائیِ خیال کہاں ؟

ایسا آساں نہیں۔ لہو رونا
دل میں طاقت۔ جگر میں حال کہاں ؟

ہم سے چھوٹا قمار خانۂ عشق
واں جو جاویں گرہ میں مال کہاں ؟

فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں
میں کہاں ؟ اور یہ وبال کہاں ؟

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب
وہ عناصر میں اعتدال کہاں ؟

کی وفا ہم سے تو غیر اُس کو جفا کہتے ہیں
ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں

آج ہم اپنی پریشانیِ خاطر اُن سے
کہنے جاتے تو ہیں۔ پر دیکھیے کیا کہتے ہیں

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ رُبا کہتے ہیں

دل میں آ جائے ہے۔ ہوتی ہے جو فرصت غش سے
اور پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود[۱]
قبلے کو۔ اہلِ نظر۔ قبلہ نما کہتے ہیں

[۱] شاعر نے اس شعر میں اُن لوگوں کے اعتراضات کا جواب دیا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ مسلمان بھی کعبہ کو پوجتے ہیں۔ شاعر نے بتایا ہے کہ ہمارا مسجود ادراک کی سرحد سے بھی اُدھر ہے۔ یعنی بھلا کعبہ کو (جو نہ صرف قوتِ لامسہ کے ذریعے محسوس ہوتا ہے بلکہ قوتِ باصرہ بھی اس کا احساس کرتی ہے کیونکہ وہ پتھر وغیرہ کی ایک تعمیر ہے) ہم سجدہ نہیں کرتے بلکہ ہم اپنے معبودِ حقیقی یعنی خدائے وحدہٗ لاشریک کو سجدہ کرتے ہیں۔ لیکن چونکہ سجدے کے لیے سمت ضروری ہے اس سبب سے

پائے افگار پہ جب سے تجھے رحم آیا ہے
خار رہ کو ترے ہم مہر گیا کہتے ہیں

اک شرر دل میں ہے اس سے کوئی گھبرائیگا کیا
آگ مطلوب ہے ہم کو جو ہوا کہتے ہیں

دیکھیے لاتی ہے اُس شوخ کی نخوت کیا رنگ
اُس کی ہر بات پہ ہم نام خدا کہتے ہیں

وحشت و شیفتہ اب مرثیہ کہویں شاید
مرگیا غالبِ آشفتہ نوا کہتے ہیں

۹۵

آبرو کیا خاک اُس گُل کی کہ گلشن میں نہیں
ہے گریباں ننگِ پیراہن جو دامن میں نہیں

جہت کعبہ کو معین کرلیا۔ اسی اصول پر فقہ کا یہ مسئلہ ہے کہ اگر سفر میں کسی کو کعبہ کی سمت معلوم نہ ہو تو وہ شخص جس سمت کو منہ کرکے نماز پڑھے گا اُس کی نماز ہوجائے گی۔ مطلب یہ ہے کہ سمت دراصل قبلہ نہیں بلکہ قبلہ نما ہے ۱۲۔

لہ مہر گیا۔ ایک قسم کی بوٹی ہے جس کی جڑ بشکل انسان ہوتی ہے مشہور ہے کہ لوگ اس کو بطور عمل تسخیر اپنے پاس رکھتے ہیں جس کے پاس یہ بوٹی ہوتی ہے اُس پر لوگ مہربان ہوتے ہیں ۱۲

ٹہ فلسفۂ جدید کا مسئلہ دورانِ خون جو اب ثابت ہوا ہے اس شعر میں نظم کیا گیا ہے۔ اس سے غالب کے فلسفیانہ مذاق کا ثبوت ملتا ہے شرر سے مراد روح حیوانی ہے جو انسان میں موجود ہے وہ کہتا ہے کہ روح کی حرارت سے انسان کو سانس لینے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ بلکہ ہر سانس میں ہوا سے روح کو مشتعل کرنا مطلوب ہے ۱۲

ٹہ غلام علی خاں وحشت تلمیذ مومن اور نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ غالب کے دوستوں میں تھے نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ صاحب تذکرۂ گلشن بیخار مشہور شعرا میں گزرے ہیں شیفتہ کا دیوان مع سوانح عمری مرتبہ نظامی بدایونی ۱۸۹۱ء میں نظامی پریس بدایوں سے شائع ہوچکا ہے

ضعف سے اے گریہ کچھ باقی مرے تن میں نہیں
رنگ ہو کر اڑ گیا جو خوں کہ دامن میں نہیں

ہو گئے ہیں جمع اجزائے نگاہِ آفتاب
ذرّے اُس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں

کیا کہوں تاریکیِ زندانِ غم اندھیر ہے
پنبہ نورِ صبح سے کم جس کے روزن میں نہیں

[له] رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن
غیر سمجھا ہے کہ لذت زخمِ سوزن میں نہیں

بس کہ ہیں ہم اک بہارِ ناز کے مارے ہوئے
جلوۂ گل کے سوا گرد اپنے مدفن میں نہیں

[له] یعنی تمام دنیا میں جو کچھ بھی ہے وہ سب عشق و محبت کے طفیل سے ہے۔ عشق و محبت سے یہ مطلب نہیں کہ وہ کسی معشوقِ مجازی کی محبت ہو بلکہ زن و فرزند مال و دولت ملک و ملت سب پر حاوی ہے۔ شاعر کا مطلب یہ ہے کہ اگر خرمن میں برق یعنی دل میں محبت نہیں تو اس کی مثال اس مجلس کی ہے جس میں شمع نہ ہو ۱۲

قطرہ قطرہ اِک ہیولیٰ ہی نئے ناسور کا
خوں بھی ذوقِ درد سے فارغ مرے تن میں نہیں

لے گئی ساقی کی نخوت قلزم آشامی مری
موجِ مے کی آج رگ مینا کی گردن میں نہیں

ہو فشارِ ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود؟
قد کے جھکنے کی بھی گنجائش مرے تن میں نہیں

تھی وطن میں شان کیا غالبؔ کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

گر اِک ادا ہو تو اُسے اپنی قضا کہوں	٨٦	عہدے سے مدحِ ناز کے باہر نہ آسکا

لہ ہیولیٰ اُس مادہ کو کہتے ہیں جو مختلف صورتوں میں تبدیل ہونے کی قابلیت رکھتا ہو۔ شعر کا مطلب یہ ہی کہ میرے لہو کا ہر قطرہ جدید ناسور کی صورت میں آنیوالا ہی یعنی جس جگہ بدن میں لہو کی بوند ہو گی اُسی جگہ ناسور پیدا ہو جائیگا۔ گویا میرے خون کے ہر قطرہ میں ذوقِ درد موجود ہی۔ اور اسی وجہ سے وہ ایک نیا ناسور بن جانا چاہتا ہی ۱۲

ملہ چونکہ پہلے مصرعہ میں نخوت کا ذکر ہی اس لیے اُس کی رعایت سے گردن میں موجِ مے کی رگ کہا گیا ہی کیونکہ غرور کو رگِ گردن سے تعبیر کیا جاتا ہی۔ مطلب یہ ہی کہ میری بلانوشی نے ساقی کا غرور گھٹا دیا اور مینا کی گردن میں موجِ مے کی رگ نہ رہی یعنی سب شیشے خالی ہو گئے

سہ اس شعر میں شاعر نے اپنے کو مشتِ خس سے اور وطن کو گلخن سے تشبیہ دی ہی۔ وہ کہتا ہی کہ مشتِ خس یعنی پھوس جب گلخن میں ہوتا ہی تو جلتا ہی اور اُس کے باہر اُس کی کچھ قدر نہیں ہوتی یہی حال میرا ہی کہ وطن میں تھا تو جلتا تھا اور اب دیس میں ہوں تو بے قدر ہوں ۱۲ یادگارِ غالب

حلقے ہیں چشم ہائے کشادہ بسوئے دل
ہر تارِ زلف کو نگہِ سرمہ سا کہوں

میں اور صد ہزار نوائے جگر خراش
تو اور ایک وہ نشنیدن کہ کیا کہوں

ظالم مرے گماں سے مجھے منفعل نہ چاہ
ہی ہی - خدا نہ کردہ تجھے بے وفا کہوں

۸۷

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہی؟
بات کچھ سر تو نہیں ہی کہ اٹھا بھی نہ سکوں

زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو ستمگر - ورنہ
کیا قسم ہی ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

۸۸

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

غرۂ اوجِ بنائے عالمِ امکاں نہ ہو
اس بلندی کے نصیبوں میں ہی پستی ایک دن

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائیگی ہماری فاقہ مستی ایک دن

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائیگا یہ سازِ ہستی ایک دن

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

۸۹

ہم پر جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں
اک چھیڑ ہی وگرنہ مراد امتحاں نہیں

کس منہ سے شکر کیجیے اس لطفِ خاص کا
پرسش ہی اور پائے سخن درمیاں نہیں

ہم کو ستم عزیز ستمگر کو ہم عزیز
نامہرباں نہیں ہی - اگر مہرباں نہیں

بوسہ نہیں، نہ دیجیے، دشنام ہی سہی
آخر زباں تو رکھتے ہو، تم گر دہاں نہیں

ق

ہر چند، جاں گدازیِ قہر و عتاب ہے[1]
ہر چند، پشتِ گرمیِ تاب و تواں نہیں

جاں مطربِ ترانۂ ہل من مزید ہے
لب، پردہ سنجِ زمزمۂ الاماں نہیں

خنجر سے چیر سینہ اگر دل نہ ہو دو نیم
دل میں چھری چبھو، مژہ گر خونچکاں نہیں

ہے ننگِ سینہ، دل اگر آتش کدہ نہ ہو[2]
ہے عارِ دل نفس اگر آذر فشاں نہیں

نقصاں نہیں جنوں میں، بلا سے ہو گھر خراب
سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں

کہتے ہو "کیا لکھا ہے تری سرنوشت میں؟"
گویا جبیں پہ سجدۂ بت کا نشاں نہیں

پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے سخن کی میں[3]
روح القدس اگرچہ مرا ہم زباں نہیں

جاں ہے بہائے بوسہ، ولے کیوں کہے ابھی؟
غالبؔ کو جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں

---

[1] یہ شعر اپنے بعد والے شعر کے ساتھ ملا کر پڑھنا چاہیے کیونکہ یہ دونوں شعر قطعہ بند ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہرچند معشوق کا قہر جاں گداز ہے اور ہماری تاب و طاقت نے جواب دیدیا ہے یعنی ہم اُس کو برداشت نہیں کر سکتے لیکن پھر بھی ہم اس کے قہر سے الامان نہیں پکارتے۔ بلکہ جان دار کا یہی سوال ہے کہ اور کوئی ظلم کرنا باقی رہ گیا ہو تو میں اس کے لیے تیار ہوں ١٢

[2] آذر فشاں:- آتش فشاں ١٢

[3] اس شعر میں ہم زبان کے لفظ میں ایہام ہے بظاہر ہم زبان نہیں کے یہ معنی ہیں کہ انسان اور فرشتہ کی زبان ایک نہیں ہو سکتی۔ لیکن شاعر کا اصلی مطلب یہ ہے کہ روح القدس کی زبان ایسی فصیح نہیں جیسی میری زبان ہے ١٢

۹۰

مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں — ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

[۱] شوق اس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں — جادہ غیر از نگہِ دیدۂ تصویر نہیں

[۲] حسرتِ لذتِ آزار رہی جاتی ہے — جادۂ راہِ وفا جز دمِ شمشیر نہیں

[۳] رنجِ نومیدیِ جاوید گوارا رہیو — خوش ہوں گر نالہ زبونی کشِ تاثیر نہیں

[۴] سر کھجاتا ہے جہاں زخمِ سر اچھا ہو جائے — لذتِ سنگ بہ اندازۂ تقریر نہیں

[۵] جب کرم رخصتِ بیباکی و گستاخی دے — کوئی تقصیر بجز خجلتِ تقصیر نہیں

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

[۱] شوق — مجھے اس جنگل میں لیے جاتا ہے جہاں حیرت کے سوا کوئی راہ نہیں۔ یعنی وادیِ عرفان میں پہنچ کر ہر شخص محو حیرت ہو جاتا ہے ۱۲

[۲] شاعر حسرت سے کہتا ہے کہ راہِ وفا کا جادہ تلوار کی باڑھ کے سوا کوئی اور نہیں ہے یعنی وفا کے لیے قتل ہو جانے کے سوا دوسری راہ منزلِ مقصود پر پہنچنے کی نہیں ہے۔ اور جب عاشق قتل ہو جاتا ہے تو لذتِ آزار کی حسرت رہ جاتی ہے ۱۲۔

[۳] زبوں بالفتح ذلیل معنی عاجز و ضعیف ترکی زبان میں زشت و بد کو کہتے ہیں۔ اس شعر میں انتہا درجہ کی غیرت کا اظہار کیا گیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اسے ہمیشہ کی یاس و نا امیدی ہی روزی رہے وہ اپنے نالہ کے بے اثر ہونے سے خوش ہے یعنی شاعر فریاد کو اثر نصیب ہونا اپنی ذلت سمجھتا ہے ۱۲

[۴] جہاں۔ جس وقت۔ مطلب یہ ہے کہ جس وقت زخم سر اچھا ہو جاتا ہے سر کھجانے لگتا ہے یعنی خواہش ہوتی ہے کہ پھر پتھر لگیں۔ پتھروں کی چوٹ میں جو لطف آتا ہے وہ بیان سے باہر ہے ۱۲

[۵] جب کرم بیباکی و گستاخی کی اجازت دے تو اس وقت جھجک بھی بہت بڑا قصور ہے ۱۲

مستِ مردمکِ دیدہ میں سمجھو یہ نگاہیں ۔۔۔ ۹۱ ۔۔۔ ہیں[۱] جمع سویدائے دِلِ چشم میں آہیں

برشکالِ دیدۂ عاشق ہے۔ دیکھا چاہیے ۔۔۔ ۹۲ ۔۔۔ کھل گئی مانندِ گل سو جا سے دیوارِ چمن
اُلفتِ گل سے غلط ہے دعویٔ وارستگی ۔۔۔ سرو ہے باوصفِ آزادی گرفتارِ چمن

عشق تاثیر سے نومید نہیں ۔۔۔ ۹۳ ۔۔۔ جاں سپاری شجرِ بید نہیں
سلطنت[۲] دست بدست آئی ہے ۔۔۔ جامِ مَے خاتمِ جمشید نہیں
ہے تجلّی[۳] تری سامانِ وجود ۔۔۔ ذرّہ بے پرتوِ خورشید نہیں
رازِ معشوق[۴] نہ رسوا ہو جائے ۔۔۔ ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں
گردشِ رنگِ طرب سے ڈر ہے ۔۔۔ غمِ محرومیٔ جاوید نہیں
کہتے ہیں جیتے ہیں امید پہ لوگ ۔۔۔ ہم کو[۵] جینے کی بھی امید نہیں

[۱] جس طرح آنکھ میں تل ہوتا ہے اسی طرح دل میں ایک نقطہ ہوتا ہے اس کو سویدا کہتے ہیں
دِلِ چشم بمعنی وسطِ چشم ۱۲

[۲] سلطنت سے جامِ شراب کی سلطنت مراد ہے جو جمشید سے رندوں تک
دست بدست پہنچی ہے وہ جمشید کی انگوٹھی نہیں ہے جو اُس کی ذات پر ختم ہو جائے ۱۲

[۳] شاعر خداوندِ عالم سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ تیری ذات کی جلوہ گری باعثِ وجود
عالم ہے جیسے طلوعِ خورشید ذرّوں کے لیے باعثِ ظہور ہوا ۱۲

[۴] اس شعر میں "کچھ بھید نہیں" کچھ برائی نہیں کی جگہ استعمال ہوا ہے ۱۲

[۵] اس شعر میں "مجھ کو" محذوف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خوشی حاصل ہونے کے بعد اس کا زوال
ایسا جانکاہ ہے کہ اس سے محرومیٔ جاوید بہتر ہے ۱۲

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں[1] ۹۴ خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

دلِ آشفتگاں خالِ کنجِ دہن کے
سویدا میں سیرِ عدم دیکھتے ہیں

ترے[2] سروِ قامت سے اک قدِ آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

تماشہ[3] کر اے محوِ آئینہ داری
تجھے کس تمنّا سے ہم دیکھتے ہیں

سراغِ[4] تفِ نالہ لے۔ داغِ دل سے
کہ شب رَو کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں :

ملتی ہو خوئے یار سے نار التہاب[5] میں ۹۵ کافر ہوں۔ گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

[1] خیاباں خیاباں : بمعنی کثرت ۱۲

[2] یہ شعر غالب کے اُن اشعار میں سے ہے جس کی نسبت کہا گیا ہو کہ ان میں معنی کے دو پہلو رکھے گئے ہیں۔ اس شعر کے ایک معنی تو یہ ظاہر ہیں کہ تیرے سروِ قامت سے فتنۂ قیامت گھٹا ہوا ہی دوسرے معنی ہیں کہ تیرا سروِ قامت فتنۂ قیامت ہی سے بنایا گیا ہو۔ اس لیے وہ ایک قدِ آدم کم ہو گیا ہی ۱۲

[3] تماشہ کر : تماشہ کن کا اردو ترجمہ ہی یعنی دیکھ ایک قدیم نسخے میں "تماشہ" کو بھی لکھا ہو۔ اس سے بھی مطلب وہی رہتا ہی ۱۲

[4] تفِ نالہ : نالہ کی گرمی۔ شب رو : دزدِ شب۔ چونکہ نالہ کشی رات کو ہوا کرتی ہی اس لیے نالہ کو دزدِ شب قرار دیا ہی شاعر کہتا ہی کہ جس طرح صبح کو نقشِ قدم دیکھ کر چور کے آنے جانے کا پتا چلتا ہی۔ اسی طرح تو داغِ دل سے نالۂ شب کی گرمی کا سراغ لگالے ۱۲

[5] التہاب : شعلہ کا بھڑکنا ۱۲۔

کب سے[۱] ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں
شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

جو[۲] منکرِ وفا ہو فریب اس پہ کیا چلے؟
کیوں بدگماں ہوں۔ دوست سے دشمن کے باب میں

میں[۳] مضطرب ہوں وصل میں خوفِ رقیب سے
ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں

میں اور حظِ وصل۔ خدا ساز بات ہے
جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے
ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

وہ نالہ۔ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے
جس نالے سے شگاف پڑے آفتاب میں

---

[۱] اسی مضمون کو ایک فارسی شاعر نے اس طرح لکھا ہے۔ ع "ز خضر عمر فزوں ہست عاشقاں را اگر نہ عمر شمارند روزِ ہجراں را"۔ اس شعر میں عمرِ خضر کا حوالہ دے کر فارسی شاعر نے عاشقوں کی عمر کو حد سے زیادہ کر دیا ہے لیکن غالب نے "کب سے ہوں کیا بتاؤں" کے ٹکڑے سے شعر کو مرتب کر کے اس مضمون کو نہایت دلچسپ پیرایہ میں ادا کیا ہے ۱۲

[۲] مطلب یہ ہے کہ معشوق منکرِ وفا ہے یعنی اس کو کسی کی وفا کا یقین نہیں ہے اس لیے تیری یہ بدگمانی فضول ہے کہ کہیں اس پر رقیب کے اظہارِ وفاداری کا فریب نہ چل گیا ہو۔ مصرعہ ثانی میں دوست سے معشوق اور دشمن سے رقیب کی طرف اشارہ ہے ۱۲

[۳] معشوق کے وہم سے یہ مراد ہے کہ وصل میں عاشق کی بے چینی سے معشوق کو یہ خیال پیدا ہوا ہے کہ اس کو کسی دوسرے حسین کے خیال نے اس وقت مضطرب کیا ہے پہلے مصرعہ میں اس خیال کی تردید کی گئی ہے ۱۲

وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے
جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں

غالبؔ چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

۹۶

کل کے لیے کر آج نہ خسّت شراب میں
یہ سوءِ ظن ہے ساقیٔ کوثر کے باب میں

ہیں[1] آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع[2]
گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں

رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

[1] اس شعر میں استفہام سے شاعر کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس سوال کا جواب دیا جائے بلکہ سامع کی تنبیہ مقصود ہے۔ اشارہ ہے حضرت آدم کے اس مشہور قصہ کی طرف کہ عزازیل فرشتہ کو حکم ہوا تھا کہ وہ حضرت آدم کو سجدہ کرے لیکن تعمیل حکم نہ کرنے کے سبب وہ راندۂ درگاہ ہو گیا۔ مطلب یہ ہے کہ کل تو حضرت آدم کی درگاہِ الٰہی میں یہ عزت و توقیر تھی اور آج انھیں کی اولاد دنیا میں آکر اپنے ہی ہاتھ سے ذلیل ہو گئی ۱۲۔

[2] سماع بالفتح: یعنی سننا اور اصطلاحِ صوفیائے کرام میں معرفتِ الٰہی کے اشعار سننے کو کہتے ہیں جو خوش آوازی کے ساتھ گائے جائیں۔ اس شعر میں استفہام سے صرف استعجاب مقصود ہے۔ وہ صدا سے اشارہ ہے شاہدِ حق کی صدا کی طرف۔ شاعر کہتا ہے کہ شاہدِ حق کی صدا تو جان بخش ہے پھر اس کا یہ الٹا اثر کیوں ہے اس کو سن کر سامعین کی جان فنا ہو جاتی ہے۔ اہلِ ذوق کو جو لطف سماع سے حاصل ہوتا ہے اس شعر میں اس کا اظہار کیا گیا ہے ۱۲۔

اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے[1] — جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

اصلِ[2] شہود و شاہد و مشہود ایک ہے — حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

ہے مشتملِ نمودِ صُوَر پر وجودِ بحر — یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

شرم[3] اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی — ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں

آرائشِ[4] جمال سے فارغ نہیں ہنوز — پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

ہے غیبِ[5] غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود — ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

---

[1] شاعر کہتا ہے کہ جس قدر ماسوا کے وہم سے میں پیچ و تاب میں رہتا ہوں اتنا ہی مجھے اپنی حقیقت سے بُعد ہے غیر سے مراد ماسوائے اللہ ہے جو صوفیہ کے نزدیک معدوم ہے ۱۲۔

[2] مشاہدہ شاہد و مشہود کے وجود کو علیحدہ علیحدہ چاہتا ہے اور یہاں جب تمام عالم موجود واحد موجود ہے تو شاہد و مشہود ایک ہی ہوئے یعنی جب شاہد و مشہود میں مغائرت نہیں تو پھر مشاہدہ کس طرح ہو سکتا ہے ۱۲

[3] شرم اُن کی ایک ادا ہے اور کچھ نہیں تو اپنے نفس ہی سے شرم کرتے لیکن باوجود بے پردہ رہنے کے وہ اپنے سے نہیں شرماتے حالانکہ شرم کے یہی معنی ہیں کہ خود اپنی ذات سے بھی حجاب کرے

[4] شاعر کہتا ہے کہ باوجود نقاب میں رہنے کے اُس کا معشوق مصروفِ آرائشِ جمال ہے اور یہ فضول ہے کیونکہ آرائش کا مقصد تو یہ ہے کہ عشاق اُس کو دیکھیں ۱۲۔

[5] جس طرح اس غزل کے اکثر اشعار معرفت میں ڈوبے ہوئے ہیں اسی طرح اس شعر میں بھی تصوف کا ایک اہم مسئلہ بیان کیا گیا ہے مولانا حالی نے یادگارِ غالب میں اس شعر کا جو حل لکھا ہے وہ یہ ہے سالک کو تمام موجوداتِ عالم میں حق ہی حق نظر آتا ہے اُس کو مشہود کہتے ہیں اور غیب الغیب سے مراد مرتبۂ لاحدیتِ ذات ہے جو عقل و ادراک و بصر و بصیرت سے وراء الوریٰ ہے شاعر کہتا ہے کہ جس کو ہم مشہود سمجھے ہوئے ہیں وہ درحقیقت غیب الغیب ہے اور اُس کو غلطی سے مشہود سمجھتے ہیں۔ ہماری ایسی مثال ہے جیسے کہ کوئی خواب میں دیکھے کہ جاگتا ہوں پس گو وہ اپنے کو بیدار سمجھتا ہے مگر فی الحقیقت وہ ہنوز خواب میں ہے ۱۲۔

غالبؔ۔ ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغولِ حق ہوں بندگی بوتراب میں

حیراں ہوں، دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں[۱]
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

جانا پڑا رقیب کے در پہ ہزار بار
اے کاش! جانتا نہ ترے رہ گزر کو میں

ہے کیا جو کس کے باندھیے میری بلا ڈرے
کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں

لو۔ وہ بھی کہتے ہیں کہ "یہ بے ننگ و نام ہے"[۲]
یہ جانتا اگر۔ تو لٹاتا نہ گھر کو میں

---

[۱] اس شعر میں نوحہ گر سے غالب کی مراد ہے وہ دار جو رہنے سے ہو جو اجرت پر ماتم کرے ۱۲۔
[۲] مطلب یہ ہے کہ معشوق جس کی خاطر میں بے سروسامان ہوا مجھے طعنہ دیتا ہے اگر میں ایسا جانتا تو میں اپنے کو تباہ و برباد نہ کرتا ۱۲

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ[1]
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا پوجتا ہوں اُس بتِ بیداد گر کو میں

پھر بےخودی میں بھول گیا راہِ کوئے یار
جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں

اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا
سمجھا ہوں دلپذیر متاعِ ہُنر کو میں

غالب خدا کرے کہ سوارِ سمندِ ناز
دیکھوں علی بہادرِ عالی گہُر کو میں

[1] اس شعر میں ایک پریشان حال مسافر کی جو راستہ بھولا ہوا ہو تصویر کھینچی گئی ہے کہ گھر چھوڑے ہوئے ابھی زیادہ مدت نہیں گزری۔ وحشتِ غربت میں بادیہ پیمائی کی منزلیں کٹھن معلوم ہوتی ہیں اس لیے جو تیز رو شخص ملتا ہے اُس کے ساتھ ہو لیتا ہے تاکہ منزلِ مقصود پر جلد پہنچے اور سفر کی تکلیف کا خاتمہ ہو۔ مصرعِ ثانی میں "ابھی" کے لفظ سے شاعر کو یہ کہنا مقصود ہے کہ ابھی اس دشت میں قدم رکھے ہوئے تھوڑی ہی مدت گزری ہے اور اس لیے اُسے رہبر کے صحیح انتخاب کی قابلیت حاصل نہیں ہوئی ہے جسے تیز رو دیکھتا ہے اُسی کے پیچھے ہو لیتا ہے۔ ۱۲

ذکر میرا بہ بدی بھی اُسے منظور نہیں
۹۰ غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں

وعدۂ سیرِ گلستاں ہے خوشا طالعِ شوق
مژدۂ قتل مقدر ہے جو مذکور نہیں

شاہدِ ہستیِ مطلق کی کمر ہے عالم
لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیِ منصور نہیں

حسرت اے ذوقِ خرابی کہ وہ طاقت نہ رہی
عشقِ پُر عربدہ کی گوں تنِ رنجور نہیں

ظلم کر ظلم۔ اگر لطف دریغ آتا ہو
تو تغافل میں کسی رنگ سے معذور نہیں

میں جو کہتا ہوں کہ ہم لینگے قیامت میں تمہیں
کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ "ہم حور نہیں"

صاف دُردی کشِ پیمانۂ جم ہیں ہم لوگ
وائے وہ بادہ کہ افشردۂ انگور نہیں

ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالب
میرے دعوی پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

ل؎ یہ شعر ان شعروں میں ہے جس کو لوگ بے معنی کہتے ہیں۔ ایک شارح نے اس شعر کو غالب کی طرف منسوب کرنے میں بھی شک کیا ہے وہ اس کو الحاقی سمجھتے ہیں۔ الفاظ سے جو کچھ مطلب نکلتا ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ شاعر نے اس شعر میں دنیا کے موہوم ہونے کو بہ غلو بیان کیا ہے۔ مصرعۂ ثانی میں لفظ منظور کے معنی مرئی کے لیے ہیں "مرئی" رویت کا اسم مفعول ہے اور منظور نظر کا یعنی وہ چیز جو دکھائی دے۔ ہوا اردو محاورہ میں منظور کا اس معنی میں استعمال نہیں ہے ۱۲

ک؎ عربدہ: بدخوئی و جنگ جوئی۔ شاعر اس شعر میں اپنے گزشتہ دم خم کو بحسرت یاد کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اب ہمارا تنِ رنجور عشق جیسے جنگ جو دشمن کے مقابلہ کی گوں نہ رہا یعنی قابل نہ رہا ۱۲ ک؎ شاعر کہتا ہے کہ اگر تو ہم سے تغافل ہی ضروری سمجھتا ہے تو اتنا ہی کر لے کیونکہ وہ بھی تغافل کی ایک ادا ہے اور تو تغافل کی ہر ادا برتنے پر قادر ہے ۱۲

۵۹

نالہ جز حسنِ طلب اے ستم ایجاد نہیں — ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں

عشقِ[1] و مزدوریِ عشرت گہِ خسرو کیا خوب — ہم کو تسلیم نکو نامیِ فرہاد نہیں

کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم — دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب — لطمۂ[2] موج کم از سیلیِ استاد نہیں

وائے[3] محرومیِ تسلیم و بدا حالِ وفا — جانتا ہے کہ ہمیں طاقتِ فریاد نہیں

رنگِ تمکینِ گل و لالہ پریشاں کیوں ہے؟ — گر چراغانِ سرِ رہ گزرِ باد نہیں؟

سَبَدِ گل کے تلے بند کرے ہے گلچیں — مژدہ اے مرغ! کہ گلزار میں صیاد نہیں

نفی سے کرتی ہے اثبات تراوش گویا — دی ہے جائے دہن اس کو دمِ ایجاد نہیں

کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت — یہی نقشہ ہے ولے۔ اس قدر آباد نہیں

---

[1] شاعر نے فرہاد پر جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اس نے شیریں کے وصل کی خاطر پہاڑ سے جوئے شیر نکالی اور پھر اپنا سر پھوڑ کر مر گیا اور شیریں کا وصل خسرو اس کے رقیب کو نصیب ہوا اس شعر میں طعن کی ہے وہ کہتا ہے کہ اس طریقے سے جان دینے میں فرہاد کی نیک نامی کی کیا بات ہے کہ اس نے رقیب کے لیے عشرت کدہ بنایا گویا اس نے عشرت کدہ تعمیر کرنے میں مزدوری کی خدمت ادا کی ۱۲ -

[2] لطمۂ موج :- موج کا تھپیڑا۔ مطلب یہ ہے کہ اہلِ بینش کو دنیا کے حوادث کا طوفان تجربہ کار بناتا ہے یعنی دنیا میں جتنے حادثے انسان پر پڑتے ہیں اُتنی ہی [illegible] ہیں ۱۲

[3] بدا در بد میں حرفِ الف ندبہ کا زائد کہا گیا ہے جیسے وادریغا میں شاعر اس شعر میں تسلیم کی محرومی اور وفا کی بدحالی پر افسوس کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ہم جو تسلیم و رضا اور آئینِ وفا کے خوگر ہونے کے سبب نالہ و فریاد نہیں کرتے تو معشوق اس کو ہماری وفاداری اور تسلیم پر محمول کرنے کے بجائے یہ سمجھتا ہے کہ ہم میں طاقتِ فریاد ہی نہیں ۱۲

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالبؔ
تم کو بے مہریٔ یارانِ وطن یاد نہیں

؎ دونوں جہان دیکے وہ سمجھے یہ خوش رہا تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہلِ بزم	۱۰۰	یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں تیرا پتا نہ پائیں تو ناچار کیا کریں؟ ہو غم ہی جاں گداز تو غمخوار کیا کریں؟
ہو گئی ہے غیر کی شیریں بیانی کارگر	۱۰۱	عشق کا اُس کو گماں ہم بے زبانوں پہ نہیں

۱۰۲
قیامت ہے۔ کہ سُن لیلیٰ کا دشتِ قیس میں آنا
تعجب سے وہ بولا "یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں"
دلِ نازک پہ اُس کے رحم آتا ہے مجھے غالبؔ
نہ کر سرگرم اُس کافر کو اُلفت آزمانے میں

؎ دونوں جہان مل جانے پر جو میں خاموش ہو رہا وہ اس کا مطلب یہ سمجھے کہ میں قانع ہوں لیکن خاموشی اختیار کرنے کا اصلی سبب یہ ہوا کہ مجھے زیادہ مانگنے اور تکرار کرنے سے شرم آتی۔ اس شعر میں اپنی شرافت نفس کا اظہار کیا ہے ۱۲

دل لگا کر لگ گیا[1] اُن کو بھی تنہا بیٹھنا ہیں[2] زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام	۱۰۳	بارے اپنی بیکسی کی ہم نے پائی داد یاں مہرِ گردوں ہے چراغِ رہ گزارِ باد یاں
یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے نظر[3] لگے نہ کہیں اُس کے دست و بازو کو ترے جواہرِ طرفِ کلہ کو کیا دیکھیں	۱۰۴	کبھی صبا کو - کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں ہم اوجِ طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں
نہیں[4] کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں کوئی کہے کہ "شبِ مہ میں کیا بُرائی ہے" جو آؤں سامنے اُن کے تو مرحبا نہ کہیں	۱۰۵	شبِ فراق سے روزِ جزا زیاد نہیں بلا سے آج اگر دن کو ابر و باد نہیں جو جاؤں واں سے کہیں کو تو خیر باد نہیں

[1] لگ گیا = مرض لگ گیا ۱۲

[2] زوال آمادہ - آمادۂ زوال ۱۲

[3] قریب قریب اسی مضمون کو فارسی میں ملا فیاض قمی نے اس طرح لکھا ہے "ہر کس کہ زخمِ کاری ما را نظارہ کرد تا حشر دست بازوئے او را دعا کند" لیکن غالب کا تخیل بڑھا ہوا ہے وہاں صرف دعا دینے کی خواہش کا اظہار ہے اور یہاں نظر لگ جانے کا اندیشہ ۱۲

[4] اس شعر کی ترکیب لفظی نہایت پُر لطف ہے شاعر کہتا ہے کہ یہ واقعہ نہیں کہ مجھے قیامت کا یقین نہیں ہے قیامت برحق ہے لیکن ساتھ ہی اس کے یہ اعتقاد ضرور ہے کہ اُس کے شدائد شبِ فراق کی سختیوں سے زیادہ نہیں ہیں ۱۲ -

کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں
کہ "آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں"

علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب
گدائے کوچۂ میخانہ نامراد نہیں

جہاں میں ہو غم و شادی بہم ہمیں کیا کام
دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں

تم ان کے وعدے کا ذکر ان سے کیوں کرو غالب
یہ کیا؟ کہ تم کہو۔ اور وہ کہیں کہ "یاد نہیں"

۱۰۴

ترے توسن کو صبا باندھتے ہیں
ہم بھی مضموں کی ہوا باندھتے ہیں

آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے
ہم بھی اک اپنی ہوا[۱] باندھتے ہیں

تیری فرصت کے مقابل اے عمر!
برق کو پابہ حنا باندھتے ہیں

قید ہستی سے رہائی معلوم![۲]
اشک کو بے سروپا باندھتے ہیں

نشۂ رنگ سے ہے واشد گل
مست کب بند قبا باندھتے ہیں

---

۱ ہوا باندھنا۔ رعب بٹھانا ۱۲

۲ عاشق اپنی مصیبت سے تنگ آکر قید حیات سے رہا ہونے کے لیے آہ وزاری کرتا ہے شاعر کہتا ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کوشش میں اُس کی آنکھوں سے جو آنسو نکلتا ہے خود اسی کا سر پیر نہیں قطرۂ اشک کی شکل مدوّر ہوتی ہے جس میں بالا و زیر نہیں ہوتا پس اشک کا سر و پا کہاں اس کے اس کی قید ہستی سے رہائی پانے کے معنی بے سر و پا ہیں اور اس میں کامیابی معلوم ۱۲۔

غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ اہلِ تدبیر کی واماندگیاں	لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں

سادہ پُرکار ہیں خوباں غالب
ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں

زمانہ سخت کم آزار ہے بجانِ اسد[1]	۱۰۳ وگرنہ ہم تو زیادہ توقع رکھتے ہیں

۱۰۴

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں؟
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے؟
لوحِ جہاں میں حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

[1] بجانِ اسد:۔ اسد کی جان کی قسم۔ شاعر نے اپنی جان کی قسم کھا کر کہا ہے کہ زمانے کے ہاتھ سے یہاں جس قدر آزار پہنچا ہو یہ بہت کم ہے ۱۲

حد[1] چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں

کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے؟
لعل و زمرد و زر و گوہر نہیں ہوں میں

رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیا دریغ؟
رتبے میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں

کرتے ہو مجھ کو منع قدم بوس کس لیے؟
کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں

غالبؔ۔ وظیفہ خوار ہو۔ دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

۱۰۹

سب کہاں۔ کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں

[1] عقوبت: سزا انجام کار اس کا مادہ عقب ہے ۱۲

تھیں بناتُ النعش[۱] گردوں دن کو پردے میں نہاں
شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں[۲] ہو گئیں

سب[۳] رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر کو
ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

نیند اُس کی ہے دماغ اُس کا ہے راتیں اُس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

---

[۱] بناتُ النعش وہ آسمان پر شمال کی طرف سات تارے ہیں تین ستارے ان میں سے جنازہ ہیں اور چار جنازے کے اُٹھانے والے بنات کے لفظ کا یہ مفہوم غلط ہے کہ عرب اُن ستاروں کو لڑکیاں سمجھتے ہیں۔ کیونکہ عربی میں جنازہ اُٹھانے والے کو ابن النعش کہتے ہیں اور عربی محاورے میں ابن النعش کی جمع بنات النعش آتی ہے ۱۲

[۲] روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں یعنی بے نور ہو گئیں ۱۲

[۳] سب کے بعد عشاق کا لفظ محذوف ہے مطلب یہ ہے کہ اور سب عشاق اپنے اپنے رقیبوں سے ناخوش ہوں تو ہوں لیکن زلیخا اپنے رقیبوں یعنی اُن زنانِ مصر سے جو حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھ کر ایسی محو ہو گئیں تھیں کہ اُنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے خوش ہے۔ وجہ خوشی یہ ہے کہ ان عورتوں نے حضرت یوسف کو پسند کرنے میں اس کی رائے کی تائید کی تھی ۱۲

میں چمن میں کیا گیا۔ گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں

وہ[۱] نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یا رب دل کے پار؟
جو مری کوتاہیِ قسمت سے مژگاں ہو گئیں

بس کہ روکا میں نے اور سینے میں ابھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہو گئیں

واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہو گئیں

جاں فزا ہے بادہ۔ جس کے ہاتھ میں جام آ گیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں

ہم[۲] موحد ہیں۔ ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

۱؎ اس شعر میں استفہام استعجابی ہے۔ نگاہیں دور تک جا سکتی ہیں لیکن پلکیں نہیں جا سکتیں۔ نگاہیں مژگاں ہو گئیں، سے شاعر کا مطلب یہ ہے کہ نگاہیں کوتاہ ہو گئیں یعنی شرم سے میری جانب نہیں اٹھتیں اور پھر بھی دل کے پار ہوئی جاتی ہیں اس کا سبب وہ بہ استعجاب پوچھتا ہے ۱۲۔

۲؎ یہ شعر تصوف سے علاقہ رکھتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم موحد ہیں اور موحد کے لیے ترکِ رسوم لازمی ہے اور مذاہب بھی اپنی ظاہری پابندیوں سے سب رسوم میں داخل ہیں اس لیے شاعر ترکِ رسوم سے ترکِ مذاہب یعنی ملتوں کی ظاہری پابندیوں کے مٹ جانے کی طرف اشارہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ملتوں کے مٹ جانے یعنی ترکِ رسوم مذاہب کی

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

یوں ہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

١١٠

دیوانگی سے دوش پہ زنار بھی نہیں	یعنی ہماری جیب میں اک تار بھی نہیں
دل کو نیازِ حسرتِ دیدار کر چکے	دیکھا تو ہم میں طاقتِ دیدار بھی نہیں
ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے	دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں
بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں	طاقت بہ قدرِ لذتِ آزار بھی نہیں

منزل پر پہونچ جانے سے فنا فی اللہ کا مرتبہ حاصل ہو جاتا ہے اور یہی موحد کا ایمان ہے ١٢
لہ اس شعر میں مشکلات کی کثرت کا اندازہ صرف حقیقی یعنی ان کے آسان ہو جانے سے کیا گیا ہے اور
ایک امر واقعہ کو نہایت خوبی سے بیان کیا ہے۔ مطلب ظاہر ہے ١٢ لہ مرزا غالب کے اس شعر کا
مطلب لکھنے میں سب نے قریب قریب ممکن الوقوع اور ناممکن الوقوع کی بحث کی ہے یہاں تک
کہ مولانا حالی نے بھی یادگارِ غالب میں یہی معنے نہیں بیان کیے رشک اور ہجر کا مضمون کسی کے
ذہن میں نہیں گزرا جیسا کہ مندرجہ ذیل شرح سے جو خود مرزا نے اپنے ایک خط میں لکھی ہے ظاہر
ہوتا ہے۔ مرزا لکھتے ہیں "تیرا ملنا اگر آسان نہیں تو یہ امر مجھ پر آسان ہے۔ خیر تیرا ملنا آسان
نہیں نہ سہی نہ ہم مل سکیں گے نہ کوئی اور مل سکے گا۔ مشکل تو یہ ہے کہ وہی تیرا ملنا دشوار بھی نہیں
یعنی جس سے تو چاہتا ہے مل بھی سکتا ہے۔ ہجر کو تو ہم نے سہل سمجھ لیا تھا مگر رشک کو اپنے اوپر
آسان نہیں کر سکتے ١٢"

شوریدگی[1] کے ہاتھ سے ہے سر وبالِ دوش
صحرا میں اے خدا! کوئی دیوار بھی نہیں

گنجائشِ عداوتِ اغیار اک طرف
یاں دل میں ضعف سے ہوسِ یار بھی نہیں

ڈر نالہ ہائے زار سے میرے، خدا کو مان
آخر نوائے مرغِ گرفتار بھی نہیں

دل میں ہے یار کی صفِ مژگاں سے روکشی[2]
حالانکہ طاقتِ خلشِ خار بھی نہیں

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا؟
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

دیکھا اسدؔ کو خلوت و جلوت میں بارہا
دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں

نہیں ہے زخم کوئی بخیے کے درخور[3] مرے تن میں
ہوا ہے تارِ اشکِ یاس، رشتہ چشمِ سوزن میں

---

۱ شوریدگی:۔ دیوانگی ۱۲۔
۲ روکشی ۔ مقابلہ ۔ ایک شارح صاحب نے روکشی کو "روکسی" لکھ کر مطلب گڑھا ہے "روکشی" تمام نسخوں میں موجود ہے جس کے معنی مقابلے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ دل میں اگرچہ خلشِ خار کی بھی طاقت موجود نہیں ہے۔ لیکن یار کی صفِ مژگاں سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ باقی ہے ۱۲۔
۳ بخیے کے درخور: بخیے کے لائق:۔ مطلب یہ ہے کہ میرے تن میں کوئی زخم بخیے کے لائق نہیں ہے میرے زخموں کی حالت دیکھ کر سوئی کو یاس ہوئی تو اس کا تاگا تارِ اشکِ یاس بن گیا ۱۲۔

ہوئی ہے مانعِ ذوقِ تماشا خانہ ویرانی
کفِ سیلاب[۱] باقی ہے برنگِ پنبہ روزن میں

ودیعت[۲] خانۂ بیدادِ کاوش ہائے مژگاں ہوں
نگینِ نامِ شاہد ہے مرے ہر قطرہ خوں تن میں

بیاں کس سے ہو ظلمت گستری میرے شبستاں کی
شبِ مہ ہو جو رکھ دیں پنبہ دیواروں کے روزن میں[۳]

نکوہش[۴] مانعِ بے ربطیِ شورِ جنوں آئی
ہوا ہے خندۂ احباب بخیہ جیب و دامن میں

---

[۱] کفِ سیلاب: سیلاب کے جھاگ۔ اس سیلاب کے جھاگ جس سے خانہ ویرانی ہوئی دیوار کے سوراخوں میں باقی رہ گئے ہیں اور وہ جھانکنے کے مانع ہیں۔ چونکہ فصحا اکثر مسبّب کو سبب قرار دیتے ہیں۔ اس لیے شاعر نے اس موقع پر خانہ ویرانی کو مانعِ تماشا کہا ہے ۱۲

[۲] ہر قطرۂ خوں میرے تن میں ایک نگینہ ہے جس پر مژگانِ معشوق نے اس کا نام کھود دیا ہے اور میں گویا معشوق کی کاوشوں کے ظلم کا ودیعت خانہ بنا ہوا ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ میں اس کی کاوشوں کے ظلم کا امانت دار ہوں (یہ قاعدہ ہے کہ امانت پر مہر لگا دیتے ہیں) اور اسی لیے اس کو افشا نہیں کرتا ۱۲۔

[۳] شاعر کہتا ہے کہ میرے گھر میں اس قدر تاریکی ہے کہ اگر دیوار کے روزن میں پنبہ رکھ دیا جائے تو ایسا معلوم ہو کہ چاند نکل آیا ۱۲

[۴] ملامتِ احباب میرے جوشِ جنوں کو مانع ہوئی یعنی چونکہ احباب کے خیال سے میں نے جیب و دامن چاک نہیں کیا اس لیے ملامت کرنے والے احباب کا خندۂ دنداں نما بخیۂ گریباں ہو گیا۔ خندۂ دنداں نما کو بخیے سے جو نسبت ہے وہ ظاہر ہے ۱۲

ہوئے[1] اُس مہروش کے جلوۂ تمثال کے آگے
پَرافشاں جوہر آیئنے میں مثلِ ذرہ روزن میں

نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں۔ پر صحبت مخالف ہے
جو گل ہوں تو ہوں گلخن میں جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں

ہزاروں دل دیئے جوشِ جنونِ عشق نے مجھ کو
سیہ ہو کر سویدا ہو گیا۔ ہر قطرہ خوں۔ تن میں

اسد۔ زندانیِ تاثیرِ الفت ہائے خوباں ہوں
خمِ دستِ نوازش۔ ہو گیا ہے طوق۔ گردن میں

۱۱۴

مزے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں
سوائے خونِ جگر سو جگر میں خاک نہیں

مگر غبار ہوئے پر ہوا اُڑا لے جائے
وگرنہ تاب و تواں بال و پر میں خاک نہیں

یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے؟
کہ غیر جلوۂ گل رہگزر میں خاک نہیں

بھلا اُسے نہ سہی۔ کچھ مجھی کو رحم آتا
اثر مرے نفسِ بے اثر میں خاک نہیں

خیالِ جلوۂ گل سے خراب ہیں میکش
شراب خانے کے دیوار و در میں خاک نہیں

ہوا ہوں عشق کی غارتگری سے شرمندہ
سوائے حسرتِ تعمیر۔ گھر میں خاک نہیں

[1] اِس شعر کے نثر کر دینے سے اس کا مطلب سمجھ میں آجاتا ہے۔ اس مہروش کے جلوۂ تمثال کے آگے جوہر آئینہ میں (اس طرح) پرافشاں ہوئے (جس طرح) ذرے روزن میں (شعاع آفتاب سے) اُڑتے ہیں ۱۲

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسدؔ
کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

۱۱۳

دل ہی تو ہے۔ نہ سنگ و خشت۔ درد سے بھر نہ آئے کیوں ؟
روئیں گے ہم ہزار بار۔ کوئی ہمیں ستائے کیوں ؟

دیر نہیں۔ حرم نہیں۔ در نہیں آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم۔ غیر ہمیں اٹھائے کیوں ؟

جب وہ جمالِ دل فروز صورتِ مہرِ نیم روز
آپ[1] ہی ہو نظارہ سوز۔ پردے میں منہ چھپائے کیوں ؟

دشنۂ غمزہ جاں ستاں۔ ناوکِ ناز بے پناہ
تیرا ہی عکسِ رُخ سہی۔ سامنے تیرے آئے کیوں ؟

قیدِ حیات و بندِ غم۔ اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی۔ غم سے نجات پائے کیوں ؟

حُسن[2] اور اُس پہ حُسنِ ظن۔ رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں ؟

[1] نظارہ سوز: جس کا نظارہ نہ ہو سکے ۱۲

[2] بوالہوس: ہوسناک۔ رقیب کی طرف اشارہ ہے۔ دوسرے مصرعہ میں لفظ غیر سے بھی رقیب مراد ہے۔ مرزا نے اپنے ایک خط میں اس شعر کو الفاظ ذیل میں صاف کر دیا ہے: "حسن عارض اور حسن ظن دو صفتیں محبوب میں جمع ہیں یعنی صورت اچھی ہے اور گمان اس کا صحیح ہے کبھی

واں وہ غرورِ عزّ و ناز۔ یاں یہ حجابِ پاسِ وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں؟ بزم میں وہ بلائے کیوں؟

ہاں وہ نہیں خدا پرست۔ جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز اُس کی گلی میں جائے کیوں؟

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا؟ کیجیے ہائے ہائے کیوں؟

(۱۱۴)

غنچۂ ناشگفتہ کو۔ دور سے مت دکھا۔ کہ یوں
بوسے کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں؟

پرسشِ طرزِ دلبری کیجیے کیا؟ کہ بن کہے
اُس کے ہر اک اشارے سے نکلے ہے یہ ادا کہ یوں

رات کے وقت مے پیے۔ ساتھ رقیب کو لیے
آئے وہ یاں خدا کرے۔ پر نہ کرے خدا کہ یوں

"غیر سے رات کیا بنی" یہ جو کہا۔ تو دیکھیے
سامنے آن بیٹھنا۔ اور یہ دیکھنا۔ کہ یوں

خطا نہیں کرتا اور یہ گمان اُس کو اپنی نسبت ہے کہ میرا مارا ابھی بچتا نہیں اور میرا تیر غمزہ خطا نہیں کرتا۔ پس جب اُس کو ایسا بھروسہ ہے تو رقیب کا امتحان کیوں کرے۔ اس حسنِ ظن نے رقیب کی شرم رکھ لی ورنہ رقیب عاشقِ صادق نہ تھا۔ اگر پالے امتحان درمیان آتا تو خفیف نکل جاتی ۱۲

بزم میں۔ اُس کے روبرو۔ کیوں نہ خموش بیٹھیے

اُس کی تو خامشی میں بھی ہی یہی مدعا کہ یوں

میں نے کہا کہ "بزمِ ناز چاہیئے غیر سے تہی"

سُن کے ستم ظریف[1] نے مجھ کو اُٹھا دیا کہ یوں

مجھ سے کہا جو یار نے "جاتے ہیں ہوش کس طرح؟

دیکھ کے میری بیخودی چلنے لگی ہوا کہ یوں

کب مجھے کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی؟

آئینہ دار بن گئی حیرتِ نقشِ پا کہ یوں

گر ترے[2] دل میں ہو خیال۔ وصل میں شوق کا زوال؟

موجِ محیطِ آب میں مارے ہی دست و پا کہ یوں

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشکِ فارسی

گفتۂ غالبؔ ایک بار پڑھ کے اُسے سنا کہ یوں

[1] ستم ظریف وہ شخص جو ظرافت کے پردہ میں ستم کرے (معشوق کی طرف اشارہ ہی)
[2] شاعر معشوق سے مخاطب ہو کر کہتا ہی کہ اگر تیرے دل میں یہ خیال ہو کہ وصل میں شوق کیوں کم ہو جاتا ہی تو تجھے موجِ بحر کو دیکھنا چاہیئے کہ وہ وصلِ بحر سے علیحدہ ہو کر کنارے پہنچنے کے لیے دست و پا مار رہی ہی ۱۲

ردیف و

۱۱۵

حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرمِ تماشا[1] ہو
کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

بقدرِ حسرتِ دل چاہیے ذوقِ معاصی بھی
بھروں[2] یک گوشۂ دامن گر آبِ ہفت دریا ہو

اگر وہ سرو قد گرمِ خرامِ ناز آ جاوے
کفِ[3] ہر خاکِ گلشن شکلِ قمری نالہ فرسا ہو

۱۱۶

کعبے میں جا رہا تو نہ دو طعنہ کیا کہیں
بھولا ہوں حقِ صحبتِ اہلِ کنشت کو ؟

---

[1] گرمِ تماشا ہو:- یعنی دنیا کو دیکھ۔ چشمِ تنگ حاسد کی صفات میں سے ہے۔ حاسد ہمیشہ تنگ چشم اور تنگ دل ہوتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ جس قدر انسان کو دنیا کا تجربہ ہوگا اسی قدر وسیع النظر ہوگا اور وسیع النظری اور فراخدلی ہی مرض حسد کا علاج ہے۔ اس شعر میں علمِ اخلاقِ انسانی کا نقشہ کھینچا گیا ہے ۱۲

[2] بھروں:- آلودہ کروں۔ آبِ ہفت دریا سے کثرتِ معاصی کی طرف اشارہ ہے۔ تردامن اصطلاحِ فارسی میں گنہگار کو کہتے ہیں ۱۲

[3] کفِ ہر خاک:- یعنی ہر کفِ خاک ۱۲

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو۔ کوئی لیکر بہشت کو

ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسمِ ثواب سے؟
ٹیڑھا لگا ہی قط قلم سرنوشت کو

آئی اگر بلا تو جگر سے نہیں ٹلی
ابرا ہی دیکھے ہم نے بچایا ہی کشت کو

غالب کچھ اپنی سعی سے لہنا نہیں مجھے
خرمن جلے۔ اگر نہ ملخ کھائے کشت کو

وارستہ اس سے ہیں۔ کہ محبت ہی کیوں نہو
کیجے ہمارے ساتھ۔ عداوت ہی کیوں نہ ہو؟

لہ اس شعر میں غالب نے اپنے فلسفیانہ مسلک کا اظہار کیا ہی کہ اگر جنت کا اعتقاد مٹ جائے تو پرہیزگاروں میں زیادہ خلوص پیدا ہو جائے اور اُن کی عبادت کی محرک حور اور شراب طہور کی آرزو نہ رہے ۱۱ ؎ یعنی تقدیر میں یہ لکھا ہی کہ ثواب کے رستہ پر نہ چلیں ۱۱ ؎ یہ شعر تمام دیوانوں میں ہی۔ مولانا حالی نے جس نسخہ سے یادگار غالب میں مرزا کے اردو اشعار منتخب کیے ہیں اس میں بھی تھا۔ اس شعر میں مرزا نے اپنے استقلال کا ذکر کیا ہی۔ ابرا دینا شطرنج کا ایک محاورہ ہی جب بادشاہ کو کشت آتی ہو اور کوئی مناسب خانہ اس کی چال کے لیے نہیں ہوتا تو کسی دوسرے مہرے کو اس کشت کے بچانے کے واسطے رکھ دیتے ہیں تاکہ بادشاہ کو حجاب ہو جائے اسی کو ابرا دینا کہتے ہیں اور بعض جگہ ادو بدا یا یہ وب یا ابراب بھی کہتے ہیں کشت بھی شطرنج کا محاورہ ہی جب چال چلتے چلتے بادشاہ کسی ایسے خانہ میں آ جائے جہاں پر فریق مخالف کی چال سے نہ صفحہ

چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگ اختلاط کا
ہے دل پہ بار نقشِ محبت ہی کیوں نہ ہو

ہے مجھ کو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلہ
ہر چند بر سبیلِ شکایت ہی کیوں نہ ہو

"پیدا ہوئی ہے" کہتے ہیں "ہر درد کی دوا"
یوں ہو تو چارۂ غمِ الفت ہی کیوں نہ ہو؟

ڈالا[۱] نہ بیکسی نے کسی سے معاملہ
اپنے سے کھینچتا ہوں خجالت ہی کیوں نہ ہو؟

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو؟

ہنگامۂ[۲] زبونیِ ہمت ہے انفعال
حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

تو اس کو کشت پڑنا کہتے ہیں۔ ہندی میں کشت مصیبت یا وقت پڑنے کو کہتے ہیں معلوم ہوتا کہ اسی ہندی لفظ سے شطرنج والوں نے یہ محاورہ لیا ہے۔ کیونکہ تحقیق یہی ہے کہ شطرنج کا کھیل اول اول ہندوستان ہی میں ایجاد ہوا تھا۔ فارسی لغات میں کشت کے متعلق لکھا ہے کہ یہ لفظ قسط کو بگاڑ کر بنا لیا گیا ہے۔ قسط بمعنی عدل کے ہیں اور چونکہ شطرنج کا بادشاہ عدل نہیں رکھتا اس کے لیے قسط کا لفظ استعمال کرنا نامناسب سمجھ کر ایک مہمل لفظ کشت گھڑ دیا گیا ہے تاکہ عدل پر دلالت نہ کرے لیکن ہمیں یہ توجیہہ پسند نہیں بلکہ قرین قیاس یہی ہے کہ سنسکرت لفظ "کشٹ" سے کشت بنا ہے ۱۲۔

[۱] یہ میری بیکسی کا احسان ہے کہ مجھے کسی کا ممنونِ احسان ہونا نہیں پڑا اپنے سے کھینچتا ہوں یعنی اپنے سے حاصل کرتا ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ خجالت بھی مجھے دوسروں کی نہیں اٹھانا پڑی۔ بلکہ اگر خجالت بھی ہے تو اپنے ہی سے تو ہے ۱۲

[۲] منفعل ہونا یعنی دوسروں کا اثر قبول کر لینا۔ بوئی ہمت یعنی کم ہمتی ہے۔

وارستگی، بہانۂ بیگانگی نہیں
اپنے سے کر، نہ غیر سے وحشت ہی کیوں نہ ہو[1]؟
مٹتا ہی فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کوئی[2]
عمرِ عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو؟

اُس فتنہ خو کے در سے اب اُٹھتے نہیں اسدؔ
اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

۱۱۸

قفس[3] میں ہوں، گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو
مرا ہونا بُرا کیا ہی نوا سنجانِ گلشن کو؟

اس لیے زمانہ کے آثار و حوادث سے بھی عبرت نہ حاصل کر کیونکہ یہ بھی پستی ہمتی اور عجز کی دلیل ہے مطلب یہ ہے کہ تو اپنے کیرکٹر اور اخلاق کو اس قدر اعلیٰ درجہ کا بنالے کہ دنیا کے کسی واقعہ سے تجھے عبرت حاصل کرنے کی ضرورت ہی نہ رہے ۱۲

[1] یہ شعر بھی اعلیٰ درجہ کا اخلاقی شعر ہے شاعر کہتا ہے کہ آزادی اس کا نام نہیں ہے کہ ترکِ تعلقات کر کے لوگوں سے وحشت کرنے لگے اگر وحشت کرتا ہے تو اپنے نفس سے وحشت کر نہ کہ غیر سے یعنی خودی چھوڑ دے ۱۲

[2] عبادت کا جو نتیجہ ہے اُس سے کچھ اور بڑھ کر بھی انسان حاصل کر سکتا ہے۔ پھر محض عبادت میں اگر زندگی کو صرف کر دیا جائے تو اُس کا غم دل سے کیونکر جا سکتا ہے ۱۲

[3] شاعر کہتا ہے کہ میں تو قفس میں ہوں اور نوا سنجانِ گلشن آزاد ہیں اس لیے لطفِ چمن میں ان کا حصہ دار نہیں بن سکتا۔ میں قفس میں بند پڑا ہوا نالے کرتا ہوں اور وہ آزادی میں نواسنجی یعنی ترانۂ مسرت گاتے ہیں اور میرے یہ نالے عرفانِ چمن کے لیے نقصان رساں نہیں بلکہ میرے نالوں سے کچھ نہ کچھ ان کے چمن کی رونق ہی ہے ۱۲۔

نہیں گر ہمدمی آساں نہ ہو یہ رشک کیا کم ہے؟
نہ دی ہوتی خدایا آرزوئے دوست دشمن کو

نہ نکلا آنکھ سے تیری اک آنسو اس جراحت پہ
کیا سینے میں جس نے خوں چکاں مژگانِ سوزن کو

خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں
کبھی میرے گریباں کو کبھی جاناں کے دامن کو

ابھی ہم قتل گہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں
نہیں دیکھا شناور جوئے خوں میں تیرے توسن کو

ہوا چرچا جو میرے پاؤں کی زنجیر بننے کا
کیا بیتاب کاں میں جنبشِ جوہر نے آہن کو

خوشی کیا کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آوے
سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈے ہے ابھی سے برق خرمن کو

وفاداری بہ شرطِ استواری اصلِ ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

شہادت تھی مری قسمت میں۔ جو دی تھی یہ خو مجھ کو
جہاں تلوار کو دیکھا جھکا دیتا تھا گردن کو

نہ لٹتا دن کو۔ تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا۔ دعا دیتا ہوں رہزن کو

سخن کیا کہہ نہیں سکتے؟ کہ جویاں ہوں جواہر کے
جگر کیا ہم نہیں رکھتے؟ کہ کھودیں جا کے معدن کو

مرے شاہ سلیماں جاہ سے نسبت نہیں غالب
فریدون و جم و کیخسرو و داراب و بہمن کو

۱۱۹

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیم تن کے پانو
رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پانو

دی سادگی سے جان۔ پڑوں کوہکن کے پانو
ہیہات! کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پانو

بھاگے تھے ہم بہت سو اسی کی سزا ہے یہ
ہو کر اسیر دابتے ہیں راہزن کے پانو

مرہم کی جستجو میں پھرا ہوں جو دور دور
تن سے سوا فگار ہیں۔ اس خستہ تن کے پانو

اللہ رے ذوقِ دشت نوردی کہ بعدِ مرگ
ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پانو

ہے[1] جوشِ گل بہار میں یاں تک کہ ہر طرف
اُڑتے ہوئے اُلجھتے ہیں مرغِ چمن کے پانو

شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں
دُکھتے ہیں آج اُس بتِ نازک بدن کے پانو

غالبؔ مرے کلام میں کیونکر مزا نہ ہو
پیتا ہوں دھو کے خسروِ شیریں سخن کے پانو

۱۲۰

واں اُس کو ہولِ دل ہے تو یاں میں ہوں شرمسار
یعنی یہ میری آہ کی تاثیر سے نہ ہو

اپنے کو دیکھتا نہیں ذوقِ ستم تو دیکھ
آئینہ تاکہ دیدۂ نخچیر[2] سے نہ ہو

[1] مرغ چمن یعنی پرندہ تو بال و پر سے اُڑتا ہے پھر پاؤں اُلجھنا کیسا لیکن یہ کنایہ ہے انتہا کی طرف
باغ میں اس قدر جوشِ گل اور بہار ہے کہ جو مرغانِ چمن اُس پر سے گزرتے ہیں اُن کا دل آگے
بڑھنے کو نہیں چاہتا اور وہ وہیں گر پڑتے ہیں ۱۲

[2] نخچیر یعنی شکار جیسے آہو وغیرہ۔ مطلب یہ ہے کہ اُس کا ذوقِ ستم تو دیکھیے کہ جب دیدۂ نخچیر کا آئینہ
نہ ہو وہ اپنے کو نہیں دیکھتا یعنی دیدۂ نخچیر کے آئینہ کے سوا وہ اپنی صورت کسی دوسرے آئینہ میں
دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ یہ انتہا ہے ذوقِ ستم ہے تاکہ ۔ حبیب تک ۱۲ ۔

۱۲۱

واں پہنچ کر جو غش آتا پئے ہم[1] ہے ہم کو
صد رہ آہنگ زمیں بوس قدم ہے ہم کو

دل کو میں اور مجھے دل محو وفا رکھتا ہے
کس قدر ذوق گرفتاری ہم[2] ہے ہم کو

ضعف سے نقش پئے مور ہے طوق گردن
ترے کوچے سے کہاں طاقت رم ہے ہم کو

جان کر کیجے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو
یہ نگاہ غلط انداز تو سم ہے ہم کو

رشک[3] ہم طرحی و درد اثر بانگ حزیں
نالۂ مرغ سحر تیغ دو دم ہے ہم کو

سر اڑانے کے جو وعدے کو مکرر چاہا
ہنس کے بولے کہ "ترے سر کی قسم ہے ہم کو"

دل کے خوں کرنے کی کیا وجہ؟ ولیکن ناچار
پاس بے رونقی دیدہ اہم ہے ہم کو

تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو
ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو

ق

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی
ہوس سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو

مقطع سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر
عزم سیر نجف و طوف حرم ہے ہم کو

---

[1] پیہم یعنی متواتر۔ اگر یہ لفظ بلا اضافت بولا جائے تو اس کا املا پیہم صحیح ہوگا۔ اس شعر میں مرزا نے اس لفظ کا استعمال اضافت کے ساتھ کیا ہے کیوں کہ فارسی میں اضافت کے ساتھ اور بلا اضافت دونوں طرح آیا ہے لیکن آج کل اردو کا محاورہ یہی ہے کہ بلا اضافت بولتے ہیں۔ صد رہ: سو بار۔ شاعر کہتا ہے کہ معشوق کے کوچہ میں پہنچ کر جو مجھے متواتر غش آتا ہے تو اس کا یہ مقصد ہوتا ہے کہ سو طرح سے اپنے قدموں کی زمیں بوسی کروں گویا۔ انھیں قدموں کی بدولت کوچۂ محبوب نصیب ہوا ۱۲

[2] گرفتاری ہم یعنی گرفتاری غم و پیچ۔ ہمّ عربی لفظ ہے جس میں میم مشدد ہے لیکن اردو میں بلا تشدید مستعمل ہے ۱۲

[3] مصرعۂ اول میں ہم طرحی اور درد و اثر دونوں مل کر لفظ رشک کے مضاف ہیں۔ بس اسی نکتہ کے سمجھنے سے سارا شعر سمجھ میں آجاتا ہے ۱۲

[4] "ترے سر کی قسم ہے ہم کو" اس جملے کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ۔ ہمیں تیرے سر کی قسم ہے ہم ضرور سر اڑا دیں گے۔ دوسرے یہ کہ ہم کو تیرے سر کی قسم ہے ہم کبھی سر نہ اڑائیں گے۔ جیسے کہتے ہیں کہ آپ کو تو ہمارے یہاں آنے کی قسم ہے۔ یعنی کبھی ہمارے یہاں نہیں آتے ۱۲۔

لیے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب
جادۂ رہ کشش کاف کرم ہے ہم کو

۱۲۴

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

بچتے نہیں مواخذۂ روز حشر سے
قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو

کیا[1] وہ بھی بے گنہ کش و حق ناشناس ہیں
مانا کہ تم بشر نہیں خورشید و ماہ ہو

ابھرا ہوا نقاب میں ہے ان کے ایک تار
مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست
لیکن خدا کرے وہ ترا جلوہ گاہ ہو

غالب بھی گر نہ ہو تو کچھ ایسا ضرر نہیں
دنیا ہو یا رب اور مرا بادشاہ ہو

۱۲۴

گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیوں کر ہو
کہے سے کچھ نہ ہوا پھر کہو تو کیوں کر ہو

ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال
کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیوں کر ہو

ادب ہے اور یہی کشمکش تو کیا کیجے
حیا ہے اور یہی گومگو تو کیوں کر ہو

تمہیں کہو کہ گزارا صنم پرستوں کا
بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو تو کیوں کر ہو

[1] مصرعہ اول میں ضمیر "وہ" مصرعہ ثانی کے الفاظ خورشید و ماہ کی طرف راجع ہے۔ ۱۲

اُلجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ[1] — جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیوں کر ہو

جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا — وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیوں کر ہو

ہمیں پھر اُن سے اُمید اور اُنہیں ہماری قدر — ہماری بات ہی پوچھیں نہ وہ تو کیوں کر ہو

غلط نہ تھا ہمیں خط پر گماں تسلی کا — نہ مانے دیدۂ دیدار جو تو کیوں کر ہو

بتاؤ اُس مژہ کو دیکھ کر ہو مجھ کو قرار — یہ نیش ہو رگِ جاں میں فرو تو کیوں کر ہو

مجھے جنوں نہیں غالب ولے بقول حضور[2]
فراقِ یار میں تسکین ہو تو کیوں کر ہو

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو؟ [۱۲۴]
نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو؟

لہ یہ شعر بھی اُن اشعار میں سے ہے جن کے دو معنی مرزا نے لکھے ہیں۔ ایک تو صرف معنی یہ ہیں کہ تم جیسے نازک مزاج شہر میں دو ایک اور ہوں تو شہر کا خدا ہی نگہبان ہو۔ دوسرے معنی یہ ہیں جیسا تم کو آئینہ میں اپنا عکس دیکھنا گوارا نہیں تو شہر میں اگر تم جیسے دو ایک اور موجود ہوں تو تم کیا آفت برپا کردو ۱۲

عله یہ مصرعہ بادشاہ ظفر کا ہے مرزا نے بادشاہ کی فرمائش سے یہ غزل لکھی تھی ۱۲

کیا غمخوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو

نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا راز داں کیوں ہو؟

وفا کیسی؟ کہاں کا عشق؟ جب سر پھوڑنا ٹھہرا

تو پھر اے سنگ دل! تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو؟

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم

گری ہو جس پہ کل بجلی۔ وہ میرا آشیاں کیوں ہو؟

[1] یہ کہہ سکتے ہو؟ "ہم دل میں نہیں ہیں" پر یہ بتلاؤ

کہ جب دل میں تمہیں تم ہو۔ تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو؟

غلط ہے جذب دل کا شکوہ۔ دیکھو جرم کس کا ہے؟

نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو؟

[2] یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے؟

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو؟

یہی ہے آزمانا۔ تو ستانا کس کو کہتے ہیں؟

عدو کے ہو لیے جب تم۔ تو میرا امتحاں کیوں ہو؟

---

[1] پہلے مصرع میں استفہام انکاری ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ بات تم کہہ نہیں سکتے کہ تم میرے دل میں نہیں ہو یعنی کہنا پڑیگا کہ تم میرے دل میں ہو لیکن دریافت طلب یہ ہے کہ جب میرے دل میں تم اور صرف تم موجود ہو تو آنکھوں سے پوشیدہ ہونے کی کیا وجہ ہے ۱۲۔

[2] یہ فتنہ اشارہ ہے معشوق کے دوست ہو جانے کی طرف ۱۲۔

کہا تم نے۔ کہ "کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی"
بجا کہتے ہو۔ سچ کہتے ہو۔ پھر کہیو کہ "ہاں کیوں ہو"؟

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب؟
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

۱۲۵

رہیے اب ایسی جگہہ چل کر۔ جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار۔ تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور گر مر جایے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

ردیف ہ

طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئنہ	۱۲۶	[1] از مہر تا بہ ذرہ۔ دل و دل ہے آئنہ

[1] آفتاب سے لیکر ذرے تک ہر چیز دنیا میں دل کے مثل ہے اور دل بشکل آئنہ ہے یعنی گویا ہر طوطی کو ہر سمت سے آئنہ مقابل نظر آتا ہے۔ طوطی سے مراد انسان ہے جو شیدائے آئینہ دل ہے ۱۲۔

ہے سبزہ زار ہر در و دیوارِ غم کدہ[1]	۱۲۷	جس کی بہار یہ ہو پھر اس کی خزاں نہ پوچھ
ناچار[2] بے کسی کی بھی حسرت اٹھائیے		دشواریِ رہ و ستمِ ہمرہاں نہ پوچھ

ردیف ی

صد جلوہ رو برو ہے جو مژگاں اٹھائیے	۱۲۸	طاقت کہاں کہ دید کا ساماں اٹھائیے
ہے سنگ پر براتِ[3] معاشِ جنونِ عشق		یعنی ہنوز منتِ طفلاں اٹھائیے
دیوار بارِ منتِ مزدور سے ہے خم		اے خانماں خراب نہ احساں اٹھائیے
یا میرے زخمِ رشک کو رسوا نہ کیجیے		یا پردۂ تبسمِ پنہاں اٹھائیے

مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیے	۱۲۹	بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیے

[1] جیسے غم کدہ کے در و دیوار سبزہ زار بن گئے۔ یہ ظاہر ہے کہ در و دیوار پر سبزہ صرف اُسی وقت اُگتا ہے جب وہ بے توجہی اور بے مرمتی کی حالت میں ٹوٹ پھوٹ رہے ہوں۔ شاعر نے اس شعر میں اپنے غم خانہ کی حالت کی تصویر کھینچی ہے اور چونکہ سبزہ بہار میں اُگتا ہے اس لیے مصرعہ ثانی میں بھی اس ویرانی کو بہار کہہ کر آئندہ اس کے بد سے بدتر ہو جانے کا خیال ظاہر کیا ہے ۱۲۔

[2] منزلِ مقصود تک پہنچنے کا راستہ ایک تو یوں ہی دشوار گزار تھا پھر اس پر ساتھیوں نے یہ طرہ کیا ہے چونکہ ہمارے ساتھ ہم سفر جا رہے ہیں وہ ستم ہی کرنے والے کیوں نہ ہوں مگر جو ہیں اس لیے ہم اپنے کو بے کس بھی نہیں کہہ سکتے پس مجبوراً بے کسی کی حسرت اٹھاتے ہیں ۱۲۔

[3] برات: یعنی فرمان جس کے بموجب خزانہ سے روپیہ ملے۔ مطلب یہ ہے کہ جنونِ عشق کے لیے نشانۂ سنگِ طفلاں ہونا لازمی ٹھہرا ہے اس لیے گویا جنون میں بھی لڑکوں کی منت کشی کے بغیر مفر نہیں ۱۲۔

عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک اور شخص پر
آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے

دے داد اے فلک دلِ حسرت پرست کی
ہاں کچھ نہ کچھ تلافیِ مافات چاہیے

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

ہے رنگِ لالہ و گل و نسریں جدا جدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

ق

سر پائے خم پہ چاہیے ہنگامِ بیخودی
رو سوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیے

یعنی بحسبِ گردشِ پیمانۂ صفات
عارف ہمیشہ مستِ مئے ذات چاہیے

نشو و نما ہے اصل سے غالب فروع کو
خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیے

بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے بہ اندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے
تکلف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

خیالِ مرگ کب تسکیں دلِ آزردہ کو بخشے
مرے دامِ تمنا میں ہے اک صیدِ زبوں وہ بھی

نہ کرتا کاش نالہ۔ مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم
کہ ہوگا باعثِ افزائشِ دردِ دروں وہ بھی

ذرا اتنا بُرش تیغِ جفا پر ناز فرماؤ ❊
مرے دریائے بیتابی میں ہی اک موجِ خوں بھی

ہی عشرت کی خواہش ساقیِ گردوں سے کیا کیجیے
لیے بیٹھا ہی اک دو چار جامِ واژگوں[۱] وہ بھی

مرے دل میں ہی غالبؔ شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں
خدا وہ دن کرے جو اُس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

۱۳۱

ہی بزمِ بتاں میں سخن آزردہ لبوں سے
تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں[۲] سے

ہی دورِ قدح وجہ پریشانیِ صہبا
یک بار لگا دو خُمِ مے میرے لبوں سے

رندانِ درِ میکدہ گستاخ ہیں زاہد
زنہار نہ ہونا طرف[۳] اِن بے ادبوں سے

[۱] جامِ واژگوں:۔ اوندھا پیالا ۱۲
[۲] خوشامد طلبوں سے معشوق کی طرف اشارہ ہی۔ مطلب یہ ہی کہ معشوق کی خوشامد کرتے کرتے سخن لبوں سے آزردہ ہی۔ یعنی خوشامد کی حد ہو گئی اب بات کرنے کو جی نہیں چاہتا ۱۲

[۳] طرف ہونا:۔ پرانا محاورہ ہی۔ بمعنی منہ لگنا ۱۲

لے لے داد وفا دیکھ کہ جاتی رہی آخر[1]
ہرچند مری جان کو تھا ربط لبوں سے

۱۳۲
تا ہم کو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا
سُن لیتے ہیں گو ذکر ہمارا نہیں کرتے

غالبؔ ترا احوال سُنا دیں گے ہم اُن کو
وہ سُن کے بُلا لیں یہ اجارا نہیں کرتے

۱۳۳
گھر میں تھا کیا؟ کہ ترا غم اُسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے

۱۳۴
غمِ دُنیا[2] سے گر پائی بھی فرصت سر اُٹھانے کی
فلک کا دیکھنا۔ تقریب تیرے یاد آنے کی

[1] جاتی :۔ جانِ جاتی۔ جان کو لبوں سے ربط تھا یعنی جان لبوں پر رہا کرتی تھی ۱۲
[2] جب دُنیا کے غم سے چھٹکارا ملتا ہے تو فلک پر نظر جا پڑتی ہے اور چونکہ فلک بھی ستمگر مشہور ہے اور تو بھی ظالم ہے اس لیے قدرتی طور پر فلک کو دیکھتے ہی تیری یاد آتی ہے اور تیری جدائی کا غم تازہ ہو جاتا ہے ۱۲۔

کھلے[1] گا کس طرح مضموں مرے مکتوب کا یا رب!
قسم کھائی ہو اُس کافر نے کاغذ کے جلانے کی
لپٹنا پرنیاں[2] میں شعلۂ آتش کا آساں ہو
ولے مشکل ہو حکمت۔ دل میں سوزِ غم چھپانے کی
اُنھیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا
اُٹھے تھے سیرِ گل کو۔ دیکھنا۔ شوخی بہانے کی
ہماری سادگی تھی۔ التفاتِ ناز پر مرنا
ترا آنا نہ تھا۔ ظالم مگر تمہید جانے کی
لکدکوبِ[3] حوادث کا تحمل کر نہیں سکتی
مری طاقت کہ ضامن تھی بتوں کے ناز اٹھانے کی

---

[1] خط کے جلانے سے میرے سوزِ غم کا حال معشوق پر ظاہر ہو جاتا تھا۔ لیکن اب چونکہ اس خط کا جلانا بھی موقوف کر دیا ہو اس لیے میرا مطلب حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس شعر کا دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہو کہ عشاق اپنے خطوط خفیہ طور پر تحریر کرنا پسند کرتے ہیں جس سے افشائے راز کا خوف باقی نہ رہے اور اس لیے وہ کسی ایسی روشنائی کو استعمال کرتے ہیں جس کے حروف بادی النظر میں نمایاں نہ ہوں لیکن آگ کو دکھاتے ہی پڑھنے میں آجائیں پیاز کا عرق بھی اس مطلب کے لیے استعمال کیا جاتا ہو۔ اُس کے لکھے ہوئے حروف کاغذ کو آگ پر رکھتے ہی روشن ہو جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہو کہ شاعر بھی ہمیشہ اسی روشنائی سے اپنے معشوق کو خط لکھا کرتا تھا اور معشوق اُس کو آگ پر رکھ کر پڑھ لیا کرتا تھا۔ لیکن اب چونکہ معشوق نے کاغذ کے جلانے کی قسم کھائی ہو اس لیے اُسے فکر ہو کہ اب معشوق پر اُس کے خط کا مطلب کس طرح واضح ہو گا۔

[2] پرنیاں: باریک ریشمی کپڑا۔ بہت جلد آگ کو پکڑ لیتا ہو۔

[3] لکدکوب: لاتیں مارنا۔

کہوں کیا خوبیِ اوضاعِ ابنائے زماں غالب
بدی کی اُس نے جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی

۱۲۵

حاصل[1] سے ہاتھ دھو بیٹھ اے آرزو خرامی
دل جوشِ گریہ میں ہے ڈوبی ہوئی اسامی

اُس شمع کی طرح سے جس کو کوئی بجھا دے
میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغِ[2] ناتمامی

۱۲۶

کیا تنگ ہم ستم[3] زدگاں کا جہان ہے
جس میں کہ ایک بیضۂ مور آسمان ہے

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے
پرتو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہے

حالاں کہ ہے یہ سیلیِ خارا[4] سے لالہ رنگ
غافل کو میرے شیشے پہ مے کا گمان ہے

---

[1] حاصل :- بمعنی محصول - ہاتھ دھو بیٹھ - نا اُمید ہو جا - آرزو خرامی سے مراد خرام حسبِ آرزو ہے - اسامی جمع الجمع ہے اسم کی لیکن اُردو میں یہ لفظ بمعنی کاشتکار بطور مفرد استعمال ہوتا ہے ڈوبی ہوئی اسامی اُس کاشتکار کو کہتے ہیں جو آفات ارضی یا سماوی سے برباد ہو جائے اور مالک آراضی کو اس سے لگان وصول ہونے کی امید باقی نہ رہے - مطلب یہ ہے کہ اے آرزو اس سے کوئی ایسا نتیجہ حاصل نہ ہوگا کہ اپنے حسبِ مراد خرام کر سکوں - کیونکہ جوشِ گریہ نے دل کو ڈوبی ہوئی اسامی بنا دیا ہے یعنی اثر سے مایوس کر دیا ہے ۱۲

[2] میں داغ - ناتمامی ہوں - یعنی مجھے اپنے ناتمام رہ جانے کا داغ ہے ۱۲

[3] مطلب یہ ہے کہ ہم اس قدر ستم زدہ ہیں کہ چیونٹی کا ایک بے حس و حرکت انڈا بھی ہم پر ظلم کرنے کو آسمان بنا ہوا ہے ۱۲ -

[4] سیلیِ خارا - ضربِ سنگ :- اگر اس شعر میں سیلیِ خارا کو حوادث کے تھپیڑوں اور شیشہ کو شیشۂ دل سے تعبیر کیا جائے تو مطلب صاف ہو جاتا ہے ۱۲ -

کی اُس نے گرم سینۂ اہلِ ہوس میں جا
آوے نہ کیوں پسند؟ کہ ٹھنڈا مکان ہے

کیا خوب[۱] تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا؟
بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے

بیٹھا ہے جو کہ سایۂ دیوارِ یار میں
فرماں روائے کشورِ ہندوستان ہے

ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا
کس سے کہوں کہ داغ جگر کا نشان ہے

[۲]
ہے بارے اعتمادِ وفاداری اس قدر
غالب ہم اس میں خوش ہیں کہ نامہرباں ہے

۱۴۰

[۳]
درد سے میرے ہے تجھ کو بے قراری ہائے ہائے
کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ
تو نے پھر کیوں کی تھی میری غم گساری ہائے ہائے

کیوں مری غم خوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال
دشمنی اپنی تھی میری دوستداری ہائے ہائے

[۱] "ہمارے بھی منہ میں زبان ہے" اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ ہمارے پاس ایسے ثبوت موجود ہیں کہ اگر ہم بولنے پر آئیں تو قائل کر دیں دوسرے معنی یہ ہیں کہ اگر ہم چاہیں تو زبان سے چکھ کر یہ بتا دیں کہ غیر نے بوسہ لیا یا نہیں ۱۲

[۲] اس شعر کا مطلب صاف ہے شاعر کہتا ہے کہ ہمارا معشوق اس لیے ہم پر نامہربان ہے کہ اس کو ہماری وفاداری پر بھروسہ ہے اور یہ ہماری خوشی کا سبب ہے ۱۲

[۳] یہ پوری غزل معشوق کی وفات پر بطور مرثیہ لکھی گئی ہے ۱۲

عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا؟
عمر کو بھی تو نہیں ہے پائداری ہائے ہائے

زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی
یعنی تجھ سے تھی اسے ناسازگاری ہائے ہائے

گل فشانی ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا؟
خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے

شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں
ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے

خاک میں ناموسِ پیمانِ محبت مل گئے
اٹھ گئی دنیا سے راہ و رسمِ یاری ہائے ہائے

ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا
دل پہ اک لگنے نہ پایا زخمِ کاری ہائے ہائے

کس طرح کاٹے کوئی شب ہائے تارِ برشکال
ہے نظر خو کردۂ اختر شماری ہائے ہائے

گوش مہجورِ پیام و چشم محرومِ جمال
ایک دل تس پر یہ ناامیدواری ہائے ہائے

عشق نے پکڑا نہ تھا غالب ابھی الفت کا رنگ
رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری ہائے ہائے

ہر گشتگی میں عالمِ ہستی سے یاس ہے ۔ ۱۳۸ ۔ تسکیں کو دے نوید کہ مرنے کی آس ہے

ل لیتا نہیں مرے دلِ آوارہ کی خبر ۔ اب تک وہ جانتا ہے کہ میرے ہی پاس ہے

کیجے بیاں سرورِ تپِ غم کہاں تلک ۔ ہر مو مرے بدن پہ زبانِ سپاس ہے

ع ہے وہ غرورِ حسن سے بیگانۂ وفا ۔ ہر چند اُس کے پاس دلِ حق شناس ہے

ت پی جس قدر ملے شبِ مہتاب میں شراب ۔ اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے

ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسدؔ
مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے

ث گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے ۔ ۱۳۹ ۔ خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

ش کس کو سناؤں حسرتِ اظہار کا گلہ ۔ دل فردِ جمع و خرجِ زباں ہائے لال ہے

ل میرے ہی پاس ہے یعنی عاشق کے پاس ہے ۱۲

ع دلِ حق شناس سے خود عاشق کا حق شناس دل مراد ہے جو معشوق نے لے لیا ہے

ت اس شعر میں شبِ ماہ کے ساتھ بلغمی مزاج کو اس رعایت سے باندھا ہے کہ شبِ ماہ کے مزاج کو بھی مرطوب کہا جاتا ہے ۱۲

ث اگر خاموشی سے یہ فائدہ ہے کہ حالِ دل ظاہر نہیں ہوتا تو میں خوش ہوں کہ میرا بولنا بھی خاموشی کے برابر ہے کیونکہ میرا کلام کسی کی سمجھ میں نہیں آتا ۱۲

ش شاعر کہتا ہے کہ میں اپنے بیانِ حال کی حسرت کا شکوہ کس کے سامنے کروں میرا دل گونگی زبانوں کے جمع و خرج کی فرد یعنی اُن اجابت کے شکووں کا دفتر بنا ہوا ہے جو نہ سُنتے ہیں نہ جواب دیتے ہیں ۱۲

کس پردے میں ہے آئنہ پرداز اے خدا
رحمت کہ عذر خواہ لب بے سوال ہے

ہے ہے خدا نخواستہ وہ اور دشمنی!
اے شوق منفعل یہ تجھے کیا خیال ہے؟

مشکیں لباس کعبہ علی کے قدم سے جان
ناف زمیں ہے نہ کہ ناف غزال ہے

وحشت پہ میری عرصۂ آفاق تنگ تھا
دریا زمین کو عرق انفعال ہے

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

تم اپنے شکوے کی باتیں نہ کھود کھود کر پوچھو
حذر کرو مرے دل سے کہ اس میں آگ دبی ہے

دلا یہ درد و الم بھی تو مغتنم ہے کہ آخر
نہ گریۂ سحری ہے نہ آہ نیم شبی ہے

لہ اس شعر میں آئنہ پرداز کی فاعل رحمت ہے اور رحم کی تشریح ہے۔ اے خدا تیری رحمت کس پردے میں آئنہ پرداز (یعنی اپنی آرائش میں مصروف) ہے کہ لب بے سوال عذر خواہ ہے کہ میں نے سوال اب تک کیوں نہ کیا۔۱۲

عہ لباس کعبہ کو مشکیں اس کے غلاف سیاہ کی نسبت سے کہا اور یہ رعایت بھی ملحوظ ہے کہ جس طرح سے مشک کی خوشبو پھیلتی ہے اسی طرح کعبہ کی برکت دنیا میں پھیل رہی ہے۔ دوسرے مصرع میں مشکیں کی رعایت سے ناف غزال کا لفظ استعمال کیا ہے مطلب یہ ہے کہ کعبہ کی برکت جو مشک کی طرح دنیا میں پھیل رہی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ امیر المومنین حضرت علی اس میں پیدا ہوئے ہیں ۱۲

ایک[1] جا حرفِ وفا لکھا تھا وہ بھی مٹ گیا
ظاہرا کاغذ ترے خط کا غلط بردار ہے

جی[2] جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں
ہم نہیں جلتے نفس ہر چند آتش بار ہے

آگ[3] سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا
ہر کوئی درماندگی میں نالے سے ناچار ہے

ہے[4] وہی بدمستیِ ہر ذرہ کا خود عذر خواہ
جس کے جلوے سے زمیں تا آسماں سرشار ہے

مجھ سے مت کہہ "تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی"
زندگی سے بھی مرا جی ان دنوں بیزار ہے

آنکھ کی تصویر سرنامہ پہ کھینچی ہے کہ تا
تجھ پہ کھل جاوے کہ اس کو حسرتِ دیدار ہے

---

[1] غلط بردار اس کاغذ کو کہتے ہیں جس پر سے بآسانی حروف اٹھا لیے جائیں اور کاغذ پر اس کا نشان باقی نہ رہے مگر یہاں اور اس شعر میں غلط بردار کے معنی اس چیز کے لیے ہیں جس پر سے حروف خود بخود اڑ جائیں ۱۲

[2] اس شعر میں مرزا نے مسئلہ دورانِ خون کی شرح لکھی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہر نفس سینہ میں اشتعال پیدا کرتا ہے اور وہی اشتعال انسانی زندگی کے قیام کا باعث ہے گویا فطرتاً ہر انسان ذوقِ فنا رکھتا ہے۔ لیکن شاعر اپنے ذوقِ فنا کو ناقص بتا کر کہتا ہے کہ اس پر ہمارا جی جلتا ہے کہ ہم باوجود اپنے نفس کی آتشباری کے یکبارگی جل کر فنا نہیں ہو جاتے ۱۲ [3] ناچار ہے فارسی محاورہ از نالہ چارہ ندارد کا ترجمہ ہے۔ یعنی آگ جس کی خاموشی مسلّم ہے وہ درماندگی میں چیخ اٹھتی ہے ۱۲ [4] اس شعر میں اعلیٰ درجہ کا تصوف بھرا ہوا ہے ذرہ کے رقص کو بدمستی سے تعبیر کیا ہے۔ عذر خواہ یعنی معافی چاہنے والا یا عذر رکھنے والا مطلب یہ ہے

بہ نعش ہیں گزرتے ہیں جو کوچے سے وہ میرے	۱۴۲	کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

۱۴۳

مری ہستی فضائے حیرت آبادِ تمنا ہے[1]

جسے کہتے ہیں نالہ وہ اسی عالم کا عنقا ہے

خزاں کیا؟ فصلِ گل کہتے ہیں کس کو کوئی موسم ہو؟

وہی ہم ہیں قفس ہے۔ اور ماتم بال و پر کا ہے

وفائے دلبراں ہے اتفاقی۔ ورنہ اے ہمدم!

اثر فریادِ دل ہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے؟

نہ لائی شوخیِ اندیشہ تابِ رنجِ نومیدی[2]

کفِ افسوس ملنا عہدِ تجدیدِ تمنا ہے

کہ قدرتِ عالم یعنی ممکنات جو فی الواقع معدوم محض ہیں ان کی ہستی و عظمت کا عذر خواہ وہی ہے جس کے پرتو وجود سے تمام اشیاء معدوم وجود کا دم بھرتی ہیں ۱۲

ا اس شعر میں سوا کندھا بدلنے کے محاورے کے کوئی تخیل نہیں ہے بدلنے کے ساتھ کندھا بدلتے ہیں اور دینے کے ساتھ کا کندھا خیال کے اعتبار سے یہ شعر کلامِ غالب کے پایہ سے گرا ہوا ہے ہمارے دیوان میں صرف یہی ایک شعر ایسا ہے ۱۲

ٹ شاعر نے اپنی ہستی کو حیرت آباد تمنا کی فضا اور چونکہ حیرت کے عالم میں انسان کے منہ سے آواز نہیں نکل سکتی اس لیے نالے کو اس نے عالمِ حیرت کا عنقا قرار دیا ہے مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی تمنا میں ایسا محو ہے کہ نالہ تک منہ سے نہیں نکل سکتا ۱۲

ٹ شاعر کہتا ہے کہ میری فکر کی شوخی سے ناامیدی اور مایوسی کا صدمہ نہیں اٹھ سکا۔ اگر ناامیدی کے بعد کفِ افسوس بھی ملا تو وہ گویا تجدیدِ تمنا کا پیمان ہو گیا یعنی جس حسرت کا افسوس کیا پھر اسی کی تمنا کی۔ عاشق کی انتہائے بوالہوسی کا بیان ہے۔ کفِ افسوس ملنے کے ساتھ تجدید عہدِ تمنا کہنا اس لیے بھی زیادہ پر لطف ہو گیا ہے کہ عہد باندھنے کے وقت ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہیں ۱۲

عشق مجھ کو نہیں۔ وحشت ہی سہی! ۔۔۔ میری وحشت۔ تری شہرت ہی سہی

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے! ۔۔۔ کچھ نہیں ہے۔ تو عداوت ہی سہی

میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی؟ ۔۔۔ اے وہ[1] مجلس نہیں خلوت ہی سہی

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے ۔۔۔ غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

[2]اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو ۔۔۔ آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

عمر ہر چند کہ ہے برقِ خرام ۔۔۔ دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں؟ ۔۔۔ نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی

کچھ تو دے اے فلکِ نا انصاف ۔۔۔ آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے ۔۔۔ بے نیازی تری عادت ہی سہی

یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ
گر نہیں وصل۔ تو حسرت ہی سہی

لہ "اے وہ" یہ دلّی کا محاورہ ہے اور مرزا داغ کے وقت تک پایا جاتا ہے۔ داغ فرماتے ہیں
سہ اے وہ دشنام سہی خلعت و عزت نہ سہی ۔ جو عطا غیر کو ہو وہ مجھے امداد نہ ہو"۔ بعض شارحین کا غالب کے اس محاورہ پر اعتراض کرنا رکاکت ہے ۱۲۔

لہ یہ شعر حقیقتاً مرزا کے اُن اشعار میں سے جو سہل ممتنع سمجھے جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے ارباب معنی ایسے اشعار کے ادراک کی طرف توجہ نہیں فرماتے۔ واقعی یہ شعر حقیقت عرفانی کا ایک آئینہ ہے اور تصوّف کے ایک بڑے مسئلہ کو مرزا نے اس میں حل کیا ہے۔ یہ دفعہ مولوی علی احمد خاں صاحب اسیر بدایونی نے اس کا مطلب اس طرح ادا کیا ہے۔ اپنی ہستی سے آگاہی کا تعلق حدیث نبوی (من عرف نفسہ فقد عرف ربہ) کے موافق عرفان الٰہی کا زینہ ہے اور اپنی ہستی سے غافل ہونا بھی تمام احادیث اور اقوال صوفیہ کے موافق وحدت الوجودی کا اعلیٰ پایہ ہے

غیرؔ[1] کو۔ یارب وہ کیونکر منع گستاخی کرے
گر حیا بھی اُس کو آتی ہو۔ تو شرما جائے ہی

شوق کو یہ لت کہ ہر دم نالہ کھینچے جائیے
دل کی وہ حالت کہ دم لینے سے گھبرا جائے ہی

دورِ چشمِ بد۔ تری بزمِ طرب سے واہ واہ!
نغمہ ہو جاتا ہی واں۔ گر نالہ میرا جائے ہی

گرچہ ہی طرزِ[2] تغافل پردہ دارِ رازِ عشق
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہی

اُس[3] کی بزم آرائیاں سُن کر۔ دلِ رنجور یاں
مثلِ نقشِ مدعائے غیر۔ بیٹھا جائے ہی

ہو کے عاشق وہ پری رُخ۔ اور نازک بن گیا
رنگ کھُلتا جائے ہی۔ جتنا کہ اُڑتا جائے ہی

---

[1] بظاہر حیا آنا اور شرما جانا ایک ہی بات معلوم ہوتی ہی لیکن شاعر نے ان دونوں لفظوں کو ایک ہی مصرعہ میں جمع کر کے کمال شاعرانہ نزاکت کا اظہار کیا ہی مطلب یہ ہی کہ اگر اس کو غیر کی گستاخی اور خواہش بیجا سے حیا بھی آتی ہو تو وہ اس کے ساتھ تکرار کرنے سے شرما جاتا ہی ۱۲

[2] طرزِ تغافل۔ یعنی عاشق کا تغافل جو پردہ دارِ عشق کی غرض سے برتا جائے شاعر کہتا ہی کہ ہم اپنے معشوق کے سامنے اس طرز سے رہتے ہیں کہ اُس پر ہمارا عشق افشا نہ ہو (یہی عاشق کا تغافل ہی) لیکن ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں (یعنی از خود رفتہ ہو جاتے ہیں) کہ وہ فوراً ہمارے عشق کو تاڑ جاتا ہی [3] "بیٹھا جائے ہی" کے اس شعر میں دو معنے دکھائے گئے ہیں۔ نقشِ مدعا کا بیٹھنا یعنی مطلب بر آنا۔ دل بیٹھنا۔ مایوس ہونا یا بسبب بے طاقتی۔ گر ہر دو مذکر معنی زیادہ قرین قیاس اور با محاورہ ہیں۔ ۱۲

نقش کو اُس کے مُصوّر پر بھی کیا کیا ناز ہیں!
کھینچتا ہے جس قدر ۵۰ اتنا ہی کھنچتا جائے ہے

	سایہ میرا مجھ سے مثلِ دود بھاگے ہے اسدؔ پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے	

۵۱ گرمِ فریاد رکھا شکلِ نہالی نے مجھے تب اماں ہجر میں دی بردِ لیالی نے مجھے	۱۵۲	۵۲ نسیہ و نقدِ دو عالم کی حقیقت معلوم لے لیا مجھ سے مری ہمتِ عالی نے مجھے کثرت آرائی وحدت ہے پرستاری وہم کر دیا کافر ان اصنامِ خیالی نے مجھے ہوسِ گُل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا عجب آرام دیا بے پر و بالی نے مجھے
۵۳ کارگاہِ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے	۱۵۳	برقِ خرمنِ راحت خونِ گرمِ دہقاں ہے

۵۰ کھینچا جائے ہے، اکڑا جاتا ہے (بوجہ ناز) ۱۲

۵۱ شکلِ نہالی کو دیکھ کر مجھے معشوق کی یاد آگئی اور میں گرمِ فریاد ہوگیا۔ اور اس گرمیِ فریاد کے سبب سے مجھے شب ہائے ہجر کی سردی سے امان ملی ۱۲

۵۲ مطلب یہ ہے کہ میری ہمت اس قدر بلند ہے کہ اس نے نقدِ دنیا و نسیۂ عقبیٰ کے عوض میں مجھے فروخت کرنا گوارا نہ کیا اس لیے میں اپنی ہمتِ عالی کے پاس رہا یعنی عالی ہمتی کے سبب میرا رتبہ دونوں عالم سے بالاتر ہے ۱۲

۵۴ مرزا نے شعر ۱۵۱ اور اس کے بعد کے دو شعروں کی شرح لکھتے ہوئے عودِ ہندی میں لکھا ہے کہ ابتدائے فکرِ سخن میں بیدل و اسیر و شوکت کے طرز پر ریختہ لکھتا تھا چنانچہ ایک غزل کا مقطع یہ تھا۔ طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا ۔ اسد اللہ خاں قیامت ہے۔

غنچۂ تا شگفتن ہا برگِ عافیت معلوم
باوجودِ دلجمعی خوابِ گل پریشاں ہے

ہم سے رنجِ بیتابی کس طرح اٹھایا جائے؟
داغِ پشتِ عجز شعلۂ خس بدنداں ہے

۱۵۴
اُگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالبؔ
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

۱۵۵
سادگی پر اس کی مرجانے کی حسرت دل میں ہے
بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے

پندرہ برس کی عمر سے پچیس برس کی عمر تک مضامینِ خیالی لکھا کیا دس برس میں بڑا دیوان جمع ہو گیا آخر جب تمیز آئی تو اس دیوان کو دور کیا۔ اوراق یک قلم چاک کیے دس پندرہ شعر واسطے نمونہ کے دیوان حال میں رہنے دیئے" یہ تینوں شعر بھی انھیں دس پندرہ اشعار میں سے ہیں جن کی طرف سطور بالا میں اشارہ کیا گیا ہے۔ ان کا مطلب مرزا نے ایک خط میں جو مولوی عبدالرزاق شاکر کے نام عودِ ہندی میں چھپا ہے اس طرح لکھا ہے:۔ کارگاہِ ہستی میں لالہ داغ سامانِ نمو ہے مثلِ انجمن وہ شخص کہ داغ جس کا سرمایہ و سامان ہے۔ وجود بیتاب لالہ کی نخم نولش داغ پر ہے وہ نہ رنگ تو اور پھولوں کا بھی لال ہوتا ہے پھر یہ سمجھ لیجیے کہ پھول کا درخت یا تخم جو بویا جاتا ہے دہقان کو جوتنے بونے پانی دینے میں مشقت کرنی پڑتی ہے اور یا ضت میں لہو گرم ہو جاتا ہے مقصود شاعر کا یہ ہے کہ وجود محض رنج و عنا ہے مزارع کا وہ لہو جو کشت و کار میں گرم ہوتا ہے وہی لالے کی ناحیہ کے خرمن کا برق ہے۔ حاصل موجودیت داغ اور داغ مخالف راحت اور ضرورتِ رنج (۲) غنچۂ تا شگفتن کا جب نئی نکلے بصورتِ قلب صنوبری نظر آئے اور جب تک پھول بنے برگِ عافیت معلوم یہاں معلوم یعنی معدوم ہے اور برگِ عافیت یعنی مایۂ آرام "مصرعہ" برگِ عیشے بگورِ خویش فرست برگ اور سرو برگ یعنی سازو سامان خوابِ گل و تخصیص گل باعتبار خموشی دیرجا ماندگی پریشانی ظاہر ہے یعنی شگفتگی وہی پھول کی پنکھڑیوں کا بکھرا ہوا ہونا غنچہ بصورتِ دل جمع ہے۔ باوصفِ جمعیتِ دل گل کی خواب پریشاں ہے ۱۲ (شعر سویم) ہم سے رنج الخ ۔ پشتِ دست صورتِ عجز اور

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

گرچہ[1] ہے کس کس بُرائی سے ولے با ایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اُس محفل میں ہے

بس ہجومِ نااُمیدی خاک میں مل جائے گی
یہ جو اک لذت ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے

رنج[2] رہ کیوں کھینچیے واماندگی کو عشق ہے
اُٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم منزل میں ہے

جلوہ زارِ آتشِ دوزخ ہمارا دل سہی
فتنۂ شورِ قیامت کس کی آب و گل میں ہے

خس بہ دنداں و کاہ بہ دنداں گرفتن بھی اظہارِ عجز ہے یعنی جس عالم میں کہ دماغ نے پشت زمین پر رکھ دی ہے اور رشتہ نے تنکا دانتوں میں لیا ہے ہم سے رنج و اضطراب کا تحمل کس طرح ہو، مطلب یہ ہے کہ اس رنج کے برداشت کرنے کی ہم میں تاب و طاقت نہیں ہے اور یہ ہمیں ہلاک کر دے گا ۱۲۔

[1] یہ خیال جس کو غالب نے اس شعر میں ادا کیا ہے کوئی نیا خیال نہیں ایک پیش پا افتادہ خیال ہے چنانچہ ایک فارسی شاعر شرف قزوینی فرماتے ہیں ؎ ہست صد منت بجاں از غیبت بدگو مرا
چوں بہ ایں تقریب می آرد بیاد او مرا۔ لیکن غالب کی چست بندش اور روانی نے ایک ایسے خیال کے اظہار میں جو ہر شخص کے دماغ میں آ سکتا ہے کمال کر دکھایا ہے۔ غالب نے اپنی موجودگی پر اپنے ذکر کی ترجیح ثابت کر دی ہے جو فارسی شعر میں نہیں ہے ۱۲

[2] شاعر کہتا ہے کہ واماندگی کو ہمارے قدم سے عشق ہو گیا ہے اور اس وجہ سے ہمارا جو قدم منزل کے راستہ میں ہے (منزل سے راہِ منزل مراد ہے) آگے نہیں بڑھ سکتا اور اس لیے ہم رستے کی تکلیف کیوں اٹھائیں

ہے[1] دلِ شوریدۂ غالبؔ طلسمِ پیچ و تاب
رحم کر اپنی تمنا پر۔ کہ کس مشکل میں ہے

۵۲

دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

شق ہو گیا ہے سینہ۔ خوشا لذتِ فراغ
تکلیفِ پردہ داریِ زخمِ جگر گئی

وہ[2] بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اُٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

اُڑتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں
بارے اب اے ہوا ہوسِ بال و پر گئی

دیکھو[3] تو دل فریبیِ اندازِ نقشِ پا
موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

نظارہ[4] نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

[1] غالب نے اس شعر میں معشوق سے اپنے ارمان نکالنے کی درخواست نہایت انوکھے طریقے سے کی ہے وہ کہتا ہے کہ غالب کا شوریدہ دل جس میں تیری تمنا پھنسی ہوئی ہے ایک پیچ و تاب کا طلسم ہے تو اپنی تمنا پر رحم کر اور میرا ارمان نکل جانے دے ۱۲

[2] بادۂ شبانہ سے جوانی مراد ہے اور سحر سے پیری کی طرف اشارہ ہے مطلب یہ ہے کہ بڑھاپے میں جوانی کی ہوس رکھنا بوالہوسی ہے ۱۲

[3] گل کترنا بمعنی شگوفہ چھوڑنا یعنی کوئی فساد کی بات کرکے آپ علیحدہ ہو جانا ۱۲

[4] شاعر معشوق کو مخاطب کرکے کہتا ہے کہ تیرے رخ پر پہنچ کر نگاہ ایسی مست و خود رفتہ ہوئی کہ دیکھنے والے لذتِ دید سے محروم ہو گئے ۱۲

——— ❊ ❊ ———

فردا و دی[1] کا تفرقہ یکبار مٹ گیا	کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی

مارا زمانے نے اسداللہ خاں تمہیں
وہ ولولے کہاں؟ وہ جوانی کدھر گئی؟

۱۵۷

تسکیں[2] کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے
حورانِ خلد میں تری صورت اگر ملے
اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعدِ قتل
میرے[3] پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے
ساقی گری[4] کی شرم کرو آج ورنہ ہم
ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جس قدر ملے

---

[1] دی بمعنی کل گزشتہ۔ فردا بمعنی کل آنے والا دن اور فردائے حشر سے بھی مراد لی جاتی ہے۔ قیامت گزرنا نہایت سختی گزرنا یا خود قیامت کا آجانا۔ مطلب یہ ہے کہ گزرے ہوئے کل جس وقت تم ہمارے پاس سے رخصت ہوئے ایسی خود فراموشی اور خود رفتگی ہوئی کہ آج اور کل (یعنی ماضی و استقبال) کی تمیز باقی نہ رہی ۱۲۔
[2] تسکیں کو ہم نہ روئیں: تسکین دل کا غم نہ کریں ۱۲
[3] میرے پتے سے: میرے دفن کے پتے سے ۱۲۔
[4] ساقی گری کی شرم کرو: جھکا کر پلا دو ۱۲

تجھ سے[1] تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم
میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا
فرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
جانا کہ اِک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

اے ساکنانِ کوچۂ دلدار دیکھنا!
تم کو کہیں جو غالبؔ آشفتہ سر ملے

	۱۵۰	
کوئی دن گر زندگانی اور ہے[2]		اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

---

[1] کچھ کلام نہیں = کچھ شکایت نہیں۔ سلام یعنی سلام شکوہ آمیز۔ اس شعر کا مطلب خود مرزا نے ایک خط میں لکھا ہے جو نہایت دلچسپ ہے ناظرین انھیں کے الفاظ میں اس کو ملاحظہ کریں "شاعر کو ایک قاعدے کی ضرورت ہوئی کہ ٹھکانا یہ کہ فلاں شہر میں معشوق پر عاشق نہ ہو جائے ایک دوست اس عاشق کا ایک شخص ہم زبان ملا اور اس نے عاشق سے کہا کہ یہ آدمی دشمن اور معتمد الیہ بھی ہوں کہ اپنی مرکبت ذکر یگا۔ خیر اُس کے ہاتھ خط بھیجا گیا۔ قضارا عاشق کا گمان صحیح ہوا۔ تو مکتوب الیہ کو دیکھ کر وارفتہ ہوگیا۔ کیسا خط کیسا جواب دیوانہ بن کپڑے پھاڑ جنگل کو چل دیا اب عاشق اس واقعے کے وقوع کے بعد ندیم سے کہتا ہے کہ غیب دان تو خدا ہے کسی کے باطن کی کیا خبر ہے۔ اے ندیم تجھ سے کچھ کلام نہیں لیکن اگر نامہ بر کہیں مل جائے تو اس کو میرا سلام کہیو کہیں صاحب تم کیا کیا دعویٰ عاشق نہ ہونے کے کر گئے تھے اور انجام کار کیا ہوا؟"

[2] مرزا اپنے ایک خط میں اس شعر کے متعلق لکھتے ہیں "اس میں کوئی اشکال نہیں جو لفظ ہیں وہی معنی ہیں۔ شاعر اپنا مقصد یوں بتاتا ہے کہ میں تنگ ہو کر کچھ کر دونگا۔ خدا جانے شہر میں یا نواح شہر میں تکیہ بنا کر فقیر ہو کر بیٹھ رہے یا دیس چھوڑ پردیس چلا جائے"

آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں؟[1]
سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے

بارہا دیکھی ہیں اُن کی رنجشیں
پر کچھ اب کے سرگرانی اور ہے

دے کے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر
کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے

قاطعِ اعمار[2] ہیں اکثر نجوم
وہ بلائے آسمانی اور ہے

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

۵۹

کوئی اُمید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

موت کا ایک دن معین ہے[3]
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

کیوں نہ چیخوں؟ کہ یاد کرتے ہیں
میری آواز گر نہیں آتی

[1] یہ گرمی کہاں: استفہام انکاری ہے ۱۲

[2] اعمار: جمع عمر۔ مطلب یہ ہے کہ نجوم کے ستاروں کے اثر سے بھی عمریں قطع ہو جاتی ہیں لیکن بلائے آسمانی اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ آسمان کے انتہائے ظلم کی طرف اشارہ ہے ۱۲

[3] دوسرے مصرعے میں نیند کے لفظ کو زور دے کر پڑھنے سے مطلب صاف ہو جاتا ہے ۱۲۔

داغِ[1] دل گر نظر نہیں آتا
بو بھی اے چارہ گر نہیں آتی؟

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

مرتے[2] ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی

کعبے کس منہ سے جاؤ گے۔ غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

۱۲۰

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے؟
آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں
کاش پوچھو کہ "مدعا کیا ہے؟"

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے؟

شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے؟
نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے؟

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟
ابر کیا چیز ہے؟ ہوا کیا ہے؟

ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمید
جو نہیں جانتے۔ وفا کیا ہے؟

---

[1] دوسرے مصرعہ میں استفہام انکاری ہے چارہ گر کی ناسمجھی پر تشنیع کی گئی ہے کہ اگر تجھے داغِ دل نظر نہیں آتا تو کیا بوئے سوختہ بھی نہیں آتی یعنی بوئے سوختہ تو ضرور آنا چاہیے ۱۲

[2] مصرعہ اوّل میں "مرتے ہیں" بمعنی دل و جان سے چاہتے ہیں آیا ہے۔ دوسرے مصرعہ کا مطلب یہ ہے کہ موت ہمارے پاس تک تو آتی ہے لیکن ہم پر اپنا عمل نہیں کرتی یعنی ہماری جان نہیں لیتی ۱۲

ہاں بھلا کر۔ تیرا بھلا ہوگا جان تم پر نثار کرتا ہوں	اور درویش کی صدا کیا ہے؟ میں نہیں جانتا دعا کیا ہے؟

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے؟

۱۶۱

کہتے تو ہو تم سب کہ بت غالیہ مو آئے
اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وہ آئے

ہوں کشمکش نزع میں ہاں جذب محبت
کچھ کہہ نہ سکوں پر وہ مرے پوچھنے کو آئے

ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم
آنا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں گو آئے

ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین
ہاں منہ سے مگر بادۂ دوشینہ[۱] کی بو آئے

جلاد[۲] سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے
ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس بھیس میں جو آئے

---

۱ بادۂ دوشینہ: رات کی پی ہوئی شراب ۱۲

۲ شاعر نے اس شعر میں اُس مسئلہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ سب [illegible] تکلیف خدا کی طرف سے ہے اس شعر کے مصرعہ ثانی میں عام دیوانوں میں "کیا" میں کا لفظ لکھا ہے مگر مولانا حالی نے اپنے مقدمہ میں "دیوان حالی" میں "بھیس" لکھا ہے۔

ہاں اہلِ طلب کون سُنے طعنۂ نایافت
دیکھا کہ وہ ملتا نہیں۔ اپنے ہی کو کھو آئے

اپنا نہیں وہ شیوہ۔ کہ آرام سے بیٹھیں
اُس در پہ نہیں بار۔ تو کعبہ ہی کو ہو آئے

کی ہم نفسوں نے اثرِ گریہ میں تقریر
اچھے رہے آپ اُس سے۔ مگر مجھ کو ڈبو آئے

اُس انجمنِ ناز کی کیا بات ہی غالب
ہم بھی گئے واں اور تری تقدیر کو رو آئے

۱۶۲

پھر کچھ اک دل کو بیقراری ہی
سینہ جویائے زخمِ کاری ہی

پھر جگر کھودنے لگا ناخن
آمدِ فصلِ لالہ کاری ہی

قبلۂ مقصدِ نگاہِ نیاز
پھر وہی پردۂ عماری ہی

ق
چشمِ دلّالِ جنسِ رسوائی
دل خریدارِ ذوقِ خواری ہی

وہی صد رنگ نالہ فرسائی
وہی صد گونہ اشکباری ہی

دل ہوائے خرامِ ناز سے پھر
محشرستانِ بیقراری ہی

جلوہ پھر عرضِ ناز کرتا ہی
روزِ بازارِ جاں سپاری ہی

صحیح معلوم ہوتا ہی ۱۲ — اثر گریہ: اثر گریہ کے باب میں مجھ کو ڈبو آئے: میری ذلت کرا آئے ۱۲
؎ روزِ بازار: بازار کا دن یعنی پیٹھ ۱۲

پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں — پھر وہی زندگی ہماری ہے

ق پھر کھلا ہے درِ عدالتِ ناز — گرم بازارِ فوجداری ہے

ہو رہا ہے جہان میں اندھیر — زلف کی پھر سرشتہ داری ہے

پھر دیا پارۂ جگر نے سوال — ایک فریاد و آہ و زاری ہے

پھر ہوئے ہیں گواہِ عشق طلب — اشک باری کا حکم جاری ہے

دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا — آج پھر اس کی روبکاری ہے

بےخودی بے سبب نہیں غالب
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

١٦٣

جنوں تہمت کشِ تسکیں نہ ہو۔ گر شادمانیؔ کی[1]
نمک پاشِ خراشِ دل ہے۔ لذت زندگانی کی

[1] شادمانی کی ۱۔ شادمانی حاصل کی۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر تھوڑی سی دیر کو دل نے خوشی حاصل کی تو اس سے ہمارے جنون پر تسکین حاصل کرنے کی تہمت نہیں لگ سکتی۔ کیونکہ اس عارضی خوشی نے تو زخم دل پر اور بھی نمک چھڑک دیا۔ شاعر نے اس شعر میں اس کلیہ کو نظم کیا ہے کہ تکلیف کی حالت میں اگر تھوڑی دیر کو راحت مل جائے تو انسان کو تکلیف اور راحت کے مقابلہ کرنے کا موقع مل جاتا ہے اور اس وجہ سے اُس کو تکلیف کا احساس اور بھی زیادہ ہو جاتا ہے ۱۲۔

×××

ل۱ کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعیِ آزادی
ہوئی زنجیر۔ موجِ آب کو۔ فرصت روانی کی

پس از مردن بھی دیوانہ زیارت گاہِ طفلاں ہے
شرارِ سنگ نے تربت پہ میری گُل فشانی کی

۱۴۳

ل۲ نکوہش ہے۔ سزا۔ فریادیِ بے دادِ دلبر کی
مبادا خندۂ دنداں نما ہو صبحِ محشر کی

رگِ ل۳ لیلیٰ کو۔ خاکِ دشتِ مجنوں۔ ریشگی بخشے
اگر بودے بجائے دانہ۔ دہقاں۔ نوکِ نشتر کی

ل۴ پرِ پروانہ۔ شاید بادبانِ کشتیِ مَے تھا
ہوئی مجلس کی گرمی سے روانی دورِ ساغر کی

ل۱ آزادی کیسی ہی کوشش کرے مگر ہستی سے آج کوئی آزاد نہیں ہو سکتا۔ مثلاً موجِ آب ہے کہ اس روانی سے بظاہر اُس کی آزادی کا خیال ہوتا ہے۔ لیکن فی الواقع اس کے پانوں میں زنجیر پڑی ہوئی ہے۔ شاعر نے اس کی مروں کو زنجیر سے نسبت دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا کے تعلقات کی کشاکش سے جس قدر آزاد ہونے کی کوشش کی جائے اتنی ہی گرفتاری بڑھتی جاتی ہے ۱۲۔ ل۲ نکوہش = ملامت۔ سرزنش ۱۲۔
ل۳ ریشگی بخشنا یعنی ریشہ دار کرنا۔ زخمی ہونا۔ اس شعر میں مصنف نے اس مشہور قصے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ لیلیٰ کی فصد کے ساتھ مجنوں کی فصد خود کھل گئی تھی مطلب یہ ہے کہ اگر خاکِ دشتِ مجنوں میں کسان دانے کی جگہ نشتر بوئے تو حسن و عشق کے اتحاد کا یہ اثر ہو کہ اُس سے رگِ لیلیٰ اُگے ۱۲۔ ل۴ جب مجلس گرم ہوتی ہے تو شمع جلتی ہے اور شمع کے لیے پروانہ کا ہونا لازمی ہے اور مجلس کی گرمی روانیِ ساغر کا سبب ہے اس لیے کشتیِ مَے کا بادبان پرِ پروانہ کو ٹھہرایا۔ نتیجہ یہ نکلا مجلس میں دورِ ساغر اور کشتیِ مَے پروانے ہی کی بدولت چلتی ہے ۱۲۔

کروں بیداد ذوقِ پرفشانی عرض - کیا قدرت ؟
کہ طاقت اڑ گئی - اڑنے سے پہلے میرے شہپر کی

کہاں تک روؤں اس کے خیمے کے پیچھے قیامت ہے
مری قسمت میں یارب کیا نہ تھی دیوار پتھر کی

بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے
جتنے زیادہ ہو گئے - اتنے ہی کم ہوئے

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے
اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے
یاں تک مٹے کہ آپ ہی اپنی قسم ہوئے

سختی کشانِ عشق کی پوچھے ہو کیا سزا
وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہوئے

تیری وفا سے کیا ہو تلافی ؟ کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

سلہ یہ شعر سہل ممتنع ہے - شاعر کہتا ہے کہ اڑنے سے پہلے ہی میرے شہپر کی قوت پرواز اڑ گئی (زائل ہو گئی) اب ذوق پرفشانی کی بیداد بیان سے باہر ہے کہ پھڑکنا چاہتا ہوں لیکن پھڑک نہیں سکتا - ۱۲

عہ جتنے زیادہ ہو گئے : جتنے ہم اپنی حد سے بڑھے - ۱۲

سلہ سخت قریب - زیادہ قریب - اس شعر میں شاعر نے انسان کی اس حالت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ آدمی نے جہاں ہوش سنبھالا اور تعلقات دنیوی میں پھنس گیا - ۱۲

سکہ شاعر اس شعر میں اپنی ہستی کی بے حقیقتی ظاہر کرتا ہے کہ وہ برائے نام صرف قسم کھانے کو ہے یعنی فی الواقع انسانی ہستی فنا کے برابر ہے - ۱۲

[1] اللہ ری تیری تندیٔ خو جس کے بیم سے	اجزائے نالہ دل میں مرے رزقِ ہم ہوئے
[2] اہلِ ہوس کی فتح ہے ترکِ نبردِ عشق	جو پاؤں اُٹھ گئے وہی اُن کے علم ہوئے
نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے	جو واں نہ کھنچ سکے سو وہ یاں آکے دم ہوئے

چھوڑی اسدؔ نہ ہم نے گدائی میں دل لگی
سائل ہوئے تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے

۱۶۶

[3] جو نہ نقدِ داغِ دل کی کرے شعلہ پاسبانی
تو فسردگی نہاں ہے بہ کمینِ بے زبانی
مجھے اس سے کیا توقع بہ زمانۂ جوانی
کبھی کودکی میں جس نے نہ سُنی مری کہانی

[1] رزقِ ہم = ایک دوسرے کا رزق ۱۲

[2] اہلِ ہوس رقیب۔ پاؤں اُٹھنا بھاگ جانا۔ علم ہوئے۔ فتح کا جھنڈا بن گئے ۱۲

[3] کہتے ہیں کہ شعلہ (شعلۂ محبت) جو میرے نقدِ داغِ دل کی محبت کا فرض ادا کرتا ہے (چونکہ داغ کو اشرفی سے مناسبت دیتے ہیں۔ اس لیے نقدِ داغِ دل کہا) اگر ایسا نہ کرے یعنی اُسے ٹھنڈا ہو جانے دے تو افسردگی اور خاموشی جو محرومی سے پیدا ہوئی ہو اُسے مٹا دے۔ بشعلہ کی رعایت سے بے زبانی کا لفظ کہا گیا ہے ۱۲

یُنہیں[1] دکھ کسی کو دینا نہیں خوب۔ ورنہ کہتا
کہ مرے عدو کو یارب! ملے میری زندگانی

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے[2]
اک شمع ہے دلیلِ سحر۔ سو خموش ہے

نے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال
مدت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے

مے نے کیا ہے حسنِ خود آرا کو بے حجاب
اے شوق یاں اجازتِ تسلیمِ ہوش ہے

گوہر کو عقدِ گردنِ خوباں میں دیکھنا
کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے

[3] دیدار، بادہ، حوصلہ، ساقی، نگاہ، مست
بزمِ خیال میکدۂ بے خروش ہے

---

[1] یُنہیں:- اس لفظ کا املا بعض یوں ہی اور بعض یونہی لکھتے ہیں وہ لوگ جو اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ جو بولا جائے وہی لکھا جائے "یُنہیں" لکھتے ہیں۔ اس کے معنی محاورے میں بے سبب کے ہیں ۱۲۔

[2] شبِ غم کا جوش:- اندھیرا ہی اندھیرا۔ اس شعر کی شرح بھی خود مرزا غالب ہی کر گئے ہیں جس کو ہم بجنسہ نقل کیے دیتے ہیں:-

"دوسرا مصرع خبر ہے پہلا مصرع مبتدا۔ شبِ غم کا جوش یعنی اندھیرا ہی اندھیرا (ظلمتِ غلیظ) مستولی سحر ناپیدا گویا خلق ہی نہیں ہوئی۔ ہاں دلیلِ صبح کی بود ہے۔ یعنی بجھی ہوئی شمع اس لیے کہ شمع و چراغ صبح کو بجھا دیا کرتے ہیں۔ لطف اس مضمون کا یہ ہے کہ جس شے کو دلیلِ صبح ٹھہرایا وہ خود دالِ سبب ہو منجملہ اسبابِ تاریکی کے۔ پس دیکھا چاہیے کہ جس گھر میں علامتِ صبح موجبِ ظلمت ہوگی وہ گھر کتنا تاریک ہوگا ۱۲۔ (از عودِ ہندی)

[3] محفلِ خیال کو ایک مے فروش نے مے کدہ کہہ کر اس کا نقشہ دکھایا ہے کہ وہاں دیدار شراب ہے حوصلہ ساقی ہے اور نگاہ مے خوار ہے۔ حوصلہ کو ساقی اس لیے کہا کہ تصورِ معشوق کی حالت میں عاشق کو اختیار ہے کہ بقدر اپنے حوصلے کے اپنی نگاہِ شوق کو شربتِ دیدار پلائے ۱۲

قطعہ

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل ¹
زنہار اگر تمھیں ہوسِ نائے و نوش ہے

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

ساقی بہ جلوہ دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

یا صبح دم جو دیکھیے آکر تو بزم میں
نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

۱۶۱

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی
امتحاں اور بھی باقی ہو تو یہ بھی نہ سہی

ملہ ہوا = خواہش۔ تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل = یعنی وہ نوجوان جنھیں خواہشاتِ نفسانی میں مبتلا ہوئے تھوڑا زمانہ گزرا ہے۔ زنہار کلمۂ تاکید ہے۔ نائے و نوش سے نَے کا سننا اور شراب کا پینا مراد ہے۔ اس قطعہ میں مصنف نے اپنا حال پیش کرکے نوجوانوں کو پرہیزگاری کی نصیحت کی ہے اور عیش دور روزہ کی حقیقت کا نقشہ دکھایا ہے ۱۲۔

خار خارِ المِ حسرتِ دیدار تو ہے
شوق گلچینِ گلستانِ تسلی نہ سہی

مے پرستاں۔ خمِ مے منہ سے لگائے ہی بنے
ایک دن گر نہ ہوا بزم میں ساقی نہ سہی

نفسِ قیس کہ ہے چشم و چراغِ صحرا
گر نہیں شمعِ سیہ خانۂ لیلیٰ نہ سہی

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

عشرتِ صحبتِ خوباں ہی غنیمت سمجھو
نہ ہوئی غالبؔ اگر عمرِ طبیعی نہ سہی

۱۶۹

عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے
کہ اپنے سائے سے۔ سر پاؤں سے ہے دو قدم آگے

قضا نے تھا مجھے چاہا خرابِ بادۂ الفت
فقط "خراب" لکھا۔ بس نہ چل سکا قلم آگے

غمِ زمانہ[1] نے جھاڑی نشاطِ عشق کی مستی
وگرنہ۔ ہم بھی اٹھاتے تھے لذتِ الم آگے

[1] جھاڑی نشاطِ عشق کی مستی: سب نشے اتار دیے۔ مطلب یہ ہے کہ جب سے دنیا کا غم ہمارے پیچھے لگ گیا ہے۔ ہم غمِ عشق کا مزہ بھول گئے ہیں۔

خدا کے واسطے۔ داد۔ اس جنونِ شوق کی دینا
کہ اُس کے در پہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے ہم آگے

یہ عمر بھر جو پریشانیاں اُٹھائی ہیں ہم نے
تمہارے آئیو۔ اے طرہ ہائے خم بہ خم آگے

دل و جگر میں پر افشاں جو ایک موجۂ خوں ہے
ہم اپنے زعم میں سمجھے ہوئے تھے اس کو دم آگے

قسم جنازے پہ آنے کی میرے کھاتے ہیں غالبؔ
ہمیشہ کھاتے تھے جو میری جان کی قسم آگے

شکوے کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے [۱]
یہ بھی مت کہہ۔ کہ جو کہیے تو گلا ہوتا ہے

پُر ہوں میں شکوے سے یوں راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑئیے۔ پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

گو سمجھتا نہیں۔ پر حسنِ تلافی دیکھو
شکوۂ جور سے سرگرمِ جفا ہوتا ہے

عشق کی راہ میں ہے چرخ مکوکب کی وہ چال [۲]
سست رو جیسے کوئی آبلہ پا ہوتا ہے

۱ے جب ہم معشوق سے اس کے جور کا شکوہ کرتے ہیں اگرچہ وہ سمجھتا نہیں مگر حسن تلافی قابل دید ہے کہ وہ ظلم پر اور بھی آمادہ ہو جاتا ہے ۱۲۔

۲ے چرخ مکوکب سے آسمان ستارہ دار۔ چرخ کو مکوکب کہہ کر اس کو آبلہ پا ظاہر کیا ہے اور ستاروں کو آبلوں سے تشبیہ دی ہے ۱۲

کیوں نہ ٹھہریں ہدفِ ناوکِ بیداد کہ ہم
آپ اُٹھا لاتے ہیں۔ گر تیر خطا ہوتا ہی

خوب تھا پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ
کہ بھلا چاہتے ہیں اور بُرا ہوتا ہی

نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا۔ اور اب
لب تک آتا ہی۔ جو ایسا ہی رسا ہوتا ہی

ق

خامہ میرا کہ وہ ہی بار بد[1] بزمِ سخن
شاہ کی مدح میں یوں نغمہ سرا ہوتا ہی

اے شہنشاہِ کواکب سپہ و مہرِ علم
تیرے اکرام کا حق کس سے ادا ہوتا ہی

سات اقلیم کا حاصل جو فراہم کیجے
تو وہ لشکر کا ترے۔ نعل بہا[2] ہوتا ہی

ہر مہینے میں جو یہ بدر سے ہوتا ہی ہلال
آستاں پر ترے۔ مہ ناصیہ سا ہوتا ہی

میں جو گستاخ ہوں آئینِ غزل خوانی میں
یہ بھی تیرا ہی کرم۔ ذوق فزا[3] ہوتا ہی

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہی

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ "تو کیا ہی"
تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہی؟

نہ شعلے میں یہ کرشمہ۔ نہ برق میں یہ ادا
کوئی بتاؤ کہ وہ شوخِ تند خو کیا ہی؟

[1] باربد۔ یہ ایران کے ایک مشہور گانے والے کا نام ہی ۱۲۔
[2] نعل بہا۔ وہ روپیہ جو ایک بادشاہ دوسرے بادشاہ کو اس غرض سے ادا کرے کہ وہ اس کے ملک سے اپنی فوج کو واپس لے جائے ۱۲۔
[3] ذوق فزا۔ ذوق بڑھانے والا۔ یہ لفظ یہاں پر ذو معنی ہی۔ بادشاہ ظفر اپنے اُستاد "ذوق" کو اکثر موقعوں پر غالب سے بڑھایا کرتے تھے معمولی معنی کے سوا اس طرف بھی اشارہ ہی ۱۲

یہ رشک ہی کہ وہ ہوتا ہی ہم سخن تم سے
وگرنہ خوفِ بد آموزیِ عدو کیا ہی؟

چپک رہا ہی بدن پر لہو سے پیراہن
ہماری جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہی؟

جلا ہی جسم جہاں، دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ، جستجو کیا ہی؟

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہی؟

وہ چیز جس کے لیے ہم کو ہو بہشت عزیز
سوائے بادۂ گلفامِ مشکبو کیا ہی؟

پیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار
یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہی؟

رہی نہ طاقتِ گفتار، اور اگر ہو بھی
تو کس امید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہی؟

ہوا ہی شہ کا مصاحب، پھرے ہی اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہی؟

۱۷۲

میں انھیں چھیڑوں، اور کچھ نہ کہیں
چل نکلتے جو مے پیے ہوتے

قہر ہو یا بلا ہو، جو کچھ ہو
کاش کے تم مرے لیے ہوتے

میری قسمت میں غم اگر اتنا تھا
دل بھی یارب کئی دیے ہوتے

آ ہی جاتا وہ راہ پر غالب
کوئی دن اور بھی جیے ہوتے

۱۷۳

آہ کہ مری جان کو قرار نہیں
طاقتِ بیدادِ انتظار نہیں ہی

دیتے ہیں جنت حیاتِ دہر[1] کے بدلے
نشہ بہ اندازۂ خمار نہیں ہے

گریہ نکالے ہے تیری بزم سے مجھ کو
ہائے کہ رونے پہ اختیار نہیں ہے

ہم سے عبث ہے گمانِ رنجشِ خاطر
خاک میں عشاق کی غبار نہیں ہے

دل سے اٹھا لطف[2] جلوہ ہائے معانی
غیرِ گل آئینۂ بہار نہیں ہے

قتل کا میرے عہد تو کیا ہے بارے
وائے! اگر عہد استوار نہیں ہے

تو نے قسم مئے کشی کی کھائی ہے غالب
تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے

ہجومِ غم سے یاں تک سرنگونی مجھ کو حاصل ہے
کہ تارِ دامن و تارِ نظر میں فرق مشکل ہے

رفوئے زخم سے مطلب ہے لذت زخمِ سوزن کی
سمجھیو مت کہ پاسِ درد سے دیوانہ غافل ہے

---

[1] حیاتِ دہر میں شاعر نے اُن تکلیفوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو انسان کو اس دنیا کی زندگی میں اٹھانا پڑتی ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ ان سخت تکلیفوں کے بدلے جنت کا ملنا انسان کے حق میں ایسا ہے جیسے کسی کو بیماری کی زیادہ تکلیف اٹھانے کے بعد تھوڑی سی شراب مل جائے ۱۲

[2] لطف اُٹھا: لطف حاصل کر۔ اس شعر میں شاعر نے بہار کی ناپائداری کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دل سے جلوہ ہائے معانی کا مزہ یعنی لطفِ سخن حاصل کر (جو بے خزاں ہے) کیونکہ آئینۂ بہار میں گل کے سوا اور کچھ نہیں ہے اور گل کی ناپائداری ظاہر ہے ۱۲

وہ گل جس گلستاں میں جلوہ فرمائی کرے غالب
چٹکنا غنچۂ دل کا صدائے خندۂ دل ہے

۱۶۵

پا بہ دامن ہو رہا ہوں۔ بس کہ میں صحرا نورد
خارِ پا ہیں جوہرِ آئینۂ زانو مجھے
دیکھنا۔ حالت مرے دل کی ہم آغوشی کے وقت
ہے نگاہِ آشنا۔ تیرا سرِ ہر مو مجھے
ہوں سراپا سازِ آہنگِ شکایت کچھ نہ پوچھ
ہے یہی بہتر کہ لوگوں میں نہ چھیڑے تو مجھے

۱۶۶

جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے[1]
جاں کالبدِ صورتِ دیوار میں آوے
سائے کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر
تو اُس قدِ دلکش سے جو گلزار میں آوے
تب نازِ گراں مائگی رشک بجا ہے
جب لختِ جگر دیدۂ خوں بار میں آوے

[1] گفتار میں آوے فارسی محاورہ کا ترجمہ ہے۔ اُردو میں نہیں بولتے۔ اس کے معنی ہیں بات چیت کرے ۱۲۔

دے مجھ کو شکایت کی اجازت کہ ستمگر!
کچھ تجھ کو مزہ بھی مرے آزار میں آوے

اس چشمِ فسوں گر کا اگر پائے اشارہ
طوطی کی طرح آئنہ گفتار میں آوے

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی۔ پیاس سے یارب
اک آبلہ پا وادیِ پُر خار میں آوے

مرجاؤں نہ کیوں رشک سے؟ جب وہ تنِ نازک
آغوشِ خمِ حلقۂ زنّار میں آوے

غارت گرِ ناموس نہ ہو گر ہوسِ زر
کیوں شاہدِ گل باغ سے بازار میں آوے

تب چاکِ گریباں کا مزہ ہی دلِ نالاں
جب اِک نفس اُلجھا ہوا ہر تار میں آوے

آتش کدہ ہی سینہ مرا۔ رازِ نہاں سے
اے وائے! اگر معرضِ اظہار میں آوے

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

حُسنِ مہ۔ گرچہ بہ ہنگامِ کمال اچھا ہی

اُس سے میرا مہِ خورشید جمال اچھا ہی

بوسہ دیتے نہیں۔ اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ
جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

اور بازار سے لے آئے۔ اگر ٹوٹ گیا[1]
ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

بے طلب دیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے
وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے

اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق[2]
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

دیکھیے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض؟
ایک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

ہم سخن تیشے نے فرہاد کو شیریں سے کیا
جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال اچھا ہے

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے
کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے

خضر سلطاں کو کرے خالقِ اکبر سرسبز[3]
شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن[4]
دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

[1] اس شعر کی نسبت کہا جا سکتا ہے کہ اس کا ماخذ عرفی کا یہ شعر ہے ؎ کہ لازم ہست بادہ کشیدن ز جام زر ؛ مقصود تو گر نیست تصور سفال چیست"۔ لیکن غالب کے یہاں ساغرِ جم اور جامِ سفال کا مقابلہ کر کے جامِ سفال کو جس طریقہ سے مرجح ثابت کیا گیا ہے وہ عرفی کے یہاں نہیں ہے ۱۲

[2] مثنوی تبریزی شاعر نے قریب قریب اسی خیال کو فارسی میں یوں ادا کیا ہے ؎ باوجو میسرم آسودہ میشوم از دور ؛ بہ بدید حال مرا وقت بے قراری حیف"۔ لیکن مرزا غالب نے جس دلی کیفیت کا اظہار الفاظ کے ذریعہ سے کیا ہے فارسی شعر میں یہ بات کہاں۔ فارسی شاعر نے صرف یہ تمنا ظاہر کی ہے کہ میری بے قراری کی حالت میں میرا معشوق دیکھ لیتا اور غالب نے حالت دیکھنے کے بعد معشوق کا دلی خیال ظاہر کیا ہے ؎

[3] خضر سلطان شاہ ابو ظفر کے شہزادے کا نام ہے ان کے لیے شاعر نے اس شعر میں دعا دی ہے ۱۲ شاعر

۱۷۸

غیر لیں محفل میں بوسے جام کے
ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے

خستگی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ
ہتھکنڈے ہیں چرخِ نیلی فام کے

خط لکھیں گے۔ گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

رات پی زمزم پہ مے۔ اور صبح دم
دھوئے دھبے جامۂ احرام کے

دل کو آنکھوں نے پھنسایا کیا؟ مگر
یہ بھی حلقے ہیں تمہارے دام کے

شاہ کے ہے غسلِ صحت کی خبر
دیکھیے کب دن پھریں حمام کے

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

۱۷۹ ق

پھر اس انداز سے بہار آئی
کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی

دیکھو۔ اے ساکنانِ خطۂ خاک
اس کو کہتے ہیں عالم آرائی

اپنے فلسفیانہ عقیدے کے مطابق دوزخ اور جنت کے وجود کو خارجی سمجھا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ جنت کا اعتقاد رکھنا اطمینانِ قلب کے لیے ضروری ہے ۱۲۔

لہ محفل سے معشوق کی محفل عیش مراد ہے اور پیغام سے پیغام طلب ۱۲

سے حسن بیگ رفیع نے قریب قریب اسی مضمون کو اپنے اس شعر میں اس طرح ظاہر کیا ہے "خوش دلم نیں کہ بادنامہ نویسم شب و روزش مقصدم نیست کہ مکتوب برسد یا نرسد" ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ غالب نے اس خیال کو اسی فارسی شاعر سے مستعار لیا ہے لیکن فارسی شاعر کہتا ہے کہ اُسے بلا لحاظ اس کے کہ خط پہونچے یا نہ پہونچے اپنے معشوق کو خط لکھنے میں لطف آتا ہے۔ غالب کا تخیل اس سے کہیں بڑھا ہوا ہے وہ کہتا ہے کہ اس کی کوئی غرض ہو یا نہو صرف اس لیے خط لکھیں گے کہ ہمیں اپنے معشوق کا نام ہی پیارا ہے۔ اس کے نام خط لکھتے ہوئے مسرت ہوتی ہے جیسا

کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر — روکش سطح چرخ مینائی

سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی — بن گیا روئے آب پر کائی

سبزہ و گل کے دیکھنے کے لیے — چشم نرگس کو دی ہے بینائی

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر[ل] — بادہ نوشی ہے بادپیمائی

کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالبؔ
شاہ دیندار نے شفا پائی

۱۸۰

تغافل[ل] دوست ہوں۔ میرا دماغ عجز عالی ہے
اگر پہلو تہی کیجے تو جاں میری بھی خالی ہے

مجنوں کا حال تھا گفت عشق نام لیلیٰ سکینہ ۱۲ (تحریر)

ل بہار کی وجہ سے ہوا میں شراب کی تاثیر پیدا ہو گئی ہے کہ تو شراب پینا فضول ہے ہوا کھانے ہی سے شراب کا لطف ملتا ہے۔ یہ معنی اختیار کرنے میں "بادپیمائی" کے معنی ہوا کھانے کے ہوئے۔ بادپیمائی کے معنی عبث کام کرنے کے لیے جائیں تو شعر کے یہ معنے ہوں گے کہ فصل بہار کی ہوا ایسی نشاط انگیز ہے کہ اس میں شراب کی تاثیر پیدا ہو گئی ہے اور اس لیے بادہ نوشی محض فضول کام ہے ۱۲

تغافل[ل] کو دوست رکھتا ہوں یعنی میرا عجز و انکسار اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ مجھ کو تو بے توجہی ہی پسند ہے اگر آپ مجھ سے پہلو تہی یا بے التفاتی کریں گے تو گویا میرے لیے جگہ خالی کریں گے

کیونکہ اغماض کو میں التفات سمجھتا ہوں ۱۲

رہا آباد عالم۔ اہلِ ہمت[۱۰] کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جام و سبو مے خانہ خالی ہے

۱۸۱

کب وہ سنتا ہے کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری

خلشِ[۱۱] غمزۂ خوں ریز نہ پوچھ
دیکھ۔ خونابہ فشانی میری

کیا[۱۲] بیاں کر کے مرا روئیں گے یار؟
مگر۔ آشفتہ بیانی میری

ہوں[۱۳] ز خود رفتۂ بیدائے خیال
بھول جانا ہے نشانی میری

متقابل ہے مقابل میرا
رک گیا دیکھ روانی میری

[۱۰] اہلِ ہمت مراد اہلِ دل و اہل اللہ سے ہے بالکل نیا مضمون ہے شاعر کہتا ہے کہ صرف اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے اس دنیا کی چہل پہل باقی ہے۔ کیونکہ اہلِ ہمت دنیا کو فانی سمجھ کر اس کی جانب عدم توجہی کرتے اور دنیا برباد ہو جاتی۔ دوسرے مصرعہ میں اسی مضمون کو مثال سے سمجھایا گیا ہے۔ جام و سبو کا بھرا ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کے پینے والے یعنی اہلِ ہمت مفقود ہیں [۱۱] اس غمزے کی خونریزی سے جو خلش دل میں پیدا کر دی ہے اس کا اندازہ میرے خون کے آنسو دیکھ کر بخوبی ہو سکتا ہے [۱۲] اس شعر میں کیا کے بعد وصف کا لفظ محذوف ہے اور یہ حذف نہایت لطیف ہے [۱۳] بیدا۔ بالفتح بمعنی بیابان و دشت۔ بیدائے خیال یعنی صحرائے خیال کا از خود رفتہ ہوں یعنی دوستوں کے خیال سے نکل جاتا ہوں اور احباب کے خیال سے فراموش ہو جانا ہی میری پہچان ہے [۱۴] اس شعر کے معنی مصنف نے خود اپنی زندگی میں مولوی عبدالرزاق صاحب شاکر اپنے ایک شاگرد کو ایک خط میں لکھ کر بھیجے تھے جو انہیں کے الفاظ میں یہ ہیں "تقابل و تضاد کو کون نہ جانے گا۔ نور و ظلمت۔ شادی و غم۔ راحت و رنج وجود و عدم لفظ متقابل اس مصرعہ میں بمعنی مرجع ہے جیسے حریف کہ بمعنی دوست کے بھی مستعمل ہے مفہوم شعر یہ ہے کہ ہم اور دوست از روئے خو و عادت ضد ہم دگر ہیں۔ وہ میری طبع کی روانی کو دیکھ کر رک گیا ہے" (عود ہندی)

قدر[1] سنگ سرِ رہ رکھتا ہوں | سخت ارزاں ہے گرانی میری

گرد[2] باد رہِ بیتابی ہوں | صرصرِ شوق ہے بانی میری

دہن[3] اُس کا جو نہ معلوم ہوا | کھل گئی ہیچمدانی میری

کر دیا ضعف نے عاجز غالب | ننگِ پیری ہے جوانی میری

نقشِ[4] نازِ بتِ طنّاز بآغوشِ رقیب | پائے طاؤس ز خامۂ مانی مانگے

تو وہ بدخو کہ تحیر کو تماشا جانے | غم وہ افسانہ کہ آشفتہ بیانی مانگے

وہ تبِ عشق تمنا ہے کہ پھر صورتِ شمع | شعلہ تا نبضِ جگر ریشہ دوانی مانگے

---

[1] گرانی کے معنی بھاری پن اور بیش قیمت ہونا دونوں آتے ہیں شاعر کہتا ہے کہ میری قدر اُس پتھر کی سی ہے جو سر راہ پڑا ہوا پامال ہوتا ہو گویا باوجود گراں قدر ہونے کے بے قدر ہوں اور اس طرح سے میری گرانی فی الواقع ارزانی ہے ۱۲ [2] گرد باد۔ بگولا ۱۲ [3] دہن معشوق کو شاعر ناپید جانتے ہیں اور مصنف بھی بحیثیت شاعر ہونے کے ہیچ جاننے والوں کے زمرے میں ہیں اس لیے اپنے کو ہیچمداں کہا ۱۲

[4] شاعر کو اس شعر میں رقیب کی ہجو کرنا منظور ہے وہ کہتا ہے کہ رقیب ایسا بدصورت ہے کہ جب معشوق کی تصویر اس کی ہم آغوشی کی حالت میں کھینچی جائے تو وہ بھی باوجود معشوق کے حسین ہونے کے بدنما معلوم ہوتی ہے اور بجائے قلم کی جگہ مصور کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کے ہاتھ میں پائے طاؤس کا قلم ہو اس کی وجہ ظاہر ہے کہ طاؤس کے سب اعضا حسین ہوتے ہیں لیکن اس کے پاؤں بہت بدصورت ہوتے ہیں ۱۲

گلشن کو تری صحبت از بس کہ خوش آئی ہے
ہر غنچہ کا گل ہونا آغوش کشائی ہے

واں کنگر[1] استغنا ہر دم ہے بلندی پر
یاں نالے کو اور الٹا دعوائے رسائی ہے

از بس کہ سکھاتا ہے غم ضبط کے اندازے[2]
جو داغ نظر آیا اک چشم نمائی ہے

جوں زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی
لکھ دیجیو یا رب اُسے قسمت میں عدو کی

اچھا ہے سر انگشت حنائی[3] کا تصور
دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی

کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے حوصلگی[4] سے
یاں تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی

دشنے نے کبھی منہ نہ لگایا ہو جگر کو
خنجر نے کبھی بات نہ پوچھی ہو گلو کی

صد حیف! وہ ناکام کہ اک عمر سے غالب
حسرت میں ہے ایک بت عربدہ جو کی

---

[1] کنگر مخفف ہے کنگرہ کا۔ عمارت کا وہ نمایاں حصہ جو قلعہ یا کسی اور بلند عمارت کے اوپر بناتے ہیں ۱۲۔ [2] غم عشق ضبط کی تعلیم کر رہا ہے۔ دل میں جو نیا داغ نظر آتا ہے وہ اُستاد یعنی غم عشق کی طرف سے چشم نمائی ہے۔ داغ کو آنکھ سے نسبت دینے کی وجہ ظاہر ہے ۱۲۔ [3] سر انگشت۔ اُنگلی کے پورے۔ اس شعر میں شاعر نے معشوق کی انگشت حنائی کی خوبصورتی اور نزاکت اس کے پوروں کو لہو کی بوندوں سے مشابہت دیکر ثابت کی ہے عجیب وغریب تشبیہ ہے ۱۲۔ [4] بے حوصلگی۔ کم ظرفی۔ شاعر معشوق سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ تو عاشق کی کم ظرفی سے ناحق ڈرتا ہے کہ وہ میرے ظلم وستم سے تنگ آکر فریاد کریگا یہاں تو یعنی دنیا میں کوئی کسی کا درد دکھ سنتا ہی نہیں ۱۲۔

١٨٥

سیماب پشت گرمیِ[1] آئینہ دے ہے ہم
حیراں کیے ہوئے ہیں دلِ بے قرار کے

آغوشِ گل کشودہ برائے وداع ہے
اے عندلیب چل کہ چلے دن بہار کے

١٨٦

ہے وصل ہجر عالمِ تمکین و ضبط میں
معشوقِ شوخ و عاشقِ دیوانہ چاہیے

اُس لب سے مل ہی جائیگا بوسہ کبھی تو ہاں
شوقِ فضول و جراتِ رندانہ چاہیے

١٨٧

چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے
یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیے

صحبتِ رنداں سے واجب ہے حذر
جائے مے[2] اپنے کو کھینچا چاہیے

چاہنے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل؟
بارے اب اس سے بھی سمجھا چاہیے

---

[1] پشت گرمی: یعنی پشت بانی و اعانت یعنی جس طرح پارے کی قلعی نے شیشے کو آئینہ بنا دیا ہے۔ اسی طرح ہمارے دلِ بے قرار نے ہماری حیرانی کو پیدا کر دیا ہے۔ اس شعر میں شاعر نے اپنے دلِ بے قرار کو سیماب سے اور اپنی حیرانی کو آئینے سے تشبیہ دی ہے ۱۲

[2] غالب نے اس شعر میں کھینچنا دو معنی میں لکھا ہے ایک "کشیدن" کا ترجمہ ہے یعنی شراب پینا اس معنی میں کھینچنا استعمال کرنا غالب کے لیے مخصوص تھا۔ اردو میں عموماً ایسا نہیں بولا جاتا۔ دوسرے معنی احتراز کرنا ۱۲

چاک مت کر جیب بے ایامِ گل[1]
کچھ اُدھر کا بھی اشارہ چاہیے

دوستی کا پردہ ہے بیگانگی
منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے

دشمنی نے میری کھویا غیر کو
کس قدر دشمن ہے ؟ دیکھا چاہیے

اپنی رسوائی میں کیا چلتی ہے سعی
یار ہی ہنگامہ آرا چاہیے

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
نا اُمیدی اُس کی دیکھا چاہیے

غافل اِن مہ طلعتوں کے واسطے
چاہنے والا بھی اچھا چاہیے

چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

۱۸۸

ہر قدم دوریِ منزل ہے نمایاں مجھ سے[2]
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

[1] اُدھر کا اشارہ: نیچر یا قدرت کا اشارہ۔ مطلب یہ ہے کہ جب تک موسم بہار نہ آئے اور پھول اپنا گریبان اس موسم میں چاک نہ کرے تو بھی اپنا گریبان مت چاک کر کیونکہ ہر ایک کام نیچر کے اشارے سے کرنا چاہیے۔ اس شعر میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ عاشق کو ہمیشہ موسم بہار میں جوشِ جنوں زیادہ ہوتا ہے ۱۲۔

[2] اس شعر میں شاعر نے اپنی ناکامی کا بیان بہ غلو کیا ہے وہ کہتا ہے کہ میں جس قدر چلتا ہوں اُسی قدر منزل دور ہوتی جاتی ہے۔ دوسرے مصرعہ میں منزل کے دور ہونے جانے کا سبب یہ بیان کیا ہے کہ میری رفتار ایسی منحوس ہے کہ بیابان اس سے ڈر کر آگے کو بھاگتا ہے ۱۲۔

[1] درسِ عنوانِ تماشا بہ تغافل خوش تر
ہی نگہ رشتۂ شیرازۂ مژگاں مجھ سے

وحشتِ آتشِ دل سے شبِ تنہائی میں
صورتِ دود رہا سایہ گریزاں مجھ سے

[2] غمِ عشاق نہ ہو سادگی آموزِ بتاں
کس قدر خانۂ آئینہ ہی ویراں مجھ سے

[3] اثرِ آبلہ سے جادۂ صحرائے جنوں
صورتِ رشتۂ گوہر ہی چراغاں مجھ سے

[4] بیخودی بسترِ تمہیدِ فراغت ہو جو
پُر ہی سایہ کی طرح میرا شبستاں مجھ سے

---

۱ درسِ عنوانِ تماشا = معشوق کے دیدار کا نظارہ۔ عنوان کا لفظ مبالغہ کی غرض سے استعمال ہوا ہی یعنی دیدارِ یار کا پورے طور پر نظارہ کرنا تو ممکن ہی نہیں یہاں صرف عنوانِ تماشا بھی تغافل ہی سے مناسب معلوم ہوتا ہی۔ درس کا لفظ اس مناسبت سے لائے ہیں کہ معشوق کے چہرے کو اس کی شکل کے لحاظ سے کتاب فرض کیا (کتابی چہرہ ہونا خوشنمائی میں داخل ہی) دوسرے مصرعہ کا مطلب صاف ہی یعنی معشوق کے دیدار کا نظارہ چونکہ تغافل کی نگاہ سے کرتا ہوں یعنی یوں دیکھتا ہوں گویا نہیں دیکھتا اس طرح کہ اس کو خبر نہ ہو اس لیے اپنی نگاہ کو شیرازۂ مژگاں کا رشتہ بنایا جو غیر محسوس ہی اور جس کو تغافل سے مناسبت ہی ۱۲ ۲ شاعر نے اس شعر میں حسینوں یعنی معشوقوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا ہی وہ کہتا ہی کہ خدا حسینوں پر وہ وقت نہ لائے جو وہ اپنے عشاق کے غم میں سوگوار ہو کر بناؤ سنگھار ترک کر دیں کیونکہ آرائش کا ترک کرنا ان کے لیے ایک مصیبت ہی جیسا کہ میرے مرنے پر میرے معشوق نے آرائش چھوڑ دی اور اس لیے آئینہ نہیں دیکھتا جو اس کے جلوے کے بغیر ویران نظر آتا ہی ۱۲
۳ مطلب یہ ہی کہ پاؤں کے آبلے کے اثر سے یعنی آبلوں سے جو لہو ٹپکا ہی اس سے جادۂ صحرا رشتۂ گوہر کی طرح چراغاں ہو گیا جادہ کو رشتہ سے تشبیہ دی ہی ۱۲ ۴ ہو جو = ہو جیو کا مخفف ہی۔

شوقِ دیدار میں گر تو مجھے گردن مارے
ہو نگہ مثلِ گلِ شمع - پریشاں مجھ سے

بے کسی ہائے شبِ ہجر کی حسرت ہے ہے
سایۂ خورشیدِ قیامت میں ہے پنہاں مجھ سے[1]

گردشِ ساغرِ صد جلوۂ رنگیں تجھ سے[2]
آئنہ داریِ یک دیدۂ حیراں مجھ سے

نگہِ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے اسدؔ
ہے چراغاں خس و خاشاکِ گلستاں مجھ سے

۱۸۹

نکتہ چیں ہے - غمِ دل اُس کو سنائے نہ بنے[3]
کیا بنے بات - جہاں بات بنائے نہ بنے

میں بلاتا تو ہوں اُس کو - مگر اے جذبۂ دل[4]
اُس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

---

[1] مطلب یہ ہے کہ جس طرح شبستان تاریکی سے بھرا ہوا ہوتا ہے اسی طرح میرا شبستان میرے وجود سے پُر ہے۔ اب یہ خواہش ہے کہ اے خدا بے خودی تمہید فراغت کا بستر بنے - یعنی میں عالم بیہوشی میں آرام سے پڑا رہوں۔ فراغت کے لغوی معنے خالی ہونے کے ہیں اصطلاح میں راحت مراد ہے لفظ بستر اور فراغت کی مناسبت ظاہر ہے ۱۲ [2] جلوۂ رنگیں سے جلوۂ حسن اور دیدۂ حیراں سے حیرتِ عشق کی طرف اشارہ ہے ۱۲ [3] بات بننا - تدبیر کا بن پڑنا - بات بنانا - کسی واقعہ کو توڑ مروڑ کے اپنے حسب مطلب الفاظ میں کہنا ۱۲ [4] کسی پر بن جانا مصیبت میں مبتلا ہو جانا ۱۲

کھیل سمجھا ہے۔ کہیں چھوڑ نہ دے بھول نہ جا ئے
کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے

غیر پھرتا ہے۔ لیئے یوں۔ ترے خط کو کہ۔ اگر
کوئی پوچھے کہ "یہ کیا ہے"؟ تو چھپائے نہ بنے

اس نزاکت کا بُرا ہو۔ وہ بھلے ہیں، تو کیا
ہاتھ آئیں۔ تو اُنھیں ہاتھ لگائے نہ بنے

کہہ سکے کون۔ کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے؟
پردہ چھوڑا ہے وہ اُس نے کہ اُٹھائے نہ بنے

موت[لہ] کی راہ نہ دیکھوں؟ کہ بن آئے نہ رہے
تم کو چاہوں؟ کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے

بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اُٹھائے نہ اُٹھے
کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

عشق پر زور نہیں۔ ہے وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے۔ اور بجھائے نہ بنے

لہ شاعر کہتا ہے کہ موت کی راہ کیوں نہ دیکھوں کہ اس کا آنا لازمی ہے تم کو کیوں چاہوں کہ اگر تم نہ آؤ تو میں بلانے کی بھی جرأت نہیں کر سکتا۔ مصنف نے اس شعر میں عشق معشوق پر موت کو ترجیح دی ہے ۱۲

چاکِ[1] کی خواہش اگر وحشت بہ عریانی کرے
صبح کے مانند زخمِ دل گریبانی کرے

جلوے کا تیرے وہ عالم ہے کہ گر کیجے خیال
دیدۂ دل کو زیارت گاہِ حیرانی کرے

ہے شکستن[2] سے بھی دل نومید یارب کب تلک
آبگینہ کوہ پر عرضِ گراں جانی کرے

میکدہ[3] گر چشمِ مستِ ناز سے پاوے شکست
موئے شیشہ دیدۂ ساغر کی مژگانی کرے

خطِ[4] عارض سے لکھا ہے زلف کو الفت نے عہد
یک قلم منظور ہے جو کچھ پریشانی کرے

۱؎ عریانی کی حالت میں اگر وحشت کو چاک گریباں کی آرزو پیدا ہو تو میرا زخمِ دل صبح کی مثل چاک ہو کر گریبان بن جائے گا یعنی حالتِ عریانی کی وجہ سے چاک کرنے کو تن پر کپڑا نہ ہوگا تو قدرتی طور پر یہ خواہش دوسرے طریقے سے پوری کرنی پڑے گی ۱۲

۲؎ آبگینہ از شیشۂ دل سے مراد ہے کوہ استعارہ ہے معشوق کی سنگدلی کی طرف۔ مطلب یہ ہے کہ ہم کب تک یہ خواہش کریں کہ معشوق سنگدل ہمارے دل کو توڑ ڈالے ہمیں اس سے بھی نا امیدی ہے کہ وہ ہماری دل شکنی ہی پر متوجہ ہوگا ۱۲

۳؎ موئے شیشہ۔ وہ بال جو شیشہ میں پڑ جاتا ہے۔ دیدۂ ساغر کی مژگانی کرے۔ دیدۂ ساغر کی پلک بن جائے ۱۲

۴؎ عارضِ یار پر جو خط نکلا ہے وہ ایک عہد نامہ ہے جو الفت نے زلف کے نام لکھا ہے اور جس کا منشا یہ ہے کہ میرے حق میں جو کچھ پریشانی کرنا ہو کرے مجھے سب منظور و قبول ہے ۱۲

۱۹۱

وہ آ کے خواب میں تسکینِ اضطراب تو دے[1]
ولے مجھے تپشِ دل مجالِ خواب تو دے

کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا
تری طرح کوئی تیغِ نگہ کو آب تو دے

دکھا کے جنبشِ لب ہی تمام کر ہم کو
نہ دے جو بوسہ تو منہ سے کہیں جواب تو دے[2]

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

اسدؔ خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اُس نے "ذرا میرے پاؤں داب تو دے"

۱۹۲

تپش سے میری وقفِ کشمکش ہر تارِ بستر ہے
مرا سر رنجِ بالیں ہے مرا تن بارِ بستر ہے

---

[1] تسکینِ اضطراب تو دے۔ یعنی اضطراب میں اس کا تسکین دینا ممکن ہے۔ مجالِ خواب تو دے یعنی خواب کا آنا بڑی بات ہے ۱۲

[2] کہیں جواب تو دے: کسی نہ کسی طرح جواب تو دے ۱۲۔

سرشکِ[1] سر بہ صحرا دادہ نور العین دامن ہے
دلِ بے دست و پا افتادہ - برخوردار بستر ہے

خوشا اقبالِ رنجوری - عیادت کو تم آئے ہو
فروغِ شمعِ بالیں - طالعِ بیدار بستر ہے

بطوفاں[2] گاہِ جوشِ اضطرابِ شامِ تنہائی
شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر - تارِ بستر ہے

ابھی[3] آتی ہے بو بالش سے اُس کی زلفِ مشکیں کی
ہماری دید کو - خوابِ زلیخا - عارِ بستر ہے

کہوں کیا دل کی کیا حالت ہے - ہجرِ یار میں غالب
کہ بے تابی سے - ہر اک تارِ بستر - خارِ بستر ہے

[1] اس شعر میں شاعر نے اپنی ناکامی اور ناچاری کا بیان کیا ہے کہ اس کا آنسو دامن کی آنکھ کا نور اور اس کا دل مجبور بسترِ مرض کا پھل کھانے والا ہے یعنی آنسو کو دامن سے اور دل کو بستر پر پڑے رہنے سے محبت ہو گئی ہے ۱۲

[2] مطلب یہ ہے کہ شامِ تنہائی میں ایسا اضطراب اور تاریکی ہے کہ گویا ہر ایک تارِ بستر آفتابِ روزِ حشر کی کرن بن گیا ہے ۱۲

[3] شاعر کہتا ہے کہ ابھی ہمارے تکیوں سے معشوق کے زلفِ مشکیں کی خوشبو نہیں گئی ہے یعنی ابھی ہمیں وصل کا لطف فراموش نہیں ہوا ہے ایسی حالت میں زلیخا کی طرح صرف خواب میں دیدارِ یار کا حاصل ہو جانا ہمارے بستر کے لیے ننگ سا ہے ۱۲ -

خطر ہے[۱] رشتۂ الفت۔ رگِ گردن نہ ہو جائے[۱۹۳]
غرورِ دوستی۔ آفت ہے۔ تو دشمن نہ ہو جائے

سمجھ[۲] اس فصل میں کوتاہیِ نشو و نما غالبؔ
اگر گل۔ سرو کے قامت پہ پیراہن نہ ہو جائے

فریاد کی کوئی لَے نہیں ہے — [۱۹۴] نالہ پابندِ نَے نہیں ہے
کیوں[۳] بوتے ہیں باغبان تونبے؟ — گر باغ گدائے مَے نہیں ہے
ہر چند۔ ہر ایک شے میں تو ہے — پر تجھ[۴] سی تو کوئی شے نہیں ہے
ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی — ہر چند کہیں۔ کہ "ہے" نہیں ہے

[۱] خطر ہے یہاں "ہے" محذوف ہے۔ اس شعر میں شاعر معشوق سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ تیری دوستی پر تجھے غضب کا غرور ہوا ہے چونکہ ہر کمال کو زوال ہوتا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ تیری دوستی جو کمال کو پہنچ گئی ہے اس میں زوال آجائے اور وہ دشمنی سے بدل جائے جس سے یہ خطرہ ہے کہ محبت کا خاتمہ ہو جائے یعنی جس طرح دشمن کے ہاتھ سے رگِ گردن قطع ہو جاتی ہے اسی طرح تو رشتۂ الفت کو توڑ دے۔

[۲] پہلا مصرعہ صاف ہے۔ دوسرے مصرعہ کا مطلب یہ ہے کہ بہار میں شاخ ہائے گل کو اس قدر نشو و نما ہو کہ وہ سرو کی قبا بن جائیں ۱۲

[۳] تونبوں سے کشتیاں اور کدو سے شراب بنتی ہے اس لیے اس کی موجودگی سے باغ کو شراب کا بھکاری ثابت کیا ہے ۱۲

[۴] تجھ سی تیری مثل۔ اس شعر میں خدا کی طرف اشارہ ہے ۱۲

شادی[1] سے گزر۔ کہ غم نہ ہووے
اردی جو نہ ہو تو دی نہیں ہے

کیوں[2] ردِّ قدح کرے ہے زاہد؟
مے ہے۔ یہ مگس کی قے نہیں ہے

ہستی[3] ہے۔ نہ کچھ عدم ہے غالبؔ
آخر تو کیا ہے؟ اے "نہیں ہے"

۱۹۵
نہ پوچھ نسخۂ مرہم جراحتِ دل کا
کہ اس میں ریزۂ الماس جزوِ اعظم ہے

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ اِک نگہ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے

۱۹۶
ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے
مرتے ہیں۔ و لے اُن کی تمنّا نہیں کرتے

---

[1] اُردی:۔ ماہ بہار۔ دی:۔ ماہ خزاں (فارسی مہینوں کے نام ہیں) یعنی اپنے کو لطف بہار کا عادی نہ بنا تاکہ خزاں کا غم ہی نہ ہو۔ مطلب یہ ہے کہ انسان کو اگر دنیا میں کسی شے سے دلبستگی نہ ہو تو کسی چیز کے ترک کا غم بھی نہ ہوگا ۱۲ [2] مگس کی قے سے مراد شہد ہے زاہد سے خطاب ہے کہ تو جو شراب پینے سے انکار کرتا ہے اور شہد کے پینے کو ثواب سمجھتا ہے یہ کیوں؟ قابل نفرت تو شہد ہے جو شہد کی مکھی کی قے ہے نہ کہ شراب ۱۲

[3] چونکہ مصنف نے اس شعر کی ردیف "نہیں ہے" قرار دی ہے اور اس لیے ہر شعر میں بار بار مخاطب کو "نہیں ہے" "نہیں ہے" سننا پڑا ہے۔ قاعدہ ہے کہ جب ایک ہی لفظ کو مخاطب سنتے سنتے تنگ آ جاتا ہے تو وہ بے اختیار انھیں الفاظ سے قائل کو خطاب کرنے لگتا ہے جس سے اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اب ان الفاظ کا اعادہ موقوف کیجیے۔ اسی طرح غالب نے از راہ شوخی اپنا نام "نہیں ہے" قرار دے کر اپنے سے خطاب کیا ہے کہ اے جناب "نہیں ہے" جب نہ ہستی ہے نہ عدم تو پھر بتاؤ کہ ہو کیا چیز؟ ۱۲۔

در پردہ انھیں غیر سے ہی ربطِ نہانی
ظاہر کا یہ پردا ہی کہ پردا نہیں کرتے

یہ[١] باعثِ نومیدیٔ اربابِ ہوس ہی
غالبؔ کو بُرا کہتے ہو۔ اچھا نہیں کرتے

١٩٧

کرے[٢] ہی بادہ ترے لب سے کسبِ رنگِ فروغ
خطِ پیالہ سراسر نگاہِ گُلچیں ہی
کبھی تو اس دلِ شوریدہ کی بھی داد ملے
کہ ایک عمر سے حسرت پرستِ بالیں ہی
بجا ہی۔ گر نہ سُنے نالہ ہائے بُلبلِ زار
کہ گوشِ گُل۔ نمِ شبنم سے پنبہ آگیں ہی

اسدؔ ہی نزع میں۔ چل بے وفا! برائے خدا
مقامِ ترکِ حجاب و وداعِ تمکیں ہی

[١] یعنی غالب جیسے شخص کو برا کہوگے تو اربابِ ہوس یعنی رقیبوں کو تم سے کیا امید ہوگی۔
[٢] شراب کو گلچیں۔ لبِ معشوق کو پھول۔ خطِ ساغر کو تارِ نگاہِ گلچیں سے نسبت دی گئی ہے یعنی گل ہائے لب سے شراب سرخی حاصل کرتی ہی اور خطِ پیالہ تارِ نگاہِ گلچیں ہے

کیوں نہ ہو؟ چشمِ بتاں محوِ تغافل۔ کیوں نہ ہو [۱۹۸]
یعنی اُس بیمار کو نظارے سے پرہیز ہے

مرتے مرتے۔ دیکھنے کی آرزو رہ جائے گی
وائے ناکامی کہ اُس کافر کا خنجر تیز ہے

---

[۱۵] عارضِ گل دیکھ روئے یار یاد آیا اسد
جوششِ فصلِ بہاری اشتیاق انگیز ہے

---

[۱۶] دیا ہے دل اگر اُس کو۔ بشر ہے کیا کہیے [۱۹۹]؟
ہوا رقیب تو ہو۔ نامہ بر ہے۔ کیا کہیے؟

یہ ضد کہ آج نہ آئے۔ اور آئے بن نہ رہے
قضا سے شکوہ ہمیں کس قدر ہے؟ کیا کہیے؟

رہے ہے یوں گہ و بے گہ کہ کوئے دوست کو اب
اگر نہ کہیے کہ "دشمن کا گھر ہے" کیا کہیے؟

زہے کرشمہ کہ یوں دے رکھا ہے ہم کو فریب
کہ بن کہے ہی اُنھیں سب خبر ہے کیا کہیے؟

---

۱۵ دیکھ = دیکھ کر۔
۱۶ "دیا ہے دل" اس کا فاعل نامہ بر ہے۔ اس کو = محبوب کو ۱۲

سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرسشِ حال
کہ یہ کہے کہ "سرِ رہ گزر ہے کیا کہیے"؟

تمہیں[1] نہیں ہے سر رشتۂ وفا کا خیال
ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے، مگر ہے کیا کہیے؟

انہیں سوال پہ زعمِ جنوں ہے کیوں لڑیے؟
ہمیں جواب سے قطعِ نظر ہے کیا کہیے؟

حسد سزائے کمالِ سخن ہے۔ کیا کیجے؟
ستم، بہائے متاعِ ہنر ہے کیا کہیے؟

کہا ہے کس نے کہ غالبؔ بُرا نہیں لیکن
سوائے اس کے کہ "آشفتہ سر ہے کیا کہیے"؟

۲۰۰

دیکھ کر در پردہ گرمِ[2] دامن افشانی مجھے
کر گئی وابستۂ تن میری عُریانی مجھے

---

[1] مگر ہے کیا؟: کیا چیز ہے۔ سررشتۂ وفا کو شاعر ایک محسوس شے فرض کر کے کہتا ہے ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے یعنی سررشتۂ وفا ہے۔ اس شعر میں یہ شوخی ہے کہ شاعر پوچھتا ہے کہ ہمارے ہاتھ میں کیا چیز ہے اور پھر معشوق ان معنوں میں اُس چیز کا نام بھی لے دیا ۱۲

[2] دامن افشانی: ترکِ تعلقاتِ دُنیوی۔ مطلب یہ ہے کہ تعلقاتِ دُنیا سے چھٹکارا ممکن ہی نہیں اگر انسان عریانی اختیار کرے تو جسمانی پابندی باقی رہتی ہے ۱۲

بن گیا تیغِ نگاہِ یار کا سنگِ فساں۱؎
مرحبا میں، کیا مبارک ہو گراں جانی مجھے

کیوں نہ ہو بے التفاتی؟ اُس کی خاطر جمع ہو
جانتا ہو مجھ پہ پُرسش ہائے پنہانی۲؎ مجھے

میرے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی
لکھ دیا منجملۂ اسبابِ ویرانی۳؎ مجھے

بدگماں ہوتا ہو وہ کافر نہ ہوتا کاشکے
اس قدر ذوقِ نوائے مرغِ بستانی مجھے

وائے واں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا
لے گیا تھا گور میں ذوقِ تن آسانی مجھے

وعدہ۴؎ آنے کا وفا کیجے، یہ کیا انداز ہو؟
تم نے کیوں سونپی ہو میرے گھر کی دربانی مجھے

ہاں نشاطِ آمدِ فصلِ بہاری، واہ واہ!!
پھر ہوا ہو تازہ سودائے غزل خوانی مجھے

۱؎ سنگ فساں:- وہ پتھر جس پر تلوار وغیرہ کو گھس کر دھار رکھتے ہیں۔
۲؎ پرسش ہائے پنہانی:- خواب میں یا تصور میں آکر تسلی دینے کی طرف اشارہ ہو۔ شاعر کا مطلب یہ ہو کہ میں جو معشوق اس کے خواب یا تصور میں آکر تسلی دیتے جانے سے خوش ہوں اس لیے وہ واقعی میری طرف التفات نہیں کرتا اور مجھ سے مطمئن ہو۔ ۳؎ جب ازل میں میرے گھر کی قسمت کا حال لکھا جا رہا تھا۔ اُس وقت تقدیر نے خود مجھے بھی میرے گھر کی ویرانی کا سبب قرار دیا تھا یعنی میرا وجود بھی اسباب ویرانی میں شامل تھا۔ ۴؎ معشوق کا وعدہ وفا نہ ہونے

دی مرے بھائی کو حق نے از سرِ نو زندگی
میرزا یوسف ہے غالبؔ یوسفِ ثانی مجھے

۲۰۱

یاد[1] ہے شادی میں بھی ہنگامۂ یارب مجھے
سبحۂ زاہد ہوا ہے خندہ زیرِ لب مجھے

ہے[2] کشادِ خاطرِ وابستہ در رہنِ سخن
تھا طلسمِ قفلِ ابجد خانۂ مکتب مجھے

یارب![3] اس آشفتگی کی داد کس سے چاہیے؟
رشک آسائش پہ ہے زندانیوں کی اب مجھے

انتظار میں گھر سے نہیں جانے کو گھر کی دربانی کہا ہے۔ عدم ایفاءِ وعدہ کی شکایت کا بالکل نیا پیرایہ ہے ۱۲

[1] ہنگامۂ یارب سے مراد ہنگامۂ فریاد ہے۔ لیکن یارب کے معنی فارسی محاورے میں خدا کی دہائی دینے کے ہیں۔ دانہائے تسبیح کو جو صورتِ خندہ نمایاں ہوتے ہیں۔ شاعر نے خندۂ زیرِ لب سے تشبیہ دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شادی میں مجھے یارب یارب کا نالہ بھولا نہیں ہے اس لیے مجھے زاہد کا چپکے چپکے تسبیح پر یارب یارب پڑھنا ہنسی کی بات معلوم ہوتا ہے ۱۲

[2] اس شعر میں لفظ "در" نے فارسیت کا رنگ غالب کر دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرے دلِ بستہ کی کشائش سخن کی قید میں ہے یعنی میرا دل ہمیشہ وابستہ رہتا ہے اور اگر شگفتگی ہوتی ہے تو سخن سے جس طرح قفلِ ابجد کے کھلنے کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ اس کی چرخیاں جن پر حروف کندہ ہوتے ہیں گھما کر اس وضع پر کر دی جائیں کہ وہ حروف ترتیبِ حروفِ ابجد ہو جائیں۔ اسی طرح مکتب سے میرے دل کو یہ تعلیم ملی ہے کہ لطفِ سخن سے اس کی وابستگی دور ہو جائے ۱۲

[3] کس سے چاہیے۔ کس سے مانگیے "اب مجھے" سے شاعر نے یہ معنی پیدا کیے ہیں کہ جب زنداں میں تھا۔ اس وقت صحرا نوردی کا شوق تھا۔ اب صحرا میں زنداں یاد آتا ہے اور اہلِ زنداں پر رشک آتا ہے ۱۲

طبع ہی[1] مشتاقِ لذت ہائے حسرت، کیا کروں؟
آرزو سے ہی شکستِ آرزو مطلب مجھے

دل لگا کر آپ بھی غالبؔ مجھی سے ہو گئے[2]
عشق سے آتے تھے مانع میرزا صاحب مجھے

۲۰۲

حضورِ شاہ میں اہلِ سخن کی آزمائش ہے
چمن میں خوش نوایانِ چمن کی آزمائش ہے

قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

کریں گے کوہکن کے حوصلے کا امتحاں آخر
ہنوز اُس خستہ[3] کے نیروئے تن کی آزمائش ہے

---

[1] میری طبیعت کو حسرت دیا اس کی لذت کا مزا پڑا ہوا اس لیے آرزو کرنے سے میری غرض یہ ہوتی ہے کہ وہ پوری نہ ہو کیونکہ آرزو کے قطع ہونے سے لذتِ حسرت حاصل ہوتی ہے[2] آپ بھی خود بھی میرزا صاحب سے غالب مراد ہے۔ اس شعر میں دوسرے کی زبان سے مضمون شعر ادا کیا ہے ۱۲

[3] شیریں و فرہاد کے مشہور قصہ کی طرف اشارہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ابھی تو اس کی طاقت جسمانی کا امتحان ہے کہ دیکھیں پہاڑ کاٹ کر دودھ کی نہر نکال سکتا ہے یا نہیں اس کے بعد وہ وقت بھی آنے والا ہے جبکہ ایک بڑھیا شیریں کے مرنے کی خبر سنائے گی وہ گویا اُس کے حوصلے کے امتحان کا وقت ہوگا اور وہ ایسا کم حوصلہ نکلے گا کہ سر پھوڑ کر جان دے دے گا ۱۲ ۔

نسیم مصر[ل۵] کو کیا پیر کنعاں کی ہوا خواہی؟
اُسے یوسف کی بوئے پیرہن کی آزمائش ہے

[ل۶] وہ آیا بزم میں، دیکھو! نہ کہیو پھر کہ غافل تھے
شکیب و صبر اہل انجمن کی آزمائش ہے

رہے دل ہی میں تیر، اچھا، جگر کے پار ہو، بہتر
غرض شستِ بتِ ناوک فگن کی آزمائش ہے

نہیں کچھ سبحہ و زنار کے پھندے میں گیرائی
وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

پڑا رہ۔ اے دل وابستہ بے تابی سے کیا حاصل؟
مگر پھر تابِ زلفِ پرشکن کی آزمائش ہے

رگ و پے میں جب اُترے زہرِ غم۔ تب دیکھیے کیا ہو؟
ابھی تو تلخیِ کام و دہن کی آزمائش ہے:

[ل۷] وہ آئیں گے مرے گھر؟ وعدہ کیسا؟ دیکھنا غالب
نئے فتنوں میں اب چرخِ کہن کی آزمائش ہے

ل۵ پیر کنعاں۔ حضرت یعقوب سے مراد ہے۔ اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے کوسوں سے حضرت یوسف علیہ السلام کے بوئے پیرہن کو تمیز کر لیا تھا ۱۲

ل۶ وہ آیا۔ معشوق کی طرف اشارہ ہے۔ دیکھو۔ ہوشیار ہو جاؤ ۱۲

ل۷ استفہام انکاری ہے وہ ہرگز نہ آئیں گے۔ تمھیں وعدے کا کچھ خیال ہے تو دیکھنا ان کے نہ آنے سے چرخ فتنہ پرداز ہم پر کیا نئی مصیبت نازل کرتا ہے ۱۲۔

کبھی نیکی بھی اُس کے جی میں گر آ جائے ہے مجھ سے[۱]
جفائیں کرکے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے

خدایا جذبۂ دل کی مگر تاثیر اُلٹی ہے
کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے[۲]

وہ بدخو اور میری داستانِ عشق طولانی[۳]
عبارت مختصر قاصد بھی گھبرا جائے ہے مجھ سے

اُدھر وہ بدگمانی ہے ادھر یہ ناتوانی ہے
نہ پوچھا جائے ہے اُس سے نہ بولا جائے ہے مجھ سے

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے[۴]
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

تکلف برطرف نظارگی میں بھی سہی لیکن[۵]
وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے

---

۱ مطلب یہ ہے کہ اگر اُس کو مجھ پر کبھی رحم بھی آ جاتا ہے یعنی اگر مجھے کبھی وصل بھی میسر آ جاتا ہے تو وہ بھی میرے لیے مشکل سے خالی نہیں کیونکہ اس وقت بھی وہ اپنی گزشتہ جفاؤں کو یاد کرکے شرما جاتا ہے اور اُس کی یہ شرم لطفِ وصل میں خلل انداز ہوتی ہے ۱۲۔

۲ کھنچتا جائے ہے مجھ سے۔ مجھ سے آزردہ ہوتا جاتا ہے ۱۲ ۳ عبارت مختصر۔ قصہ مختصر مطلب یہ کہ جب قاصد میری طول داستان سے گھبرا جاتا ہے تو وہ معشوق جو کہ بدخو ہے کب سُننا گوارا کریگا۔ ۱۲

۴ شاعر کہتا ہے کہ غلبۂ یاس میں مطلب ہاتھ سے جاتا رہتا ہے ۱۲۔

۵ نظارگی :۔ دیکھنے والا۔ وہ دیکھا جائے یعنی اغیار اُس کا نظارہ کریں۔ کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے :۔ مجھے یہ ظلم کب گوارا ہو سکتا ہے ۱۲

ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبردِ عشق میں زخمی[1]
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہمسفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

۲۰۴

زبسکہ مشقِ تماشا جنوں علامت ہے[2]
کشاد و بستِ مژہ سیلیِ ندامت ہے
نہ جانوں کیوں کہ مٹے داغِ طعنِ بدعہدی[3]
تجھے کہ آئینہ بھی ورطۂ ملامت ہے

ل اس میں اس وجدانی کیفیت کی جو عشق میں پیدا ہوتی ہے مثال محسوسات سے دی گئی ہے مطلب یہ ہے کہ ابتدائے محبت میں میرے تمام قوی کو صدمہ پہنچا ہے جن کی بدولت میں عشق کے ترک کرنے یا اس کی سختیوں کے برداشت کرنے پر قادر ہو سکتا تھا اس لیے اب نہ عشق ترک ہو سکتا ہے نہ اس کی سختیاں جھیل سکتا ہوں ۱۲

۲ جنوں علامت ہے۔ جنون کی علامت ہے۔ کھلنے والا۔ کشاد و بستِ مژہ۔ پلکوں کا کھلنا اور مندنا سیلیِ ندامت ہے۔ ندامت کی طرف سے سزا کا تھپڑ ۱۲

۳ تو لاکھ آرائش و زیبائش کرے لیکن تیرا داغ بدعہدی مٹنے والا نہیں ہے یعنی تو جب رقیب کی خاطر سے بناؤ سنگھار کر کے آئینہ دیکھتا ہے تو وہ بھی تیرے لیے ورطۂ ملامت بن جاتا ہے یعنی ہم سے بدعہدی کر کے رقیب کے پاس جانے کی تیاری پر تجھے ملامت کرتا ہے ورطہ = گرداب

بہ پیچ و تابِ ہوس سلکِ عافیت مت توڑ
نگاہِ عجز سرِ رشتۂ سلامت ہے

وفا[۱] مقابل و دعویِ عشق بے بنیاد
جنونِ ساختہ و فصلِ گل قیامت ہے

۲۰۵

لاغر اتنا ہوں کہ گر تو بزم میں جا دے مجھے
میرا ذمہ دیکھ کر گر کوئی بتلا دے مجھے

کیا تعجب ہے کہ اس کو دیکھ کر آ جائے رحم
واں تلک کوئی کسی حیلے سے پہنچا دے مجھے

منہ[۲] نہ دکھلاوے نہ دکھلا پر بہ اندازِ عتاب
کھول کر پردہ ذرا آنکھیں ہی دکھلا دے مجھے

یاں تلک میری گرفتاری سے وہ خوش ہے کہ میں
زلف گر بن جاؤں تو شانے میں الجھا دے مجھے

۲۰۶

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

۱؎ اس شعر میں رقیب کے جھوٹے عشق کا ذکر بہ طور طعن کیا گیا ہے کہتا ہے کہ یہ بڑا غضب ہے کہ معشوق آمادۂ وفا ہو اور عشق کا دعویٰ جھوٹا ہو تو وہی معاملہ ہوا کہ فصل بہار تو واقعی آگئی ہو اور جنون بناوٹی ہو ۱۲ ۲؎ آنکھ دکھلانا: خفا ہونا ۱۲

اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے

جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستیِ اشیا مرے آگے

ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے[1]
گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے

مت[2] پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے
تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

سچ کہتے ہو خودبین و خودآرا ہوں نہ کیوں ہوں
بیٹھا ہے بتِ آئینہ سیما مرے آگے

پھر[3] دیکھیے اندازِ گل افشانیِ گفتار
رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

---

[1] مرے ہوتے : - مجھ صحرا گرد کے ہوتے مرے آگے: مجھ اشکبار کے مقابل میں صحرا کا ذکر کرکے اپنی صحرا نوردی کی غایت اور دریا کا حال لکھ کر اپنی اشکباری کی شدت دکھائی ہے ۱۲

[2] فراق میں جو میری حالت ہوتی ہے اس کے پوچھنے کی ضرورت نہیں صرف اپنی اس حالت کو دیکھ جو وصل میں پیدا ہوتی ہے تو میری حالت فراق کو قیاس کر لے یعنی جس طرح تو وصل میں حجاب و شوخی کی کشمکش کے سبب پریشان سا نظر آتا ہے۔ ایسے ہی تیری جدائی میں دل تنگ اور پریشان رہتا ہوں ۱۲ -

[3] عرفی کہتا ہے " بہار بادہ کہ جام دے زنالہ برآید * ہزار زمزمہ از دل بیک پیالہ برآید " عرفی کے اس شعر کو دیکھ کر ایک نکتہ چین نے غالب کے اس شعر کی نسبت لکھا ہے کہ وہ سرقہ کی مار کو تیہج گیا ہے۔ لیکن شاید اُسے معلوم نہیں کہ شعر کا یہ عام بنیادی مضمون ہے اور عرفی سے پہلے خواجہ حافظ وغیرہ نے بھی اس کو باندھا ہے مثلاً " لفظی نہ سرعہد ازل نکتہ بگوئے * بہ آنکہ گو بیت کہ دو پیمانہ برکشم "

نفرت کا گماں گزرے ہے، میں رشک سے گزرا
کیونکر کہوں، "لو نام نہ اُن کا مرے آگے"

ایماں[1] مجھے روکے ہے، جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے، کلیسا مرے آگے

عاشق ہوں، پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنوں کو بُرا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے

خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے
آئی شبِ ہجراں کی تمنّا مرے آگے

ہے موجزن[2] اک قلزمِ خوں، کاش یہی ہو
آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا؟ مرے آگے

گو ہاتھ کو جنبش نہیں، آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

---

[1] کعبہ میرے پیچھے ہے:- کعبہ میرے پیچھے پڑ رہا ہے یعنی اصرار کر رہا ہے۔ کلیسا مرے آگے:- کلیسا سامنے سے بُلا رہا ہے ۱۲

[2] قلزمِ خون:- خون کے آنسوؤں کی کثرت کی طرف اشارہ ہے۔

ہم پیشہ و ہم مشرب و ہم راز ہے میرا
غالبؔ کو برا کیوں کہو، اچھا، مرے آگے

کہوں جو حال تو کہتے ہو "مدعا کہیے"
تمھیں کہو۔ کہ جو تم یوں کہو۔ تو کیا کہیے

نہ کہیو طعن سے پھر تم۔ کہ "ہم ستمگر ہیں"
مجھے تو خو ہے۔ کہ جو کچھ کہو "بجا" کہیے

وہ نیشتر سہی۔ پر دل میں جب اتر جاوے
نگاہِ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہیے

نہیں ذریعۂ راحت، جراحتِ پیکاں
وہ زخمِ تیغ ہے۔ جس کو کہ دلکشا کہیے

جو مدعی بنے اُس کے نہ مدعی بنیے
جو ناسزا کہے اُس کو نہ ناسزا کہیے

کہیں حقیقتِ جاں کاہیِ مرض لکھیے
کہیں مصیبتِ ناسازیِ دوا کہیے

کبھی شکایتِ رنجِ گراں نشیں[1] کیجے
کہیں حکایتِ صبرِ گریز پا کہیے

رہے نہ جاں تو قاتل کو خوں بہا دیجے[2]
کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہیے

نہیں نگار کو الفت۔ نہ ہو۔ نگار تو ہے
روانیِ روش[3] و مستیِ ادا کہیے

نہیں بہار کو فرصت[4] نہ ہو۔ بہار تو ہے
طراوتِ چمن و خوبیِ ہوا کہیے

[1] گراں نشیں:۔ دیر تک قائم رہنے والا۔ گریز پا:۔ ناپائیدار ۱۲
[2] خوں بہا دیجے:۔ مراد خوں بہا بخش دینے سے ہے ۱۲۔
[3] روش:۔ رفتار ۱۲
[4] فرصت:۔ قیام کی مہلت ۱۲۔

سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا غالب
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے

۲۰۸
رونے[1] سے اور عشق میں بیباک ہو گئے
دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے

صرفِ[2] بہائے مے ہوئے آلاتِ مےکشی
تھے یہ ہی دو حساب۔ سو یوں پاک ہو گئے

رسوائے دہر گو ہوئے آوارگی سے تم
بارے طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے

کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر؟
پردے میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

پوچھے ہے کیا۔ وجود و عدم اہلِ شوق کا
آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے

لہ شاعر کہتا ہو ناخدا نے بہت چاہا کہ ہماری کشتی ڈوب جائے لیکن خدا کا حکم ایسا نہ تھا اور باوجود ناخدا کی کوشش کے جب ہماری کشتی کنارے آ لگی ہو تو اب خدا سے اس کی شکایت فضول ہو مطلب یہ ہو کہ اگر کوئی شخص ہم کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرے اور اس کو کامیابی نہ ہو تو اُس وقت کو بھول جانا چاہیئے اور اُس کی شکایت نہ کرنی چاہیے ۱۲ سلہ اور کہاں بھی زیادتی استعمال ہوا ہو دھوے رگئے۔ شرم و حجاب سب دھو گیا پاک ہو گئے۔ پاک شہدے بن گئے پاک شہدے محاورہ ہو یعنی خالص شہدے۔ قاعدہ ہو کہ جب انسان عشق و محبت کو چھپاتا ہو اُس کو ہر بات کا لحاظ رہتا ہو۔ لیکن جب راز کھل جاتا ہو تو پھر اُس کو کسی سے شرم باقی نہیں رہتی ۱۲۔ سلہ شراب کی قیمت کی بہم رسانی اور آلات

کرتے گئے تھے۔اس سے تغافل کا ہم گلہ
کی ایک ہی نگاہ۔ کہ بس خاک ہو گئے

اس رنگ سے اٹھائی کل اس نے اسدؔ کی نعش
دشمن بھی جس کو دیکھ کے غمناک ہو گئے

۲۰۹

نشّہ ہا شاداب رنگ۔ و ساز ہا مست طرب[1]
شیشۂ مے سرو سبز جوئبار نغمہ ہے
ہم نشیں مت کہہ۔ کہ "برہم کر نہ بزم عیش دوست"
واں تو میرے نالے کو بھی اعتبار نغمہ ہے

ہے کشتی کی حفاظت یہی وہ حساب تھے یعنی دو فکریں تھیں۔ سو ان سے یوں چھٹکا ہوا کہ آلات کشتی کو بیچ کر شراب پی لی ۱۲

[1] اس شعر میں شاعر نے معشوق کی بزم عیش کا سماں دکھایا ہے وہ کہتا ہے حالت سرود میں نشّے رنگ سے شاداب ہیں اور باجے جو بج رہے ہیں وہ نشۂ طرب سے سرشار ہیں اور شیشۂ مے جوئبار نغمہ کا ایک سرسبز سرو ہے۔ نغمے کو باعتبار روانی آواز جوئے بار کہا گیا ہے۔ یہ تشبیہ نئی اور پر لطف ہے اور شیشۂ مے کو باعتبار سبزی اس جوئے بار کا سرو سبز ٹھہرایا ہے جوئبار کی تشبیہ سرو سے بالکل نئی ہے ۱۲

--- ❋ ---

عرضِ نازِ شوخیِ دنداں۔ برائے خندہ ہے[1]
دعویٰ جمعیتِ احباب۔ جائے خندہ ہے

ہے[2] عدم میں غنچہ محوِ عبرتِ انجامِ گل
یک جہاں زانو تامل۔ در قفائے خندہ ہے

کلفتِ[3] افسردگی کو۔ عیشِ بےتابی حرام
ورنہ دنداں در دل افشردن۔ بنائے خندہ ہے

لے دانت کو جو حیثیت مجموعی اپنی شوخی (خوبی) بنا ہے تو اس کا اظہار صرف ہنسی ہی کے موقع پر ہوا کرتا ہے۔ پس دوستوں کے ایک جا ہونے کا دعویٰ بھی ہنسی کے قابل ہے کیونکہ جس طرح ہنسی میں دانت ایک دوسرے سے علاحدہ ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح یارانِ صحبت میں بھی جدائی کا اندیشہ ہے ۱۲

ٹے ہے عدم میں غنچہ، یعنی کھلنے سے جو غنچہ غنچہ نہیں رہا بلکہ گل ہو گیا۔ مطلب یہ ہے کہ غنچہ ہنسنے یعنی کھلنے کے بعد اس فکر میں ہے کہ گل کا انجام کیا ہوگا لیکن اس سوچ کی مقدار زانو بھر ہے تامل اور سوچ کا پیمانہ مقدار زانو کو ٹھہرانے میں مصنف نے اس بات کو نگاہ رکھا ہے کہ انسان تامل اور سوچ میں سر بزانو ہو جاتا ہے ۱۲۔

سے دنداں بہ دل افشردن :- یہ فارسی اصطلاح ہے اس کے معنی ہیں مصائب کا برداشت کرنا اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ کلفتِ افسردگی یعنی دل کی افسردگی اور انقباض کی حالت میں بےتابی و بےصبری کا لطف حاصل نہیں ہو سکتا ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مصائب و مکروہات کا برداشت کرنا ہی بنائے عیش ہے (شاعر کے نزدیک انقباض سے بےتابی بہتر ہے اسی لیے اس کو عیش سے موسوم کیا ہے ۱۲۔

شورشِ باطن کے ہیں احباب منکر ورنہ یاں
دل محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

۲۱۰ (الف)

حُسنِ[1] بے پروا خریدارِ متاعِ جلوہ ہے
آئنہ زانوئے فکرِ اختراعِ جلوہ ہے

تا کجا اے آگہی[2]! رنگِ تماشا باختن؟
چشمِ وا گردیدہ آغوشِ وداعِ جلوہ ہے

---

[1] محیط کے لفظی معنے گھیرنے والے کے ہیں بحرِ محیط سمندر کو اس لیے کہتے ہیں کہ وہ بر اعظم کو گھیرے ہوئے ہے محیط سے پہلے لفظ بحر کے ہونے سے فارسی شاعروں نے یہ دھوکا کھایا ہے کہ وہ اسے کسی خاص سمندر کا نام سمجھتے ہیں جیسے بحرِ اسود بحرِ قلزم بحرِ احمر وغیرہ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ محیط کو بحذفِ لفظِ بحر بھی باندھتے ہیں۔ آشنا پیراک کو کہتے ہیں۔ اس لیے محیط کی مناسبت سے آشنا کا لفظ خوب ہے۔ شاعر کا مطلب یہ ہے چونکہ دل کی اندرونی جلن سے آنسو خشک ہو جاتے ہیں اور دل کا آنسوؤں کا سمندر ہونا ظاہر نہیں ہوتا اس لیے میرے دوست احباب باوجود اس علم کے کہ میرے دل کی اصلی حالت کیا ہے۔ مجھے خوش جانتے ہیں۔ ورنہ حالت تو یہ ہے کہ دل آنسوؤں کا سمندر ہے اور لب ہنسی کے پیراک ہیں یعنی اگرچہ بظاہر خوش نظر آتا ہوں لیکن باطن میں سراپا غم بنا ہوا ہوں۔

[2] حسنِ بے پروا:- حسنِ بے نیاز ایک شارح نے حسنِ بے پردہ لکھ دیا ہے جو غلط ہے۔ خریدارِ متاعِ جلوہ:- خواستگارِ جلوہ افروزی۔ فکرِ اختراعِ جلوہ:- نئے بناؤ سنگھار کی فکر۔ آئینے کو فکرِ اختراعِ جلوہ کا زانو اس لیے قرار دیا ہے کہ بناؤ سنگھار کے وقت آئینہ استعمال کیا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حسن باوجودیکہ بے پروا اور بے نیاز ہوتا ہے لیکن بناؤ سنگھار اور جلوہ افروزی کا وہ بھی خواستگار رہتا ہے۔

[3] آگہی:- خبرداری و ہوشیاری ضد بیہوشی۔ رنگِ تماشا باختن:- یہاں باختن بدلنے کے

۱ہ جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی

۲ہ عالم غبارِ وحشتِ مجنوں ہے سر بسر
کب تک خیالِ طرۂ لیلیٰ کرے کوئی

۳ہ افسردگی نہیں طرب انشائے التفات
ہاں درد بن کے دل میں مگر جا کرے کوئی

رونے سے اے ندیم! ملامت نہ کر مجھے
آخر کبھی تو عقدۂ دل وا کرے کوئی

چاک ۴ہ جگر سے جب رہِ پرسش نہ وا ہوئی
کیا فائدہ؟ کہ جیب کو رسوا کرے کوئی

معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ تماشا سے تماشائے عالم مراد ہے۔ چشم وا گردیدہ بمعنی کھلی ہوئی آنکھ اگر ردیف کو اس سے علیحدہ کر کے اسے لگا دیا جائے تو یہ شعر بالکل فارسی ہو جائیگا۔ مطلب یہ ہوا کہ آگاہی از کب تک رنگ تماشا کو بدلے گی۔ یعنی تماشائے عالم کی موج وہ کیفیت میں کب تک محو رہے گی دوسرے مصرع کا ترجمہ یہ ہے۔ کھلی ہوئی آنکھ جلوے کے رخصت کرنے کے لیے آغوش وداع ہے یعنی عالم بے ثبات ہے آنکھ کھولنا گویا اس کی رخصت کے لیے آغوش کو کھولنا ہے ۱۲ یہ شعر نسخہ ... میں دوبارہ ہے کہتا ہے کہ جب تک دل تیغ عشق سے گھائل نہ ہو شاہد حقیقی سے مکالمہ کی عزت حاصل نہیں ہو سکتی ۱۲

۲ہ پہلے مصرع میں غبار وحشت مجنوں کی سراب اور مصرع ثانی میں طرۂ لیلیٰ سے موج دریا مراد ہے طرہ کے لغوی معنی ہیں بال کے بال ... دونوں مصرعوں میں بالکل ہی تشبیہات ... کہتا ہے کہ عالم سراسر سراب ہے ... کب تک موج دریا خیال کریں ۱۲ ۳ہ طرب انشا خوشی پیدا کرنیوالی۔ مطلب یہ ہے کہ دل کی افسردگی یہ کھلانے سے معشوق کے التفات کی خوشی حاصل نہیں ہو سکتی سراپا درد بن جانے کر اگر معشوق کے دل میں گزر کیا جائے تو البتہ ممکن ہے ۱۲ ۴ہ مطلب یہ ہے کہ جیب چاک جگر کرنے پر کوئی

لختِ جگر[1] سے ہے رگِ ہر خار شاخِ گل
تا چند باغبانیِ صحرا کرے کوئی

ناکامیِ نگاہ ہے برقِ نظارہ سوز
تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

ہر سنگ[2] و خشت ہے صدفِ گوہرِ شکست
نقصاں نہیں جنوں سے جو سودا کرے کوئی

سر[3] بر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عمر
فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی

ہے وحشتِ طبیعتِ ایجاد یاس خیز
یہ درد وہ نہیں کہ نہ پیدا کرے کوئی

پریشان حال نہ ہوا تو اب جیب کو پھاڑنے سے بجز رسوائی اور کیا حاصل ہوگا ۱۲

[1] لختِ جگر۔ جگر کے وہ ٹکڑے جو آنسوؤں کے ساتھ خون ہو کر نکلتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ میرے خونِ جگر کی آبیاری سے رگِ ہر خار یعنی ہر کانٹا شاخِ گل بن گیا ہے۔ مصرعِ ثانی میں شاعر کہتا ہے کہ کب تک کوئی صحرا کی باغبانی کرے یعنی خونِ جگر روئے اور اس سے آبیاری کرکے ہر شاخ کو سبز و شاداب بنائے ۱۲

[2] سنگ و خشت۔ اینٹ اور پتھر۔ گوہرِ شکست سے مراد گوہرِ شکست سر ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ہر سنگ و خشت (جو لڑکے دیوانوں کو مارتے ہیں) ایک صدف ہے جس سے گوہرِ شکست حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے جنون سے معاملہ کرنے میں نقصان نہیں ۱۲۔

[3] مطلب یہ ہے کہ ساری عمر تو وعدۂ صبر آزما کے پورے ہونے کے انتظار میں گزر گئی پھر تیرے ملنے کی تمنا کس وقت کی جاتی ۱۲۔

بیکاری جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل ؛
جب ہاتھ ٹوٹ جائیں۔ تو پھر کیا کرے کوئی

حسنِ فروغِ شمعِ سخن دور ہے **اسد**
پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

۲۱۴

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی

شرع و آئین پر مدار سہی
ایسے قاتل[1] کا کیا کرے کوئی

چال جیسے کڑی کمان کا تیر[2]
دل میں ایسے کے جا کرے کوئی

بات پر واں زبان کٹتی ہے
وہ کہیں۔ اور سنا کرے کوئی

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ؟
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

نہ سنو۔ گر بُرا کہے کوئی
نہ کہو گر بُرا کرے کوئی

روک لو۔ گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی

کون ہے جو نہیں ہے حاجت مند؟
کس کی حاجت روا کرے کوئی؟

کیا کیا خضر نے سکندر سے؟
اب کسے رہنما کرے کوئی؟

[1] ایسے قاتل کا۔ اُس قاتل کی طرف اشارہ ہے جو بے تلوار کے قتل کرتا ہو ۱۲
[2] کڑی کمان کا تیر۔ بہت تیزی کے ساتھ اُٹھنے والا ہوتا ہے۔ شاعر نے معشوق کی بے اعتباری کی چال کو اس سے تشبیہ دی ہے وجہ مشابہت ظاہر ہے ۱۲

جب توقع ہی اُٹھ گئی غالبؔ
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی؟

۲۱۳

[1] بہت سہی غمِ گیتی۔ شراب کم کیا ہے؟
غلامِ ساقیِ کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے؟

تمھاری طرز و روش جانتے ہیں ہم کیا ہے؟
رقیب پر ہے اگر لطف۔ تو ستم کیا ہے؟ [2]

کٹے تو شب کہیں کاٹے تو سانپ کہلاوے
کوئی بتاؤ کہ وہ زلفِ خم بہ خم کیا ہے؟

لکھا کرے کوئی احکامِ طالعِ مولود
کسے خبر ہے کہ واں جنبشِ قلم کیا ہے

نہ حشر و نشر کا قائل نہ کیش و ملت کا
خدا کے واسطے ایسے کی پھر قسم کیا ہے

[1] پرانے دیوانوں میں اس غزل کے صرف دونوں مطلع اور مقطع درج ہیں کیونکہ بقیہ اشعار بعد ترتیبِ دیوان [illegible] میں مصنف نے تصنیف کیے تھے جو اردوئے معلیٰ کے ایک خط موسومہ مولانا علائی میں موجود ہیں اس خط میں مرزا نے مولانا علائی کو ہدایت کی تھی کہ وہ دیوان کے حاشیہ پر چڑھا لیں۔ اسی وجہ سے ہم نے بھی دیوان میں شامل کر دیے ۱۲

[2] تو ستم کیا ہے؟ تو ستم اور کسے کہتے ہیں یعنی رقیب پر لطف کرنا ہی مجھ پر ستم کرنا ہے ۱۲۔

وہ داد و دید گرانمایہ شرط ہی ہمدم
وگرنہ مہر سلیمان و جام جم کیا ہی

سخن میں خامۂ غالب کی آتش افشانی
یقیں ہی ہم کو بھی لیکن اب اس میں دم کیا ہی

۱۱۴

باغ پا کر خفقانی یہ ڈراتا ہی مجھے
سایۂ شاخِ گل افعی نظر آتا ہی مجھے

جوہرِ[۱] تیغ بہ سرچشمۂ دیگر معلوم
ہوں میں وہ سبزہ کہ زہراب اُگاتا ہی مجھے

مدعا[۲] محوِ تماشائے شکستِ دل ہی
آئنہ خانہ میں کوئی لیے جاتا ہی مجھے

[۱] جس طرح تیغ کا جوہر صرف زہراب میں بجھانے ہی سے نمودار ہوتا ہی اسی طرح میں وہ سبزہ ہوں جس کی نشو و نما صرف غم اور غصہ سے ہوتی ہی یعنی میری سرشت میں غم اور غصہ ہی۔ زہراب سے مراد غم اور غصے سے ہی۔ زہراب کے لفظی معنی ہیں زہریلا ہوا پانی۔ زہر کے لفظ کو فارسی شعرا نے اصل معنی کے علاوہ مجازاً غیظ و غضب کے معنی میں لکھا ہی اور اس کو شگوفے سے تشبیہ دیکر "زہر و مبارک" بھی لکھا ہی اسی فارسی محاورہ سے غالب نے اس شعر میں زہر آب اُگاتا لکھا ہی ۱۲۔

[۲] فارسی اضافتوں کو دور کرکے اس شعر کو اردو نثر میں اس طرح پڑھیں گے (میرا مدعا شکستِ دل کے تماشے میں محو ہی (ایسا معلوم ہوتا ہی) کہ کوئی مجھے آئینوں کے گھر میں لیے جاتا ہی) مطلب یہ ہی کہ حصولِ مدعا سے نا اُمیدی اور یاس ہو جانے کے سبب میرا دل ٹوٹ گیا ہی اور تو مدعا اپنے دل کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کا تماشہ دیکھ رہا ہی۔ دل ایک آئینہ تھا جب وہ ٹوٹا تو بہت سے آئینے پیدا ہوگئے اور آئینہ خانہ بن گیا۔ طباطبائی۔

نالہ[1] سرمایۂ یک عالم و عالم کفِ خاک
آسماں بیضۂ قمری نظر آتا ہے مجھے

زندگی میں تو وہ محفل سے اٹھا دیتے ہیں
دیکھوں اب مر گئے پر کون اٹھاتا ہے مجھے

۲۱۵
رونق[2] نہ ہی ہوئی ہے کوکبۂ شہریار کی
اترائے کیوں نہ خاک سرِ رہگذار کی

جب اس کے دیکھنے کے لیے آئیں بادشاہ
لوگوں میں کیوں نمود نہ ہو لالہ زار کی

بھوکے نہیں ہیں سیرِ گلستاں کے ہم ولے
کیونکر نہ کھائیے کہ ہوا ہے بہار کی

۲۱۶
ہزاروں[3] خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

---

[1] شاعر کہتا ہے کہ نالہ ہی ایک عالم کا سرمایہ ہے اور خود عالم یعنی دنیا ایک مشتِ خاک ہے اور آسمان بیضۂ قمری۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا میں نالے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ دنیا دار المحن ہے اور آسمان نالے کا پیدا کرنے والا ہے یعنی جس طرح انڈے سے بچے نکلتے ہیں اسی طرح آسمان سے نالے پیدا ہوتے ہیں۔ فارسی شعرا ہمیشہ رنج و مصیبت کے پیدا ہونے کا الزام آسمان کے سر رکھا کرتے ہیں۔ غالب نے اس پرانے خیال کو کہ دنیا میں جو مصیبتیں آتی ہیں ان کا مورث آسمان ہے نئے انداز سے ادا کیا ہے۔ آسمان کو بیضۂ قمری اس مناسبت سے کہا ہے کہ قمری کا رنگ خاکی ہوتا ہے۔

[2] کوکبہ۔ جماعت خادمانِ شاہی ۱۲

[3] ہزاروں خواہشیں ایسی ہیں اس کے بعد جملہ "دل میں باقی ہیں" المقدر۔ خواہش پہ دم نکلنا اس کے پورے ہونے کی جلدی کرنا۔ اس شعر میں دم نکلنا۔ انھیں معنوں میں استعمال ہوا ہے جیسے بولتے ہیں کیوں دم نکلا جاتا ہے؟ کیوں مرے جاتے ہو؟ یعنی کیوں جلدی کرتے ہو۔ ۱۲

ڈرے کیوں میرا قاتل؟ کیا رہیگا اُس کی گردن پر؟

وہ خوں جو چشمِ تر سے عمر بھر یوں دم بدم نکلے

[۱] نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن

بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

[۲] بھرم کھل جائے ظالم تیرے قامت کی درازی کا

اگر اس طرۂ پُرپیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

مگر لکھوائے کوئی اُس کو خط۔ تو ہم سے لکھوائے

ہوئی صبح۔ اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

ہوئی اس دور میں منسوب مجھ سے بادہ آشامی

پھر آیا وہ زمانہ۔ جو جہاں میں جامِ جم نکلے

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی

وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے

---

[۱] عاقل خاں رازی نے بھی فارسی میں اس مضمون کو لکھا ہے "نہ مرا کرد غریبانہ سر کوئے تو جدا۔ اول این حادثہ بر آدم و حوا بگذشت" لیکن غالب کے یہاں "بہت بے آبرو ہو کر" کے ٹکڑے نے جو لطف پیدا کر دیا ہے وہ فارسی شعر میں کہاں

[۲] اس مصرعہ کو بہت کے لفظ پر پورا زور دیکر پڑھنے سے شعر کے معنی حاصل ہوتے ہیں۔

[۳] طرۂ پرپیچ و خم سے زلف اور زلف کا پیچ و خم نکلنے سے زلف کا کھل جانا مراد ہے

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اُسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

ذرا کر زور سینے پر کہ تیرِ پُرستم نکلے
جو وہ نکلے تو دل نکلے جو دل نکلے تو دم نکلے

خدا کے واسطے پردہ نہ کعبہ سے اُٹھا ظالم
کہیں ایسا نہ ہو یاں بھی وہی کافر صنم نکلے

کہاں میخانہ کا دروازہ؟ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتے تھے کہ ہم نکلے

۲۱۷

کوہ کے ہوں بارِ خاطر گر صدا ہو جائیے
بے تکلف! اے شرارِ جستہ! کیا ہو جائیے

ؔ یہ شعر اور شعر مابعد عام مطبوعہ دیوانوں میں نہیں ہیں ایک قدیم قلمی تذکرہ سے لیے گئے ہیں

ؔ شاعر شرار سے (جو پتھر سے نکلتا ہے) سوال کرتا ہے کہ اگر ہم صدا ہو جائیں گے تو کوہ کے بارِ خاطر ہونگے (بارِ خاطر اس وجہ سے کہ آواز پہاڑ سے ٹکرا کر واپس چلی آتی ہے) تو اب تو بے تکلف بتا دے کہ ہم کیا ہو جائیں قاعدہ ہے کہ سائل اپنے مخاطب سے جو سوال کرتا ہے تو یہ سمجھ کر سوال کرتا ہے کہ اس سے وہی مشورہ ملیگا جو مخاطب کا تجربہ ہے چونکہ شرار جل بجھ کر فنا ہو جانے کا تجربہ رکھتا ہے اس لیے شاعر بھی اس سے اسی جواب کی توقع رکھتا ہے - ۱۲

بیضہ آسا ننگِ بال و پر ہے یہ کنجِ قفس
از سرِ نو[1] زندگی ہو، گر رہا ہو جائیے

مستی[2] بہ ذوقِ غفلتِ ساقی ہلاک ہے جز زخمِ تیغِ ناز نہیں دل میں آرزو جوشِ[3] جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں اسدؔ	۲۱۸	موجِ شراب یک مژۂ خوابناک ہے جیبِ خیال بھی ترے ہاتھوں سے چاک ہے صحرا ہماری آنکھ میں یک مشتِ خاک ہے
لبِ[4] عیسیٰ کی جنبش کرتی ہے گہوارہ جنبانی	۲۱۹	قیامت کشتۂ لعلِ بتاں کا خوابِ سنگیں ہے

[1] دنیا کو کنجِ قفس سے نسبت دی ہے شاعر کہتا ہے کہ ہم اس دنیا سے تنگ آ گئے ہیں۔ اگر اس کی زندگی سے نجات مل جائے تو گویا از سرِ نو زندگی ہو جائے جس طرح پرند کی انڈے سے نکلنے کے بعد نئی زندگی شروع ہوتی ہے ۱۲۔

[2] ساقی کی غفلت شعاری کے ذوق نے مستی کو بھی ہلاک کر دیا یعنی نشۂ شراب کو ساقی کی غفلت شعاری نے مست بنا رکھا ہے اور اس کی غفلت کا خود شراب پہ یہ اثر ہوا ہے کہ وہ چشمِ ساغر کی مژۂ خواب آلود بن گئی ہے یعنی سرشار اور متوالی ۱۲۔

[3] ہمارا جوشِ جنوں اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ صحرا ہماری آنکھ میں ایک مٹھی بھر خاک کے برابر ہے یعنی بے حقیقت ہے ۱۲۔

[4] لعلِ بتاں: لعلِ لبِ محبوباں۔ مطلب یہ ہے کہ کشتۂ لعلِ لبِ بتاں کی نیند قیامت کی نیند ہے کہ لبِ عیسیٰ کی جنبش بھی اس کو زندہ نہیں کر سکتی زندہ کرنا تو درکنار اس کی جنبش سے ان کی غفلت اور بھی ترقی کرتی جاتی ہے ۱۲۔

آمدِ سیلابِ[1] طوفانِ صدائے آب ہے بزمِ مے[2] وحشت کدہ ہے کس کی چشمِ مست کا	۲۲۰	نقشِ پا جو کان میں رکھتا ہے اُنگلی جادہ سے شیشے میں نبضِ پری پنہاں ہے موجِ بادہ سے
ہوں میں بھی تماشائیِ نیرنگِ تمنّا	۲۲۱	مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بر آوے
سیاہی جیسے گر جاوے دمِ تحریر کاغذ پر	۲۲۲	مری قسمت میں یوں تصویر ہے شب ہائے ہجراں کی

[1] نقشِ پا کو کان سے اور جادہ (راستہ) کو بوجہ اس کی درازی کے شاعر نے انگلی سے تشبیہ دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آج جو نقشِ پا نے خود کان بنا کر جادہ کو بطورِ انگشت استعمال کیا ہے یعنی طوفانِ صدائے آب زور و شور سے بہہ رہے کی آواز کو سن کر وہ کان میں انگلی رکھے ہوئے ہے اس سے آمدِ سیلاب کا پتہ چلتا ہے گویا نقشِ پا کو طوفانِ صدائے آب سے یہ خوف لگا ہوا ہے کہ سیلاب آکر اس کو فنا کر دیگا۔ مولانا طباطبائی نے اپنی شرح میں اس شعر پر یہ اعتراض کیا ہے کہ جادہ کے بعد بوجہ اس دو حرف منسوبہ "سے" کے آجانے کے جادہ کی دال کو زیر ہے اور دوسرے شعر میں "موجِ بادہ" آیا ہے اور بادہ کی دال کو زبر ہے بوجہ موج سے فارسی ترکیب کے ساتھ مضاف ہونے کے زیر نہیں ہو سکتا۔ اس لیے جادہ کا قافیہ غلط ہے۔ لیکن غالب پر یہ اعتراض اس لیے صحیح نہیں ہو سکتا کہ متقدمین نے ایسے قافیہ کو جائز رکھا ہے مثلاً میر تقی کی مثنوی کا ایک شعر ہے "آخر کرے خدا کے حوالہ آئینہ پر پانی ڈالا" یہاں حوالہ کے لام کو مثل جادہ کی دال کے زیر ہے مگر اس کو ڈالا کا قافیہ رکھا گیا ہے۔

[2] اس شعر میں موجِ بادہ کو نبضِ پری سے نسبت دی گئی ہے۔ وجہ نسبت یہ ہے کہ پری میں وحشت ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وحشتِ چشم کے اثر سے شیشے میں موجِ بادہ اچھل رہی ہے ۱۲۔

۱ ہجومِ نالہ- حیرت عاجزِ عرضِ یک افغاں ہی	خموشی- ریشۂ صد نیستاں سے خس بدنداں ہی ۲۲۲
تکلف برطرف- ہی جاں ستاں تر لطفِ بدخویاں	نگاہِ بے حجابِ ناز تیغِ تیزِ عریاں ہی
۲ ہوئی یہ کثرتِ غم سے تلف کیفیتِ شادی	کہ صبحِ عید مجھ کو بدتر از چاکِ گریباں ہی
۳ دل و دیں نقد لا ساقی سے گر سودا کیا چاہے	کہ اس بازار میں ساغر متاعِ دستگرداں ہی
۴ غم آغوشِ بلا میں پرورش دیتا ہی عاشق کو	چراغِ روشن اپنا قلزمِ صرصر کا مرجاں ہی

۵ ۲۲۳
خموشیوں میں تماشا- ادا نکلتی ہی
نگاہ دل سے تری سرمہ سا نکلتی ہی

۱ ہجوم نالہ کو مخاطب کیا گیا ہی اور حرف ندا محذوف ہی۔ ہجوم نالہ سی نالہ کی لشکر کشی کی طرف اشارہ- جب لڑائی میں کوئی گروہ مغلوب ہو جاتا ہی تو وہ عاجزی کے اظہار کے لیے گھاس منہ میں دبا کر فریق غالب کے سامنے آتا ہی جس سے مطلب یہ ہوتا ہی کہ ہم نے ہار مان لی کشت و خون موقوف کرو فارسی میں اس کو "خس بدنداں گرفتن" کہتے ہیں۔ شاعر ہجوم نالہ کو مخاطب کرکے کہتا ہی کہ اے ہجوم نالہ تیرے خوف سے حیرت ایک آہ کرنے میں بھی عاجز ہی اور اسی عجز کے ظاہر کرنے کے لیے خموشی یعنی حیرت نے ریشۂ نیستاں کا تنکا منہ میں لے لیا ہی- ریشۂ صد نیستاں کا ریشہ جس سے سیکڑوں نالے بن سکتے ہیں ۱۲
۲ یہ ہوئی یہ کثرتِ غم سے الخ یہاں یہ بھی اس قدر استعمال ہوا ہی ۱۲۔
۳ متاعِ دستگرداں سے وہ مال مراد ہی جو نقد فروخت ہو کیا خوب سودا نقد ہی اس نقد سے الخ
۴ شاعر کہتا ہی کہ اگرچہ آندھی چراغ روشن کو بجھا دیتی ہی لیکن چونکہ غم سے عاشق کی زندگی ہے اس لیے عشاق کا چراغ مرجان کے چراغ کی مانند ہی جو سمندر میں بھی نہیں بجھتا اور جھکڑ کے طوفان میں بھی روشن رہتا ہی
۵ تماشا ادا نگاہ کی صفت ہی- یعنی وہ نگاہ جس میں تماشا دکھانے کا انداز ہی چونکہ سرمہ کھانے سے انسان کی آواز بیٹھ جاتی ہی اس لیے سرمہ کو خاموشی سے نسبت دی ہی یعنی ایسی نگاہ نکلتی ہی جس میں اشارہ اور کنایہ تک نہیں و سیاہ ابھی عاشق کو بھلی معلوم ہوتی ہی ۱۲۔

فشارِ تنگیِ خلوت سے بنتی ہے شبنم[1]
صبا جو غنچے کے پردے میں جا نکلتی ہے

نہ پوچھ سینۂ عاشق سے آبِ تیغِ نگاہ[2]
کہ زخمِ روزنِ در سے ہوا نکلتی ہے

۲۲۵

جس جا نسیم شانہ کشِ زلفِ یار ہے[3]
نافہ دماغِ آہوئے دشتِ تتار ہے

کس کا سراغِ جلوہ ہے حیرت کو اے خدا[4]
آئینہ فرشِ شش جہتِ انتظار ہے

---

[1] غنچہ چونکہ تنگ اور خلوت طلب ہے اس لیے وہ بادِ صبا کو کوچۂ تنگ میں پاکر ایسا بھینچتا ہے کہ وہ شرم سے پسینہ پسینہ ہو جاتی ہے ۱۲

[2] یعنی جس دروازہ میں وہ جھانکتا ہے اس میں روزن نہ سمجھو بلکہ تیغِ نگاہ نے زخم ڈال دیا ہے اور زخم بھی ایسا گہرا جس میں سے ہوا نکلتی ہے پھر سینۂ عاشق کی کیا حقیقت ہے جس زخم سے ہوا نکلے اور سانس دینے لگے وہ ضرور مہلک ہو جاتا ہے ۱۲

[3] مطلب یہ ہے کہ نسیم سے بوئے زلفِ یار کو لیکر آہوئے تتار کا دماغ نافہ بن گیا ہے عموماً تو نافہ وہ تھیلی ہے جس میں مشک رہتا ہے ہرن کی ناف سے نکلتا ہے لیکن میرے معشوق کی زلفوں کی خوشبو کنگھی کرنے سے منتشر ہو کر ہرن کے دماغ میں جا پہنچی اس لیے بجائے ناف کے اس کا دماغ مشک کا مخزن بن گیا ۱۲

[4] حیرت کس کے سراغِ جلوہ میں مصروف ہے کہ آئینۂ شش جہت انتظار میں فرش بنا ہوا ہے مطلب یہ ہے کہ جب خود حیرت سراغِ جلوہ میں مصروف ہے تو جلوہ کس قدر حیرت زا ہوگا ۱۲

ہے[1] ذرہ ذرہ تنگیِ جا سے غبارِ شوق
گر دام یہ ہے وسعتِ صحرا شکار ہے

دل مدعی و دیدہ بنا مدعا علیہ
نظارہ کا مقدمہ پھر روبکار ہے

چھڑکے[2] ہے شبنم آئنۂ برگِ گل پر آب
اے عندلیب وقتِ وداعِ بہار ہے

پچ آ پڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے
وہ آئے یا نہ آئے پہ یاں انتظار ہے

بے پردہ سوئے وادیِ مجنوں گزر نہ کر
ہر ذرّہ کے نقاب میں دل بے قرار ہے

اے عندلیب یک کفِ خس بہرِ آشیاں
طوفانِ آمد آمدِ فصلِ بہار ہے

دل[3] مت گنوا۔ خبر نہ سہی سیر ہی سہی
اے بے دماغ، آئنہ تمثال دار ہے

---

[1] جگہ کی تنگی کی وجہ سے عاشق کا غبارِ شوق ذرہ ذرہ ہو کر اُڑ رہا ہے اور یہی ذرّے صحرا کا دام بن جائینگے ۱۲

[2] ایران میں ایک رسم ہے کہ شگون کے لیے وقتِ رخصت آئینے پر پانی چھڑکتے ہیں اسی رسم سے "آب بر آئینہ ریختن" فارسی محاورہ پیدا ہوا ہے جس کے معنی ہیں کسی کو رخصت کرنا ۱۲

[3] خبر نہ سہی یعنی دل باخبر نہ سہی خبر سے مطلب معرفتِ الٰہی سے ہے۔ آئینہ تمثال دار ہے۔ اشارہ ہے دل کی طرف جو حسرتوں سے بھرا ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرے دل کو ہاتھ سے نہ دے کیونکہ اس میں بہت سی حسرتیں بھری ہیں اگرچہ معرفتِ الٰہی سے مصفا نہیں لیکن حسرتوں کی تصویر اس کے دیکھ کر اس کی سیر تو ہوگی ۱۲

غفلت کفیلِ عمر و اسدؔ ضامنِ نشاط
اے مرگِ ناگہاں۔ تجھے کیا انتظار ہے

۲۲۵

آئینہ کیوں نہ دوں ؟ کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

حسرت[۱] نے لا رکھا۔ تری بزمِ خیال میں
گلدستۂ نگاہ سویدا۔ کہیں جسے

پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا
افسونِ انتظار۔ تمنا کہیں جسے

سر پر ہجومِ دردِ غریبی سے ڈالیے
وہ ایک مشتِ خاک کہ صحرا کہیں جسے

[۱] لا رکھا کا مفعول "گلدستۂ نگاہ" ہے جو دوسرے مصرع میں واقع ہوا ہے تری بزمِ خیال۔ یعنی معشوق کی بزمِ خیال اشارہ ہے دلِ عاشق کی طرف جس میں معشوق ہر طرف بسا رہتا ہے۔ سویدا۔ دل کا سیاہ نقطہ۔ مطلب یہ ہے کہ حسرتِ نظارہ نے میرے دل میں ایک گلدستۂ نگاہ لا کر رکھ دیا ہے جسے لوگ سویدا کہتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ سمجھنا چاہیے کہ میرے دل میں سیاہ نقطہ نہیں ہے بلکہ حسرت آلودہ نگاہوں کا گلدستہ ہے ۱۲۔

جو چشمِ تر میں حسرتِ دیدار سے نہاں
شوقِ عناں گسیختہ[1]۔ دریا کہیں جسے

درکار ہے شگفتنِ گل ہائے عیش کو
صبحِ بہار، پنبۂ مینا[2] کہیں جسے

غالبؔ۔ بُرا نہ مان جو واعظ بُرا کہے
ایسا بھی۔ کوئی ہو کہ سب اچھا کہیں جسے

۲۲۶

شبنم[3] بہ گلِ لالہ نہ خالی ز ادا ہے
داغِ دلِ بیدرد نظرگاہِ حیا ہے

---

[1] شوقِ عناں گسیختہ = جوشِ اشک ۱۲

[2] عام پھول تو صبحِ بہار کے سپیدی کے نمودار ہونے پر کھلا کرتے ہیں لیکن ہماری عیش و نشاط کے پھولوں کے کھلنے کے لیے پنبۂ مینا کی سپیدی کی ضرورت ہے۔ پنبۂ مینا وہ روئی جو شراب نشاط کی بوتل میں ڈاٹ کے کام میں لائی جائے۔ روئی کا رنگ چونکہ سپید ہوتا ہے اس لیے اس کو صبح کی سپیدی سے تشبیہ دی ہے ۱۲

[3] شاعر کہتا ہے کہ گلِ لالہ پر جو شبنم کے قطرے پڑے ہیں اس میں بھی ایک ادا نکلتی ہے یعنی وہ ایک مطلب کو ادا کر رہے ہیں گویا وہ یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ لالہ میں داغ تو ہے مگر درد نہیں یہ باعث اس کے لیے باعثِ شرم ہے اور اسی شرم کی وجہ سے شبنم کے قطرے عرقِ شرم بن گئے ہیں ۱۲

دل[۱] خوں شدۂ کشمکش حسرت دیدار
آئینہ بدست بت بدمست حنا ہے

شعلے[۲] سے نہ ہوتی۔ ہوس شعلہ نے جو کی
جی کس قدر افسردگی دل پہ جلا ہے؟

تمثال میں تیری ہے وہ شوخی کہ بصد ذوق
آئینہ بہ انداز گل۔ آغوش کشا ہے

قمری[۳] کف خاکستر و بلبل قفس رنگ
اے نالہ نشان جگر سوختہ کیا ہے

خو نے[۴] تری افسردہ کیا وحشت دل کو
معشوقی و بے حوصلگی۔ طرفہ بلا ہے

---

۱ مطلب یہ ہے کہ ہمارا دل کشمکش حسرت دیدار سے خوں ہو کر بت بدمست حنا کے ہاتھ میں آئینہ بن گیا ہے۔ یعنی ہمارا دل اُس کا تغافل ظاہر کرتا ہے۔ بدمست حنا اُس معشوق سے مراد ہے جو حنا لگانے کے شوق میں بدمست ہو ۱۲۔ ۲ جو کی = جو بات کی۔ جی جلا ہے = دل کڑھا ہے افسردگی دل سے دل کے شعلۂ عشق سے خالی ہونے کی طرف اشارہ ہے ۱۲ ۳ اس شعر کے معنی سب شرحوں میں مختلف بیان کیے گئے ہیں ایک شارح نے قفس رنگ کو غلط بتایا ہے وہ کہتے ہیں کہ قفسی رنگ صحیح ہے اور اسی کو صحیح مان کر اس نے شرح لکھی ہے لیکن ہماری رائے میں جو مطلب مولانا حالی نے یادگار غالب میں خود مرزا کے حوالے سے لکھا ہے وہ صحیح ہے اور جو یہ ہے کہ قمری جو ایک کف خاکستر سے زیادہ اور بلبل جو ایک قفس عنصری سے زیادہ نہیں ان دونوں کے جگر سوختہ یعنی عاشق ہونے کا ثبوت صرف اُن کے جلنے اور بولنے سے ہوتا ہے۔ اس شعر میں اے کا لفظ خبر کے معنی میں استعمال ہوا ہے جو مرزا کا اختراع ہے ۱۲ ۴ تیری بدمزاجی نے۔ وحشت دل = خواہش دل کے معنی پہ استعمال ہوا ہے

مجبوری و دعوئ گرفتاریِ الفت
دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہو[1]

معلوم ہوا حالِ شہیدانِ گزشتہ
تیغِ ستم آئینۂ تصویر نما ہو[2]

اے پرتوِ خورشیدِ جہاں تاب اِدھر بھی
سائے کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہو[3]

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر اِن کردہ گناہوں کی سزا ہو[4]

---

[1] مطلب یہ ہو کہ چونکہ ہم مجبوری سے محبت تباہ رہے ہیں اس لیے ہمارے پیمانِ وفا کی مثال ایسی ہو کہ پتھر کے نیچے ہاتھ دب گیا ہو اور نہ نکال سکتے ہوں ۱۲

[2] معشوق کی تیغِ ستم کو آئینہ تصویر نما قرار دیا ہو۔ کیونکہ جس تلوار سے اس نے پہلے چاہنے والوں کو شہید کیا ہو وہی اب عشاق کے گلے پر چل رہی ہو اور اس کی موجودہ تیزی اور رکاوٹ کو دیکھنے سے یہ بخوبی اندازہ ہوتا ہو کہ جو ظلم اس وقت کیے جا رہے ہیں وہی شہیدانِ گزشتہ کو جھیلنے پڑے ہونگے ۱۲

[3] یہ شعر معرفتِ الٰہی میں ڈوبا ہوا ہو۔ پرتوِ خورشیدِ جہاں تاب سے مراد ہو خدا کا نور۔ اس سے مخاطب ہو کر کہتا ہو کہ اے نورِ الٰہی ہمیں بھی اپنی تجلی دکھاوے تاکہ ہم فنا فی الحق ہو جائیں اور جس طرح سائے کی نسبت یہ دعویٰ ہو کہ اس کا کوئی وجود ہو اسی طرح ہم بھی اپنی ہستی کو موہوم سمجھتے ہیں فنا فی الحق ہو جانے سے ہم اس دعوے سے کہ ہماری ہستی کوئی وجود رکھتی ہو نکل آئیں گے۔ جس طرح آفتاب کے چمکنے سے سایہ کی ہستی فنا ہو جاتی ہے ۱۲

[4] ناکردہ گناہ:۔ وہ گناہ جو بسبب عدمِ استطاعت سرزد نہیں ہوئے ۱۲۔

بیگانگیِ خلق سے بیدل نہ ہو غالبؔ
کوئی نہیں ترا تو مری جان خدا ہے

منظور[1] تھی یہ شکل تجلی کو نور کی
قسمت کھلی ترے قد و رخ سے ظہور کی

اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمھاری شراب طہور کی

لڑتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل کہ کیوں اٹھا
گویا ابھی سنی نہیں آواز صور کی

آمد بہار کی ہے جو بلبل ہے نغمہ سنج
اڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی

گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں
کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی

گرمی[2] سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر
کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی

غالبؔ[3] گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں
حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

[1] تجلی سے تجلی الٰہی مراد ہے اور یہ شعر نعت میں کہا گیا ہے ۱۲۔
[2] شاعر کہتا ہے کہ آدمی کو اس قدر تیز زبانی نہیں چاہیے کہ ہر کوئی شکایت کرے ۱۲۔
[3] یہ غزل اُس زمانہ میں لکھ کر بادشاہ ظفر کو سنائی تھی جب اُن کا ارادہ حج کو جانے کا تھا۔ مقطع سے انتہائی شوخی ظاہر ہوتی ہے ایک مصرعہ میں تو حج کے جانے کے لیے کمال اشتیاق کا اظہار کرتے ہیں اور اسی کے ساتھ دوسرے مصرعہ میں اس منت ماننے سے کہ حج کا ثواب حضور کی نذر کروں گا اپنی نظر میں حج کی بے قدری کا ثبوت دیتے ہیں ۱۲۔

۲۲۹

غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے
یہ رنج کہ کم ہے مئے گلفام - بہت ہے

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ
ہے یوں - کہ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے[۱]

نَے تیر کماں میں ہے - نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام[۲] بہت ہے

کیا زہد کو مانوں - کہ نہ ہو گرچہ ریائی
پاداشِ عمل کی طمعِ خام بہت ہے

ہیں اہلِ خرد - کس روشِ خاص پہ نازاں
پابستگیِ رسم و رہِ عام - بہت ہے[۳]

زمزم ہی پہ چھوڑو - مجھے کیا طوفِ حرم سے
آلودہ بہ مے - جامۂ احرام بہت ہے

ہے قہر کہ اب بھی نہ بنے بات کہ اُن کو
انکار نہیں - اور مجھے ابرام[۴] بہت ہے

خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ
رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالبؔ کو نہ جانے
شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

[۱] اس شعر میں اپنی قناعت اور خودداری دونوں باتوں کو بیان کیا ہے۔ قناعت تو یہ ہے کہ شراب کی تلچھٹ ہی اپنے لیے کافی بتاتی ہے لیکن خودداری کے خیال سے ساقی پر اس قناعت کا اظہار نہیں کرتا کیونکہ ایسا ظاہر ہونے سے ساقی اسے کم ہمت اور ذلیل سمجھیگا ۱۲۔

[۲] شاعر نے اس شعر میں تصوف کے اس نکتہ کو بیان کیا ہے کہ گوشہ نشینی میں کوئی خطرہ نہیں ہے وہ کہتا ہے کہ ایسی آزادی سے جس میں خطرہ ہو قید میں پڑا رہنا بہتر ہے تصوف کی منظر سے علیحدہ کر کے اس شعر کے یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ جو شخص گمنامی اور کس مپرسی کی حالت میں ہوتا ہے اس کا کوئی دشمن نہیں ہوتا جیسا کہ اس شخص کے ساتھ کرتے ہیں جو اُن میں نمایاں ہوتا ہے

[۳] اہلِ خرد یعنی خواص جو اپنے کو عام طبقے سے بالاتر سمجھتے ہیں کس بات پر ناز کرتے ہیں درآں حالیکہ وہ عام رسموں کے پابند ہیں ۱۲۔

[۴] بات بننا = وصل ہونا۔ ابرام = پکا کرنا۔ مضبوطی کرنا ۱۲۔

۲۳۰

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے[۱]

کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے

پھر وضعِ احتیاط سے رکنے لگا ہے دم[۲]
برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کیے ہوئے

پھر گرمِ نالہ ہائے شرربار ہے نفس
مدت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کیے ہوئے

پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق
سامانِ صد ہزار نمکداں کیے ہوئے

پھر بھر رہا ہے خامۂ مژگاں بخونِ دل[۳]
سازِ چمن طرازیِ داماں کیے ہوئے

باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب
نظارہ و خیال کا ساماں کیے ہوئے

---

[۱] جوشِ قدح سے بزم چراغاں الخ شاعر نے شرابِ آتشیں کے جام کو چراغ سے نسبت دی ہے ۱۲۔
[۲] وضعِ احتیاط سے گریباں پھاڑنے میں احتیاط کرنے کی عادت سے مراد ہے ۱۲۔
[۳] مژگان کا موقلم ہے اور خونِ دل کی روشنائی ہے اس سامان سے صفحۂ دامن پر گلکاریاں منظور ہیں ۱۲۔

دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب
عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کیے ہوئے

دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال
صد گلستاں نگاہ کا ساماں کیے ہوئے

پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا
جاں نذرِ دلفریبیِ عنواں کیے ہوئے

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
زلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کیے ہوئے

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے

اک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغِ مُے سے گلستاں کیے ہوئے

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیرِ بارِ منتِ درباں کیے ہوئے

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوش اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کیے ہوئے

۱۳۲

نوید[۱] امن ہے بے دادِ دوست جاں کے لیے
رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لیے

بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے
رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خوں فشاں کے لیے

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے

رہا[۲] بلا میں بھی میں مبتلائے آفتِ رشک
بلائے جاں ہے ادا تیری اک جہاں کے لیے

فلک[۳]! نہ دور رکھ اس سے مجھے کہ میں ہی نہیں
درازدستیِ قاتل کے امتحاں کے لیے

[۱] مطلب یہ ہے کہ دوست نے اس درجہ بے داد کی کہ آسمان کے لیے کوئی ظلم باقی نہیں چھوڑا اس لیے اب آسمان کے ظلم و ستم سے جان کی کوئی ڈر باقی نہیں رہا ۱۲۔

[۲] اس شعر میں رشک کا اظہار کیا گیا ہے کہ معشوق کی ادا اگرچہ بلا ہے لیکن وہ دوسروں کے لیے بلا بھی کیوں ہے ۱۲۔

[۳] یعنی قاتل سے دور رہنے میں قاتل کو ہاتھ بڑھانا پڑیگا اور یہ فعل درازدستی کے ہم معنی ہے شاعر نے رعایت لفظی سے شعر میں جان ڈالی ہے۔

مثال[1] یہ میری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے

گدا[2] سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

بہ قدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

دیا[3] ہے خلق کو بھی تا اُسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لیے

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا؟
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

نصیرِ دولت و دیں اور معینِ ملت و ملک
بنا ہے چرخِ بریں جس کے آستاں کے لیے

---

[1] اپنی کوشش کو مرغ اسیر کی اُس کوشش سے جو وہ قفس میں آشیانہ بنانے کے لیے کرتا ہے مشابہت دیکر فضول اور بے فائدہ ثابت کیا ہے ۱۲۔

[2] اس شعر میں شاعر نے ایک بہت بڑے مضمون کو دو مصرعوں میں اس خوبی سے نظم کیا ہے کہ اس کی مثال کسی دوسرے شاعر کے کلام میں ملنی مشکل ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ میں جو معشوق کے مکان پر پہونچا تو اول تو چپ کھڑا رہا پاسبان نے سائل سمجھ کر کچھ نہ کہا جب خاموش کھڑے ہوئے کچھ دیر گزر گئی اور معشوق کے شوق نے دل کے بیتاب کر دیا تو بے صبری کے ساتھ پاسبان کے قدموں پر گر پڑا اُس وقت وہ سمجھا کہ اس کا مطلب کچھ اور ہے اور اُس نے وہ سلوک کیا کہ جو قابل اظہار نہیں

[3] یہ شعر اور اس کے بعد کے پانچ شعر نواب تجمل حسین خاں نواب فرخ آباد کی مدح میں لکھے ہیں۔ جنھوں نے مرزا کو نہایت اشتیاق کے ساتھ فرخ آباد آنے کی دعوت دی تھی لیکن وہ نہ جا سکے

زمانہ عہد میں اُس کے ہی محو آرائش
بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لیے

ورق[1] تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحر بے کراں کے لیے

ادائے خاص سے غالبؔ ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

غزلیات تمام ہوئیں

[1] سفینہ :- بمعنی کشتی - لیکن یہاں بیاض یا دیوان مراد ہے ۱۲

قصائد

قصیدۂ اوّل

منقبت میں

[1] سازِیک ذرہ نہیں فیضِ چمن سے بیکار
سایۂ لالۂ بے داغ سویدائے بہار

[2] مستیِ بادِ صبا سے ہے بعرضِ سبزہ
ریزۂ شیشۂ مے جوہرِ تیغِ کہسار

[3] سبز ہے جامِ زمرد کی طرح داغِ پلنگ
تازہ ہے ریشۂ نارنج صفت روئے شرار

[1] مطلب یہ ہے کہ فیضِ چمن سے چمن کا ایک ذرّہ بھی بیکار نہیں ہے۔ یہاں تک کہ لالۂ بے داغ کا سایہ جو زمین پر پڑا ہے وہ دلِ بہار کا سویدا (نقطۂ خال) بن گیا ہے یعنی وہ بیکار نہیں ہے ۱۲۔

[2] تیغ کوہ پہاڑ کی چوٹی کو کہتے ہیں اس لیے سبزہ کو کہسار کا جوہرِ تیغ کہا ہے مطلب یہ ہے کہ بادِ صبا کی مستی کے اثر سے وہ سبزہ جو جوہرِ تیغ کہسار تھا ریزۂ مینائے مے بن گیا ہے غرض وجوہ کی مناسبت کی وجہ سے ان الفاظ کو شاعر نے جمع کیا ہے۔ ۱۲

[3] بہار کی تاثیر سے چیتے کے داغ (جو سیاہ ہوتے ہیں) مثلِ جامِ زمرد سبز بن گئے ہیں۔ شرار جو تازہ نہیں ہوتا۔ ریشۂ نارنج کی طرح تر و تازہ ہو گیا ہے۔

مستی ابر سے گلچینِ طرب ہے حسرت ¹ | کہ اس آغوش میں ممکن ہے دو عالم کا فشار

کوہ و صحرا ہمہ معموریِ شوقِ بلبل | راہِ خوابیدہ ² ہوئی خندۂ گل سے بیدار

سونپے ہے فیضِ ہوا صورتِ مژگانِ یتیم | سرنوشتِ دو جہاں ابر ³ بہ یک سطرِ غبار

کاٹ کر پھینکیے ناخن تو بہ اندازِ ہلال | قوتِ نامیہ اس کو بھی نہ چھوڑے بیکار

کفِ ⁴ ہر خاک بہ گردوں شدہ قمری پرواز | دامِ ہر کاغذِ آتش زدہ طاؤس شکار

⁵ میکدہ میں ہو اگر آرزوئے گل چینی | بھول جا یک قدحِ بادہ بہ طاقِ گلزار

لہ گلچینِ طرب ہے حسرت۔ حسرت خوشی کا لطف اٹھاتی ہے مطلب یہ ہے کہ ابر نے چاروں طرف پھیل کر دو عالم کو اپنی آغوش میں لے لیا ہے اس سے مجھ حسرت بھی ہے۔ کیونکہ میرا آغوش خالی ہے مگر یہ حسرت طرب آمیز ہے طرب آمیز اس لیے کہ فی نفسہٖ ابر کا ہونا میرے لیے باعثِ طرب ہے

سلہ راہِ خوابیدہ وہ راہ جس پر کسی کی آمد و رفت نہ تھی سنسان پڑی ہوئی تھی ۱۲۔

سلہ دو جہاں ابر ۔ یعنی کثیر ابر مطلب یہ ہے کہ فیضِ ہوا سے مثلِ یتیم کی مژگانِ خاک آلود کے جس سے مدتوں دریائے اشک جاری تھا تھوڑے سے غبار میں بھی ابرِ کثیر موجود ہے ۱۲

سکہ مطلب یہ ہے کہ بہار نے ہر چیز میں جان ڈال دی ہے۔ ہر کفِ خاک قمری بن گئی ہے اور ہر شعلہ طاؤس بن گیا۔ قمری کا رنگ خاکی ہوتا ہے۔ اس لیے کفِ خاک سے مشابہت دی ہے اور کاغذ جو آگ سے جل کر مشابہ ہو جاتا ہے اس لیے اسے دام سے نسبت دی ہے ۱۲۔

شہ کہتا ہے کہ اگر تو میکدہ کو باغ بنانا چاہتا ہے تو میکدہ کے طاقِ گلزار میں ایک جام شراب رکھ کر بھول جا۔ فیضِ بہار سے ایک جام کے ہزار جام پیدا ہو جائیں گے۔ طاقِ گلزار یا گلزار طاق اس طاق کو کہتے ہیں جو پرانی قلعے کے عمارات میں سب سے بڑا ایوان طاق ہوتا ہے جس میں گل کاری کا کام بنایا جاتا ہے اس کو گلدستوں سے سجاتے ہیں۔ طاقِ گلزار کو باغ کا طاق سمجھنا غلطی ہے ۱۲

موجِ گل[1] ڈھونڈھ بہ خلوت کدۂ غنچۂ باغ
گم کرے گوشۂ میخانہ میں گر تو دستار

کھینچے گر مانیِ اندیشہ چمن کی تصویر
سبزِ مثلِ خطِ نوخیز ہو خطِ پرکار

لعل[2] سے کی ہے پئے زمزمۂ مدحتِ شاہ
طوطیِ سبزۂ کہسار نے پیدا منقار

وہ شہنشاہ کہ جس کی پئے تعمیرِ سرا
چشمِ جبریل ہوئی قالبِ خشتِ دیوار

فلک[3] العرش ہجومِ خمِ دوشِ مزدور
رشتۂ فیضِ ازل سازِ طنابِ معمار

سبزۂ[4] نہ چمن و یک خطِ پشتِ لبِ بام
رفعتِ ہمتِ صد عارف و یک اوجِ حصار

واں[5] کے خاشاک سے حاصل ہو جسے یک پرِ کاہ
وہ رہے مروحۂ بالِ پری سے بیزار

خاکِ صحرائے نجف جوہرِ سیرِ عرفا
چشمِ نقشِ قدم آئینۂ بختِ بیدار

ذرہ[6] اس گرد کا خورشید کو آئینۂ ناز
گرد اس دشت کی امید کو احرامِ بہار

---

[1] خلوت کدۂ غنچۂ باغ یعنی خود باغ (اضافت بیانی ہے) موجِ گل سے گل کا کثرت سے پیدا ہونا مراد ہے ۱۲۔

[2] اس شعر میں سبزۂ کہسار کو طوطی اور لعل کو جو پہاڑوں سے نکلتا ہے منقارِ طوطی کہا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ طوطی مع منقار حضرت کی مدح سرائی کے لیے پیدا ہوئی ہے ۱۲۔

[3] ہجوم کا لفظ کثرتِ خمیدگی ظاہر کرنے کے لیے آیا ہے۔ دوسرے مصرعہ میں ساز بمعنی سامان طنابِ معمار کی وہ ڈوری جس سے وہ دیوار کی کجی و راستی کو ناپتا ہے اس شعر میں روضے کی بلندی و راستی کا بیان ہے ۱۲۔

[4] سبزۂ نہ چمن - نو آسمانوں کی طرف اشارہ ہے اور حرفِ عطف جو دونوں مصرعوں میں استعمال ہوا ہے اس سے دو چیزوں کا مقابلہ کر کے مساوات دکھائی ہے۔

[5] مروحۂ بالِ پری - وہ پنکھا جو پری کے بازوؤں سے بنایا جاتا ہے ۱۲۔

[6] نجف کے گرد کے ہر ذرے پر آفتاب کو ناز ہے اور اس کے جنگل کی گرد امید کے لیے فصلِ بہار کا جامۂ احرام ہے ۱۲۔

آفرینش کو ہے واں سے طلبِ مستیٔ ناز ۔ عرضِ خمیازۂ ایجاد ہے ہر موجِ غبار

مطلعِ ثانی

فیض سے تیرے ہے اے شمعِ شبستانِ بہار ۔ دلِ پروانہ چراغاں، پرِ بلبل گلزار

شکلِ طاؤس کرے آئنہ خانہ پرواز ۔ ذوق میں جلوے کے تیرے بہوائے دیدار

تیری اولاد کے غم سے ہے بروئے گردوں ۔ سلکِ اختر میں مہِ نو مژۂ گوہر بار

ہم عبادت کو ترا نقشِ قدم مہرِ نماز ۔ ہم ریاضت کو ترے حوصلے سے استظہار

موج میں تیری نہاں زمزمۂ نعتِ نبی ۔ جام سے تیرے عیاں بادۂ جوشِ اسرار

جوہرِ دستِ دعا آئنہ یعنی تاثیر ۔ یک طرف نازشِ مژگان و دگر سو غمِ خار

سلہ ہر موجِ غبار ایجاد کی انگڑائی ہے۔ یعنی نشہ اتر جانے پر شرابِ فخر ناز کی طلب ہے مطلب یہ ہے سرزمینِ نجف پیدا کرنے کے لیے آفرینش کو اضطرار ہوتا ہے ۱۲۔

سلہ اس شعر میں مہِ نو کو مژہ اور ستاروں کو سلکِ اشک قرار دیا ہے گوہر بار یعنی گوہر برسانے والی اشک کو گوہر اس لیے کہا کہ غمِ حسین علیہ السلام میں آنکھوں سے جو آنسو نکلتے ہیں وہ موتی کا رتبہ رکھتے ہیں۔

سلہ مہرِ نماز: سجدہ گاہ۔ استظہار: پشت پناہ ہونا، مددگار ہونا ۱۲۔

سلہ دستِ دعا آئنہ بقلبِ اضافت آئنۂ دستِ دعا۔ ممدوح کے دستِ دعا کی طرف اشارہ ہے اور ممدوح کی دعا کی تاثیر کو جوہر بتایا ہے۔ آئنہ کو جوہر سے جو نسبت ہے ظاہر۔ مطلب یہ ہے کہ ممدوح کی دعا کی تاثیر جو ہمیشہ شرفِ قبولیت پاتی ہے مژگان کے لیے جو دعا کے وقت اشک بار رہتی باعثِ ناز اور خارِ غم کے لیے موجبِ حسرت ہے ۱۲

مردمک سے ہو عزا خانۂ اقبالِ نگاہ[1] | خاکِ در کی تری جو چشم نہ ہو آئینہ دار
دشمنِ آلِ نبی کو بطرب خانۂ دہر | عرضِ خمیازۂ سیلاب[2] ہو طاقِ دیوار

دیدہ تا دل اسد[3] آئینۂ یک پرتوِ شوق
فیضِ معنی سے خطِ ساغرِ راقم سرشار

قصیدہ دوم

منقبت میں

دہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں[4] | ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خودبیں
بے دلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق | بیکسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں
ہرزہ ہے نغمۂ زیر و بمِ[5] ہستی و عدم | لغو ہے آئینۂ فرقِ جنون و تمکیں

[1] جو آنکھ تیرے در کی آئینہ دار نہ ہو وہ اقبالِ نگاہ کا ماتم خانہ ہو جائے یعنی اندھی ہو جائے آنکھ کی پتلی میں سیاہی ہوتی ہے اس لیے آنکھ کو عزاخانہ کہا ۱۲

[2] خمیازۂ سیلاب موجِ سیلاب کا استعارہ ہے ۱۲

[3] اسد آنکھ سے لیکر دل تک ایک پرتوِ شوق کا آئینہ ہے یعنی وہ ہمہ تن شوق بنا ہوا ہے فیضِ معنی سے راقم حروف کا ساغر سرشار ہے یعنی اس کی تحریر مضامینِ منقبت سے لبریز ہے

[4] اس شعر میں تصوف کے مسئلہ ہمہ اوست کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ۱۲

[5] زیر و بم اور ہستی و عدم میں لف و نشر غیر مرتب ہے زیر سے عدم اور بم سے ہستی مراد ہے جنون و تمکین ۔ دیوانگی اور ہوشیاری ۱۲

نقشِ معنی[1] ہمہ خمیازۂ عرضِ صورت ۔ سخنِ حق. ہمہ پیمانۂ ذوقِ تحسیں

لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم ۔ دُردِ یک ساغرِ غفلت ہے چہ دنیا و چہ دیں

مثلِ مضمونِ[2] وفا باد بہ دستِ تسلیم ۔ صورتِ نقشِ قدم خاک بہ فرقِ تمکیں

عشق[3] بے ربطیِ شیرازۂ اجزائے حواس ۔ وصل. زنگارِ رخِ آئنۂ حسنِ یقیں

کوہکن. گرسنہ مزدورِ طرب گاہِ رقیب ۔ بے ستوں. آئنہ خوابِ گرانِ شیریں

کس نے دیکھا نفسِ اہلِ وفا آتش خیز؟ ۔ کس نے پایا اثرِ نالۂ دل ہائے حزیں؟

سامعِ زمزمۂ اہلِ جہاں ہوں لیکن ۔ نہ سر و برگِ ستائش. نہ دماغِ نفریں

کس قدر ہرزہ سرا ہوں! کہ عیاذاً باللہ ۔ یک قلم خارجِ آدابِ وقار و تمکیں

نقشِ لاحول لکھ اے خامۂ ہذیاں تحریر! ۔ یا علیؓ. عرض کر اے فطرتِ وسواس قریں!

مظہرِ فیضِ خدا. جان و دلِ ختمِ رُسل ۔ قبلۂ آلِ نبیؐ کعبۂ ایجادِ یقیں

---

[1] جو لوگ معنی شناسی کے درپے ہیں وہ محض ظاہرداری کرتے ہیں اور جو لوگ حق گوئی کے اظہار میں بے باکی ظاہر کرتے ہیں وہ بھی صرف تحسین اور ستائش کے خواہشمند ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ معنی شناسی وہ اچھی جس میں ظاہرداری کا لگاؤ نہ ہو اور حق گوئی وہ کارآمد جو تحسین و ستائش کے خیال سے بالاتر ہو ۱۲۔

[2] باد بہ دست سے پشیمانی اور حیرانی اور خاک بہ فرق یعنی خاک بسر ہونے سے ذلت و پریشانی مراد ہے مطلب وہ ہے کہ اس دنیا میں وفا کی طرح تسلیم و رضا سے کچھ فائدہ نہیں اور نقشِ پا کی طرح تمکین و خودداری سے ذلت ہی کا سامنا ہوتا ہے

[3] اہلِ خرد و خللِ حواس کو عشق کہتے ہیں اور وصل زنگار ہے حسنِ یقین کے آئینہ کا۔ یعنی اگر یقین کامل ہو تو وصلِ ظاہری کی ضرورت ہی نہیں ۱۲

ہو وہ سرمایۂ ایجادِ جہاں گرمِ خرام ۱؎
ہر کفِ خاک ہے واں گردۂ تصویرِ زمیں

جلوہ پرداز ہو نقشِ قدم اُس کا جس جا
وہ کفِ خاک ہے ناموسِ دو عالم کی امیں

نسبتِ نام سے اس کی ہے یہ رتبہ کہ رہے
ابداً پشتِ فلک خم شدۂ نازِ زمیں

فیضِ خلق اُس کا ہی شامل ہے کہ ہوتا ہے سدا
بوئے گل سے نفسِ بادِ صبا عطر آگیں

برشِ تیغ کا اُس کی ہے جہاں میں چرچا
قطع ہو جائے نہ سر رشتۂ ایجاد کہیں

کفر سوز اُس کا وہ جلوہ ہے کہ جس سے ٹوٹے
رنگِ عاشق کی طرح رونقِ بتخانۂ چیں

جاں پناہا! دل و جاں فیض رسانا! شاہا!
وصیِ ختمِ رسل تو ہے بہ فتوائے یقیں

جسمِ اطہر کو ترے دوشِ پیمبر منبر
نامِ نامی کو ترے ناصیۂ عرش نگیں

کس سے ممکن ہے تری مدح بغیر از واجب
شعلۂ شمع مگر شمع پہ باندھے آئیں

آستاں پر ہے ترے جوہرِ آئینۂ سنگ
رقمِ بندگیِ حضرتِ جبریلِ امیں

تیرے در کے لیے اسبابِ نثار آمادہ
خاکیوں کو جو خدا نے دیے جان و دل و دیں

تیری مدحت کے لیے ہیں دل و جاں کام و زباں
تیری تسلیم کو ہیں لوح و قلم دست و جبیں

کس سے ہو سکتی ہے مداحیِ ممدوحِ خدا؟
کس سے ہو سکتی ہے آرائشِ فردوسِ بریں

جنسِ بازارِ معاصی اسد اللہ اسد
کہ سوا تیرے کوئی اُس کا خریدار نہیں

شوخیِ عرضِ مطالب میں ہے گستاخ طلب
ہے ترے حوصلۂ فضل پہ از بس کہ یقیں

دے دعا کو مری وہ مرتبۂ حسنِ قبول
کہ اجابت کہے ہر حرف پہ سو بار آمیں

غمِ شبیر سے ہو سینہ یہاں تک لبریز
کہ رہیں خونِ جگر سے مری آنکھیں رنگیں

۱؎ گردۂ تصویرِ زمیں۔ کرۂ زمین سے مراد ہے ۱۲۔

طبع کو اُلفت دلدل ہیں بہ سرگرمیٔ شوق	کہ جہاں تک چلے اُس سے قدم اور مجھ سے جبیں
دلِ الفت نسب و سینۂ توحید فضا	نگہِ جلوہ پرست و نفسِ صدق گزیں
صرفِ اعدا اثرِ شعلۂ دودِ دوزخ	وقفِ احباب گل و سنبلِ فردوس بریں

قصیدہ سوم

شاہ ظفر کی مدح میں عید الفطر کے موقع پر لکھا گیا

ہاں مہِ نو سنیں ہم اُس کا نام	جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام
دو دن آیا ہے تو نظر دمِ صبح	یہی انداز اور یہی اندام
بارے دو دن کہاں رہا غائب	بندہ عاجز ہے گردشِ ایام
اُڑ کے جاتا کہاں کہ تاروں کا	آسماں نے بچھا رکھا تھا دام
مرحبا اے سرورِ خاصِ خواص	حبذا اے نشاطِ عامِ عوام
عذر میں تین دن نہ آنے کے	لے کے آیا ہے عید کا پیغام

۱؎ اُس سے قدم اور مجھ سے جبیں فارسی محاورہ کا ترجمہ ہے یعنی اس کا قدم ہو اور میری جبیں ہو ۱۲۔

۲؎ دلِ الفت نسب الفت سے نسبت رکھنے والا دل۔ سینۂ توحید فضا ایسا سینہ جو توحید سے معمور ہو ۱۲۔

۳؎ مہ نو ہلالِ عید سے مراد ہے ۱۲۔

اُس کو بھولا نہ چاہیے کہنا
صبح جو جائے اور آئے شام

ایک میں کیا کہ سب نے جان لیا
تیرا آغاز اور ترا انجام

رازِ دل[۱] مجھ سے کیوں چھپاتا ہے؟
مجھ کو سمجھا ہے کیا کہیں نمّام

جانتا ہوں کہ آج دنیا میں
ایک ہی ہے اُمید گاہِ انام

میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش
غالبؔ اُس کا مگر نہیں ہے غلام

جانتا ہوں کہ جانتا ہے تو!
تب کہا ہے بہ طرزِ استفہام

مہرِ تاباں کو ہو تو ہو اے ماہ
قربِ ہر روزہ بر سبیلِ دوام

ق

تجھ کو کیا پایہ روشناسی کا
جز بہ تقریبِ عیدِ ماہِ صیام

جانتا ہوں کہ اُس کے فیض سے تو
پھر بنا چاہتا ہے ماہِ تمام

ماہ بن ماہتاب بن میں کون؟
مجھ کو کیا بانٹ دیگا تو انعام

میرا اپنا جدا معاملہ ہے
اور کے لین دین سے کیا کام

ہے مجھے آرزوئے بخششِ خاص
گر تجھے ہے اُمیدِ رحمتِ عام

جو کہ بخشے گا تجھ کو فرِّ فروغ
کیا نہ دے گا مجھے مئے گلفام

جبکہ چودہ منازلِ فلکی
کر چکی قطع تیری تیزیِ گام

تیرے پرتو سے ہوں فروغ پذیر
کوئے و مشکوئے و صحن و منظر و بام

دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز
اپنی صورت کا اک بلوریں جام

پھر غزل کی روش پہ چل نکلا
توسنِ طبع چاہتا تھا لگام

---

[۱] نمّام، چغل خور ۱۲

غزل

زہرِ غم کر چکا تھا میرا کام
تجھ کو کس نے کہا کہ ہو بدنام

مے ہی پھر کیوں نہ میں پیے جاؤں؟
غم سے جب ہو گئی ہو زیست حرام

بوسہ کیسا؟ یہی غنیمت ہے!
کہ نہ سمجھیں وہ لذتِ دشنام

کعبے میں جا بجائیں گے ناقوس
اب تو باندھا ہے دَیر میں احرام

اُس قدح کا ہے دَور مجھ کو نقد
چرخ نے لی ہے جس سے گردشِ جام

بوسہ دینے میں اُن کو ہے انکار
دل کے لینے میں جن کو تھا ابرام[1]

چھیڑتا[2] ہوں کہ اُن کو غصہ آئے
کیوں رکھوں؟ ورنہ غالب اپنا نام

کہہ چکا میں تو سب کچھ۔ اب تو کہہ
اے پری چہرہ پیک[3] تیز خرام!

کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا
ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام؟

تو نہیں جانتا تو مجھ سے سن
نامِ شاہنشہِ بلند مقام

قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ
مظہرِ ذوالجلالِ والاکرام

[1] ابرام یہاں ضد کرنے کے معنی میں آیا ہے ۱۲ -
[2] اُن کے چھیڑنے کے لیے غالب نام رکھا ہے ۱۲
[3] پیک پے (قدم) اور کاف حرفِ نسبت سے مرکب ہے ہرکارہ یا قاصد کو کہتے ہیں ۱۲

شہسوارِ طریقۂ انصاف | نوبہارِ حدیقۂ اسلام
جس کا ہر فعل صورتِ اعجاز | جس کا ہر قول معنیِ الہام
بزم میں میزبانِ قیصر و جم | رزم میں اوستادِ رستم و سام
اے ترا لطف زندگی افزا | اے ترا عہد فرخی فرجام
چشمِ بد دور خسروانہ شکوہ | لوحش اللہ[1] عارفانہ کلام
جاں نثاروں میں تیرے قیصرِ روم | جرعہ خواروں میں تیرے مرشدِ جام[2]
وارثِ ملک جانتے ہیں سب تجھے | ایرج[3] و تور و خسرو و بہرام
زورِ بازو میں مانتے ہیں تجھے | گیو[4] و گودرز و بیژن و رہام
مرحبا موشگافیِ ناوک | آفریں آب داریِ صمصام
تیر کو تیرے تیرِ غیر ہدف | تیغ کو تیری تیغِ خصم نیام[5]

---

۱ لوحش اللہ — فارسی میں ماشاء اللہ کی جگہ بولتے ہیں لیکن عربی میں اس کا استعمال نہیں ہوتا نہ لوحش کوئی عربی لفظ ہے ۱۲

۲ مرشد جام — مولانا احمد جام سے مراد ہے جن کو ژندہ پیل بھی کہتے ہیں ۱۲

۳ یہ ایران کے قدیم بادشاہوں کے نام ہیں ۱۲

۴ گیو ایران کے ایک پہلوان کا نام ہے۔ اس کے باپ کا نام گودرز تھا اور وہ بھی پہلوان تھا۔ بیژن گیو کا لڑکا اور رستم کا بھانجا تھا۔ افراسیاب کی لڑکی منیژہ پر عاشق ہو گیا تھا۔ گودرز کا بیٹا [illegible] گیو کا بھائی تھا جس نے خاندانِ ایران کے نامور پہلوانوں کی تعداد میں داخل ہو کے خسرو اور لہراسپ شاہانِ ایران کے ملازمت میں رہ کر ملکی خدمتیں انجام دی تھیں اور انہیں کی سپردگی میں تھے ۱۲

۵ تیغ خصم نیام — وہ تلوار جس کا میان دشمن ہی کا جسم ہو یعنی جو دشمن کے جسم کے اندر پہنچ کر دم لیتی ہو ۱۲

رعد کا کر رہی ہو کیا دم بند / برق کو دے رہا ہو کیا الزام
تیرے فیلِ گراں جسد کی صدا / تیرے رخشِ سبک عناں کا خرام
فنِ[1] صورت گری میں تیرا گرز / گر نہ رکھتا ہو دستگاہ تمام — ق
اس کے[2] مضروب کے سر و تن سے / کیوں نمایاں ہو صورتِ ادغام
جب ازل میں رقم پذیر ہوئے / صفحہ ہائے لیالی و ایام
اور اُن اوراق میں بہ کلکِ قضا / مجملاً مندرج ہوئے احکام
لکھدیا شاہدوں کو عاشق کش / لکھدیا عاشقوں کو دشمن کام
آسماں کو کہا گیا کہ کہیں / گنبدِ تیز گرد نیلی فام
حکمِ ناطق[3] لکھا گیا کہ لکھیں / خال کو دانہ اور زلف کو دام
آتش و آب و باد و خاک نے لی / وضعِ سوز و نم و رم و آرام
مہرِ رخشاں کا نام خسروِ روز / ماہِ تاباں کا اسم شحنۂ شام

---

[1] صورت گری :- تصویر کشی ۔ دستگاہ :- وہ سرمایہ جو کسی کے قبضہ و تصرف میں ہو اور اہلِ حرفہ کے کارخانہ کو بھی کہتے ہیں ۔ یہاں مراد قدرت سے ہی ۱۲ ۔

[2] یہ شعر اپنے پہلے شعر کے ساتھ قطعہ بند ہی ۔ مطلب یہ ہی کہ تیرا گرز تصویر کشی کے فن میں عجیب قدرت رکھتا ہی کہ اپنے کشتوں کے سر و تن کو ایک ایسا کر کے ادغام کی صورت بنا دیتا ہی ۔

ادغام عربی لغت ہی ۔ گھوڑے کے منہ میں لگام دینے کو کہتے ۔ اصطلاح صرف میں ایک جنس کے دو حرفوں کو ملا کر پڑھنا مراد ہی ۱۲

[3] لف و نشر مرتب ہی ۱۲ ۔

تیری[1] توقیع سلطنت کو بھی
دی بدستور صورتِ ارقام

کاتبِ حکم نے بموجب حکم
اُس رقم کو دیا طرازِ دوام

ہے ازل سے روانیِ آغاز
ہو ابد تک رسائیِ انجام

قصیدہ چہارم

صبح دم دروازۂ خاور کھلا
مہرِ عالمتاب کا منظر کھلا

خسروِ انجم کے آیا صرف میں
شب کو تھا گنجینۂ گوہر کھلا

وہ بھی تھی اک سیمیا[2] کی سی نمود
صبح کو رازِ مہ و اختر کھلا

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازیگر کھلا

سطحِ گردوں پر پڑا تھا رات کو
موتیوں کا ہر طرف زیور کھلا

صبح آیا جانبِ مشرق نظر
اِک نگارِ آتشیں رُخ سر کھلا

تھی نظر بندی کیا جب ردِ سحر
بادۂ گلرنگ کا ساغر کھلا

لا کے ساقی نے صبوحی کے لیے
رکھ دیا ہے ایک جامِ زر کھلا

بزمِ سلطانی ہوئی آراستہ
کعبۂ امن و اماں کا در کھلا

---

[1] توقیع فرمان ۱۲۔
[2] سیمیا۔ جادوگری کا ایک فن جس کے ذریعے سے اشکال وہمی وغیرہ جن کا کوئی وجود نہ ہو نظر آنے لگتے ہیں ۱۲۔

تاجِ زریں مہرِ تاباں سے سوا — خسروِ آفاق کے منہ پر کھلا

شاہِ روشن دل بہادر شہ کہ ہے — رازِ ہستی اُس پہ سر تا سر کھلا

وہ کہ جس کی صورتِ تکوین میں — مقصدِ نُہ چرخ و ہفت اختر کھلا

وہ کہ جس کے ناخنِ تاویل سے — عقدۂ احکامِ پیغمبر کھلا

پہلے دارا[۱] کا نکل آیا ہے نام — اُس کی سرہنگوں کا جب دفتر کھلا

روشناسوں[۲] کی جہاں فہرست ہے — واں لکھا ہے چہرۂ قیصر کھلا

ق

توسنِ شہ میں ہے وہ خوبی کہ جب — تھان سے وہ غیرتِ صرصر کھلا

نقشِ پا[۳] کی صورتیں وہ دلفریب — تو کہے بت خانۂ آزر کھلا

مجھ پہ[۴] فیضِ تربیت سے شاہ کے — منصبِ مہر و مہ و محور کھلا

لاکھ عقدے دل میں تھے لیکن ہر ایک — میری حدِ وسع سے باہر کھلا

تھا دلِ وابستہ قفلِ بے کلید — کس نے کھولا؟ کب کھلا؟ کیونکر کھلا؟

---

[۱] سرہنگ:- یہ لفظ سر اور آہنگ سے مرکب ہے- وہ سپاہی جو مخالف کا سر لینے کا قصد رکھتا ہو ۱۲

[۲] واں لکھا ہے چہرۂ قیصر کھلا- چہرۂ قیصر کھلا کھلا لکھا ہے- یعنی صاف صاف لکھا ہے ۱۲

[۳] بت خانۂ آزر:- یہاں آزر زے سے صحیح ہے اگر ذال سے آذر سمجھا جائے تو اُس کے معنی فارسی قدیم میں آگ کے ہیں اور بت خانہ آذر کے معنی آتش کدۂ مجوس کے ہو جائیں گے لیکن مجوسیوں کے آتش کدہ میں بت نہیں ہوتے- آزر حضرت ابراہیم کے چچا یا والد کا نام ہے جو بت تراش تھے شاعر نے انہیں کے بت خانہ کی طرف اشارہ کیا ہے

[۴] محور:- کرۂ متحرک کے درمیان میں ایک فرضی اور موہوم لکیر ۱۲ -

باغ معنی کی دکھاؤں گا بہار
مجھ سے گر شاہ سخن گستر کھلا

ہو جہاں گرم غزل خوانی نفس
لوگ جانیں طبلۂ عنبر کھلا

غزل

کنج میں بیٹھا رہوں۔ یوں پر کھلا
کاشکے ہوتا قفس کا در کھلا

ہم پکاریں اور کھلے۔ یوں کون جائے
یار کا دروازہ پائیں گر کھلا

ہم کو ہے اس راز داری پر گھمنڈ
دوست کا ہے راز دشمن پر کھلا

واقعی دل پر بھلا لگتا تھا داغ
زخم لیکن داغ سے بہتر کھلا

ہاتھ سے رکھدی کب ابرو نے کمان؟
کب کمر سے غمزے کی خنجر کھلا؟

مفت کا کس کو برا ہے بدرقہ[1]؟
رہروی میں پردۂ رہبر کھلا

سوز دل کا کیا کرے باران اشک؟
آگ بھڑکی مینہ اگر دم بھر کھلا

نامے کے ساتھ آگیا پیغام مرگ
رہ گیا خط۔ میری چھاتی پر کھلا

دیکھیو غالبؔ سے گر الجھا کوئی
ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

[1] بدرقہ۔ عربی لغت ہے بمعنی محافظ و رہبر ۱۲۔

پھر ہوا مدحت طرازی کا خیال
پھر مہ و خورشید کا دفتر کھلا

خامے نے پائی طبیعت سے مدد
بادباں کے اٹھتے ہی لنگر کھلا

مدح سے ممدوح کی دیکھی شکوہ
عرض سے یاں رتبہ جوہر کھلا

مہر کانپا چرخ چکر کھا گیا
بادشہ کا رایت لشکر کھلا

بادشہ کا نام لیتا ہی خطیب
اب علو پایۂ منبر کھلا

سکۂ شہ کا ہوا ہی روشناس
اب عیار آبروئے زر کھلا

شاہ کے آگے دھرا ہی آئینہ
اب مآل سعی اسکندر کھلا

ملک[۱] کے وارث کو دیکھا خلق نے
اب فریب طغرل و سنجر کھلا

ہو سکے کیا مدح ہاں اک نام ہی
دفتر مدح جہاں داور کھلا

فکر اچھی پر ستائش نا تمام
عجز اعجاز ستائش گر کھلا

جانتا ہوں ہی خط لوح ازل
تم پہ اے خاقان نام آور کھلا

تم کرو صاحب قرانی[۲] جب تلک
ہی طلسم روز و شب کا در کھلا

۱ حکومت کرنا ممدوح کا حق تھا۔ ممدوح کو تخت شاہی پر دیکھ کر لوگوں کو ظاہر ہو گیا کہ طغرل و سنجر فریب سے بادشاہ بن بیٹھے تھے۔ ۲ صاحبقران۔ فاتح اور جلیل القدر بادشاہ سے مراد ہی۔ لفظی معنی یہ ہیں کہ وہ بادشاہ جو قران عظمی کے وقت پیدا ہوا ہو۔ علم نجوم میں قران عظمی سیاروں کی ایک ہیئت کو کہتے ہیں جو وقت خاص پر واقع ہوتی ہی اس ساعت میں جو بادشاہ پیدا ہوتا ہی اس کی نسبت کہا جاتا ہی کہ اس کی سلطنت بہت وسیع اور عرصہ دراز تک قائم رہنے والی ہوتی ہی ۱۲

مثنوی آموں کی تعریف میں

ہاں دلِ دردمند زمزمہ ساز
کیوں نہ کھولے درِ خزینۂ راز

خامے کا صفحے پر رواں ہونا
شاخِ گل کا ہے گلفشاں ہونا

مجھ سے کیا پوچھتا ہے "کیا لکھیے"
نکتہ ہائے خرد فزا لکھیے

بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے
خامہ نخلِ رطب فشاں ہو جائے

آم کا کون مردِ میداں ہے؟
ثمر و شاخ گوے و چوگاں ہے

تاک کے جی میں کیوں رہے ارماں
آئے یہ گوئے اور یہ میداں

آم کے آگے پیش جائے خاک
پھوڑتا ہے جلے پھپھولے تاک

نہ چلا جب کسی طرح مقدور
بادۂ ناب بن گیا انگور

یہ بھی ناچار جی کا کھونا ہے
شرم سے پانی پانی ہونا ہے

مجھ سے پوچھو تمہیں خبر کیا ہے؟
آم کے آگے نیشکر کیا ہے

نہ گل اُس میں نہ شاخ و برگ نہ بار
جب خزاں ہو تب آئے اُس کی بہار

اور دوڑائیے قیاس کہاں
جانِ شیریں میں یہ مٹھاس کہاں؟

جان میں ہوتی گر یہ شیرینی
کوہکن باوجودِ غمگینی

جان دینے میں اُس کو یکتا جان
پر وہ یوں سہل دے نہ سکتا جان

نظر آتا ہے یوں مجھے یہ ثمر
کہ دواخانۂ ازل میں مگر

آتشِ گل پہ قند کا ہے قوام
شیرے کے تار کا ہے ریشہ نام

یا یہ ہوگا کہ فرطِ رافت سے
باغبانوں نے باغِ جنت سے

انگبیں کے بحکم رب الناس
بھر کے بھیجے ہیں سربمہر گلاس

یا لگا کر خضر نے شاخ نبات
مدتوں تک دیا ہے آب حیات

تب ہوا ہے ثمر فشاں یہ نخل
ہم کہاں ورنہ اور کہاں یہ نخل

تھا ترنج زر[1] ایک خسرو پاس
رنگ کا زرد پر کہاں بو باس؟

آم کو دیکھتا اگر اک بار
پھینک دیتا طلائے دست افشار[2]

رونق کارگاہ برگ و نوا
نازش دودمان آب و ہوا

رہرو راہ خلد کا توشہ
طوبیٰ و سدرہ کا جگر گوشہ

صاحب شاخ و برگ و بار ہے آم
ناز پروردۂ بہار ہے آم

خاص وہ آم جو نہ ارزاں ہو
نوبر نخل باغ سلطاں[3] ہو

وہ کہ ہے والی ولایت عہد[4]
عدل سے اس کے ہے حمایت عہد

فخر دیں عز شان و جاہ و جلال
زینت طینت و جمال کمال

---

[1] خسرو کا ترنج زر اور کسریٰ کا سونے کا ساگ مشہور ہے کہا جاتا ہے کہ خسرو پرویز کے پاس ایسا سونا تھا کہ ہاتھ سے دبا کر جو چیز چاہو اس کی بنا لو۔ چنانچہ خسرو نے اس کا ترنج اور بعدہٗ کسریٰ نے اس کا ساگ تیار کرایا۔ جو زینت دسترخوان کے لیے کھانے کے ساتھ چنا جاتا تھا۔ خسرو اور کسریٰ بادشاہان فارس کے نام ہیں جو یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے ۱۲۔

[2] طلائے دست افشار سے اسی سونے کی طرف اشارہ ہے جس کو ہاتھ سے دبا کر جو چیز چاہو بنا لی جائے۔

[3] اس شعر میں "نخل باغ سلطان" سے ولی عہد مراد ہے ۱۲۔

[4] پہلے مصرعہ میں عہد بمعنی عہد و پیمان سلطنت دوسرے مصرعہ میں بمعنی زمانہ و وقت مستعمل ہوا ہے ۱۲۔

کارفرمائے دین و دولت و بخت
چہرہ آرائے تاج و مسند و تخت

سایہ اُس کا ہما کا سایہ ہی
خلق پر وہ خدا کا سایہ ہی

ای مفیض[1] وجود سایہ و نور
جب تلک ہی نمود سایہ و نور

اس خداوند بندہ پرور کو
وارثِ گنج و تخت و افسر کو

شاد و دل شاد و شادماں رکھیو
اور غالبؔ پہ مہرباں رکھیو

قطعات

(۱)

ای شہنشاہِ فلک منظر[2] بے مثل و نظیر
ای جہاندارِ کرم شیوۂ بے شبہ و عدیل

پاؤں سے تیرے ملے فرقِ ارادت اورنگ
فرق سے تیرے کرے کسبِ سعادت اکلیل

تیرا اندازِ سخن شانۂ زلفِ الہام
تیری رفتارِ قلم جنبشِ بالِ جبریل

[1] مفیض: فیض پہونچانے والا ۱۲۔

[2] فلک منظر: بادشاہ کی تعریف ہی یعنی وہ بادشاہ جس کا منظر یعنی بلندی آسمان کی سی ہو ۱۲۔

تجھ سے عالم پہ کھلا رابطۂ قرب کلیم[1] — تجھ سے دنیا میں بچھا مائدۂ بذل خلیل

بسخن[2] اوج دہ مرتبۂ معنی و لفظ — بکرم داغ نہ ناصیۂ قلزم و نیل

تا ترے وقت میں ہو عیش و طرب کی توفیق[3] — تا ترے عہد میں ہو رنج و الم کی تقلیل

ماہ نے چھوڑ دیا ثور سے جانا باہر — زہرہ نے ترک کیا حوت سے کرنا تحویل

تیری دانش مری اصلاح مفاسد کی رہین — تیری بخشش مرے انجاح[4] مقاصد کی کفیل

تیرا اقبال[5] ترحم مرے جینے کی نوید — تیرا انداز تغافل مرے مرنے کی دلیل

بخت ناساز نے چاہا کہ نہ دے مجھ کو اماں — چرخ کج باز نے چاہا کہ کرے مجھ کو ذلیل

پیچھے[6] ڈالی ہے سر رشتۂ اوقات میں گانٹھ — پہلے ٹھونکی ہے بن ناخن تدبیر میں کیل

[1] قرب کلیم اور بذل خلیل ابھی تک لوگوں نے کتابوں اور روایتوں میں سنا تھا لیکن چونکہ یہ دونوں باتیں تجھ کو بھی حاصل ہیں اس لیے اب آنکھوں سے دیکھ لیا ۱۲

[2] تو اپنی سخن سے معنی و لفظ کا مرتبہ بلند کرنے والا ہے اور اپنی بخشش سے قلزم و نیل کی پیشانی پر داغ ڈالنے والا یعنی اُن کو شرمندہ کرنے والا ہے ۱۲

[3] توفیر۔ زیادتی۔ اس شعر کو شعر مابعد کے ساتھ پڑھنے سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ تیرے عہد میں ہمیشہ عیش و عشرت قائم رہے اس لیے ماہ نے ثور سے باہر جانا چھوڑ دیا ہے اور زہرہ نے حوت میں قیام کر لیا۔ ثور اور حوت علم نجوم کی اصطلاح میں برجوں کے نام ہیں۔ ماہ کا برج ثور اور زہرہ کا برج حوت میں قیام مبارک ہوتا ہے ۱۲۔

[4] انجاح۔ مطلب کا پورا ہونا ہے ۱۲۔

[5] اقبال یہاں ملتفت ہونے کے معنی میں استعمال ہوا ہے ۱۲۔

[6] اس شعر میں شعر ماقبل کی توضیح کی گئی ہے یعنی شاعر اپنے بخت کی ناسازی کا بیان کرتا ہے کہ پہلے تو مجھے کسی مصیبت سے نجات پانے کی تدبیر کرنے کے ناقابل بنا دیا اس کے بعد مصیبت میں مبتلا کیا۔ تاکہ میں مصیبت سے نکل نہ سکوں ۱۲۔

تپشِ دل[1] نہیں بے رابطۂ خوفِ عظیم ‏ ‏ ‏ کششِ دم نہیں بے ضابطۂ جرِّ ثقیل

دُرِ معنی سے مرا صفحہ لقا کی ڈاڑھی ‏ ‏ ‏ غمِ گیتی سے مرا سینہ اَمر کی زنبیل[2]

فکر میری گہر اندوزِ اشاراتِ کثیر ‏ ‏ ‏ کلک میری رقم آموزِ عباراتِ قلیل

میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق توضیح ‏ ‏ ‏ میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل

نیک ہوتی مری حالت تو نہ دیتا تکلیف ‏ ‏ ‏ جمع ہوتی مری خاطر تو نہ کرتا تعجیل

قبلۂ کون و مکاں! خستہ نوازی میں یہ دیر ‏ ‏ ‏ کعبۂ امن و اماں! عقدہ کشائی میں یہ ڈھیل

۲

گئے وہ دن کہ نادانستہ غیروں کی وفاداری ‏ ‏ ‏ کیا کرتے تھے تم تقریر ہم خاموش رہتے تھے

بس اب بگڑے پہ کیا شرمندگی جانے دو مل جاؤ ‏ ‏ ‏ قسم لو ہم سے گر یہ بھی کہیں کیوں ہم نہ کہتے تھے

۱۔ میرے دل کی تپش خوفِ عظیم سے خالی نہیں ہے اور میرے لیے سانس کا کھینچنا جرِّ ثقیل کی کشش سے کم نہیں ہے ۱۲۔

۲۔ اَمر کی زنبیل سے عمرو عیار کی زنبیل مراد ہے جس کا ذکر مشہور کتاب داستان امیر حمزہ میں آیا ہے داستان میں عمرو عیار کی زنبیل کی نسبت کہا گیا ہے کہ جو کچھ اس میں پڑتا تھا سب غائب ہو جاتا تھا، اور وہ کبھی پُر نہ ہوتی تھی۔ غالب نے اس شعر میں عمر کا املا الف سے لکھا ہے اور میم کو متحرک استعمال کیا ہے۔ حالانکہ کتاب داستان امیر حمزہ کا جس سے عمرو کی زنبیل کا محاورہ لیا گیا ہے۔ موضوع حضرت امیر حمزہ عم حضور سرورِ کائنات ہیں اور مصنف داستان نے حضرت عمرو بن امیہ صحابی کو اپنی داستان میں عیاری کا عہدہ دیا ہے اور طرح طرح کی عیاریوں کو ان سے منسوب کیا ہے جس کی صرف یہ وجہ معلوم ہوتی ہے کہ آں حضرت صلعم نے انھیں جاسوسی کے لیے مشرکین مکہ میں بھیجا تھا اور مشرکین نے جبیب صحابی کو سولی پر چڑھایا تھا لیکن عمرو بن امیہ صحابی مشرکین کی آنکھ بچا کر جبیب کو سولی سے اتار کر اڑا لے گئے تھے لقا کی داڑھی کی تلمیح بھی اسی داستان کی ہے۔ لقا کی داڑھی میں موتی پروئے گئے تھے اسی طرح شاعر اپنے اشعار کو موتیوں کی لڑی بتاتا ہے سے تعبیر کرتا ہے یہ بیان

	٣	
کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں		اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے
سلہ وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب		وہ نازنیں بتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے
سلہ صبر آزما وہ اُن کی نگاہیں کہ حف نظر		طاقت رُبا وہ اُن کا اشارا کہ ہائے ہائے
وہ میوہ ہائے تازہ و شیریں کہ واہ واہ		وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

	٤	
سکہ ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی		زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے
سکہ خامہ انگشت بہ دنداں کہ اسے کیا لکھیے		ناطقہ سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہیے
مُہرِ مکتوبِ عزیزانِ گرامی لکھیے		شہ حرزِ بازوئے شگرفانِ خود آرا کہیے
سلہ مسی آلودہ سرِ انگشتِ حسیناں لکھیے		داغِ طرفِ جگرِ عاشقِ شیدا کہیے

کرنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے جو فارسی محاورہ تقریر کردن کا ترجمہ ہے ۱۲

سلہ مطرا۔ تر و تازہ ۱۲ سلہ ہف نظر: چشم بد دور۔ اردو کا محاورہ ہے۔ اس لیے بجائے حف کے ہائے ہوز سے اس کا املا صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ عربی میں حیف اس معنی میں استعمال نہیں ہوتا معلوم ہوتا ہے کہ عام طور پر یہ کتابت کی غلطی چلی آئی ہے ۱۲ سکہ اس قطعہ کو مرزا نے کلکتے میں تصنیف کیا تھا جیسا کہ خود مرزا نے اپنے ایک خط موسومہ مرزا حاتم علی مہر میں اس طرح لکھی ہے "مولوی کرم حسین میرے ایک دوست تھے انھوں نے ایک مجلس میں چکنی ڈلی بہت پاکیزہ اور بے ریشہ اپنے کف دست پر رکھ کر مجھ سے کہا کہ اس کی کچھ تشبیہات نظم کیجیے۔ وہاں میں نے بیٹھے بیٹھے نو دس شعر کا قطعہ لکھ دیا اور صلے میں وہ ڈلی ان سے لی" ۱۲ سکہ انگشت بہ دنداں فارسی کا محاورہ ہے اور اب اردو میں بھی مستعمل ہے بمعنی حیرت زدہ ہونے کے اسی طرح سر بہ گریباں متفکر ہونے سے مراد ہے ۱۲ شہ شگرفان خود آرا: حسینان خود آرا۔ شگرف کے لغوی معنی زیبا اور اچھے کے ہیں ۱۲ سلہ مسی آلودہ سر انگشت حسیناں یعنی سر انگشت مسی آلودۂ حسینان۔ انگشت مسی آلودۂ حسینان سے وہ انگلی مراد ہے جو بیچ کی انگلی اور چھنگلیا کے درمیان ہوتی ہے کیونکہ عموماً اسی انگلی سے عورتیں مسی لگاتی ہیں۔ اردو میں اس کو مسی کی انگلی کہتے ہیں ۱۲

خاتم دست سلیماںؑ کے مشابہ لکھیے | سر پستان پری زاد سے مانا[1] کہیے
اختر سوختۂ قیس سے نسبت دیجے | خال مشکین رخ دلکش لیلا کہیے
حجر الاسود دیوار حرم کیجے فرض | نافہ آہوئے بیابان ختن کا کہیے
وضع میں اس کو اگر سمجھیے قاف تریاق | رنگ میں سبزۂ نوخیز مسیحا کہیے
صومعے میں اسے ٹھہرائیے گر مہر نماز | مے کدے میں اسے خشت خم صہبا کہیے
کیوں اسے قفل در گنج محبت لکھیے | کیوں اسے نقطۂ پرکار تمنا کہیے؟
کیوں اسے تکمۂ[2] پیراہن لیلا لکھیے | کیوں اسے نقش پئے ناقۂ سلمیٰ کہیے؟
کیوں اسے گوہر نایاب تصور کیجے | کیوں اسے مردمک دیدۂ عنقا کہیے
اپنے حضرت کے کف دست کو دل کیجے فرض | اور اس چکنی سپاری کو سویدا کہیے

نہ پوچھ اس کی حقیقت حضور والا سے | مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی[3]
نہ کھاتے گیہوں نکلتے نہ خلد سے باہر | جو کھاتے حضرت آدم یہ بیسنی روٹی

[1] مانا کہیے: مشابہ کہیے: یہ محاورہ بھی فارسی کا محاورہ ہے جو مشابہ مانندگی سے مشتق ہے ۱۲

[2] تکمہ: گھنڈی: لیکن اردو میں اُس حلقے کو کہتے ہیں جس میں گھنڈی ڈالتے ہیں یہ استعمال اصلی معنی کے خلاف رائج ہو گیا ہے ناقۂ سلمیٰ: سلمیٰ کی اونٹنی ۱۲

[3] جب بادشاہ ابوظفر کوئی عمدہ چیز کھاتے تھے تو اپنے مصاحبین کو بھی بطور اولوش اس میں سے بھیجا کرتے تھے مرزا کو ایک مرتبہ بیسنی روٹی بھیجی تھی اس کے شکریہ میں یہ قطعہ مرزا نے بادشاہ کے حضور میں لکھ کر بھیجا تھا۔ رباعی نمبر ۹ و ۱۲ بھی اسی قبیل سے ہیں اس قطعہ کے متعلق مولانا حالی نے یادگار غالب میں ایک لطیفہ بھی لکھا ہے جو یہ ہے کہ جس وقت چوبدار بادشاہی یہ اولوش لے کر آیا ایک باہر کا رہنے والا طالب علم جو مرزا سے کچھ پڑھا کرتا تھا موجود تھا

چوبدار (بقیہ بر صفحۂ آئندہ)

سہرا

خوش ہو اے بخت! کہ ہے آج ترے سر سہرا ¹ | باندھ شہزادے جواں بخت کے سر پر سہرا
کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے | ہے ترے حسن دل افروز کا زیور سہرا

کے چلے جانے کے بعد اس نے مرزا سے متعجب ہو کر پوچھا کہ بھینی روٹی ایسی کیا نادر چیز ہے کہ تجھ کو قلعہ کی سرکار سے بطور داد و دہش کے تقسیم ہوتی ہے۔ مرزا نے کہا ارے احمق! چنا وہ چیز ہے کہ اس نے ایک دفعہ جناب الٰہی میں فریاد کی تھی کہ دنیا میں مجھ پر بڑے ظلم ہوتے ہیں، مجھے دلتے ہیں۔ پیستے ہیں۔ بھونتے ہیں، پکاتے ہیں اور مجھ سے سیکڑوں کھانے کی چیزیں بنا کر کھاتے ہیں، جیسا مجھ پر ظلم ہوتا ہے ایسا کسی پر نہیں ہوتا۔ وہاں سے حکم ہوا کہ اے چنے تیری خیر اسی میں ہے کہ ہمارے سامنے سے چلا جا ورنہ ہمارا بھی یہی جی چاہتا ہے کہ تجھ کو کھا جائیں۔"

¹ ابوظفر بہادر شاہ کے چھوٹے اور چہیتے بیٹے جواں بخت کی شادی کے موقع پر مرزا صاحب نے یہ سہرا لکھا تھا۔ شہزادہ جواں بخت نواب زینت محل کے بطن سے تھے۔ ان بیگم صاحب کو بادشاہ کے مزاج میں بڑا دخل تھا اسی وجہ سے بادشاہ شہزادہ جواں بخت کو بہت عزیز رکھتے تھے اور ان کو ولی عہد بنانا چاہتے تھے۔ ان کی شادی میں بہت کچھ دھوم دھام ہوئی تھی۔ اس موقع پر بیگم کے ایما سے مرزا نے یہ سہرا کہا اور ایک سنہرے زرنگار کاغذ پر لکھ کر سونے کی کشتی میں لگا کر بڑے تکلفات کے ساتھ بادشاہ کے حضور میں پیش کیا تھا۔ مقطع کو سن کر بادشاہ کا خیال ہوا کہ اس میں استاد ذوق پر تعریض ہے اور یہاں تک مرزا کو ناگوار گزری اس کے جواب میں استاد ذوق نے بھی بادشاہ کے ایما سے ایک سہرا اسی ردیف و قافیہ میں لکھا تھا جو درج ذیل ہے:-

اے جواں بخت مبارک تجھے سر پر سہرا | آج ہے یمن و سعادت کا ترے سر سہرا
آج وہ دن ہے کہ لائے درِ انجم سے فلک | کشتیٔ زر میں مہِ نو کی لگا کر سہرا

سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے پر اے طرفِ کلاہ
مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لمبر سہرا

ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہوں گے موتی
ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا

سات دریا کے فراہم کیے ہوں گے موتی
تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا

رخ پہ دولہا کے جو گرمی سے پسینا ٹپکا
ہے رگِ ابرِ گہر بار سراسر سہرا

یہ بھی اک بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے
رہ گیا آن کے دامن کے برابر سہرا

جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز
چاہیے پھولوں کا بھی ایک مقرر سہرا

جب کہ اپنے میں سماویں نہ خوشی کے مارے
گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا

رخِ روشن کی دمک گوہرِ غلطاں کی چمک
کیوں نہ دکھلائے فروغِ مہ و اختر سہرا

تارِ ریشم کا نہیں ہے یہ رگِ ابرِ بہار
لائے گا تابِ گراں باریِ گوہر سہرا

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں کہہ دے کوئی اس سہرے سے بڑھ کر سہرا

تابشِ حسن سے مانند شعاعِ خورشید
وہ کہے صلِ علیٰ یہ کہے سبحان اللہ
تابنے اور بنی بن ہے اخلاص بہم
دھوم ہے گلشنِ آفاق میں اس سہرے کی
روئے فرخ پہ جو ہیں تیرے برستے انوار
ایک کو ایک پہ تزئیں ہے دمِ آرائش
ایک گہر بھی نہیں صدکانِ گہر میں چھوڑا
پھرتی خوشبو سے ہوا اترائی ہوئی بادِ صبا

رخِ پر نور پہ ہے تیرے منور سہرا
دیکھیں مکھڑے پہ جو تیرے مہ و اختر سہرا
گوندھے سورۂ اخلاص کو پڑھ کر سہرا
گائیں مرغانِ نوا سنج نہ کیونکر سہرا
تا یہ بارش سے بنا ایک سراسر سہرا
سر پہ دستار ہو دستار کے اوپر سہرا
تیرا بنوایا ہے لے لے کے جو گوہر سہرا
اللہ اللہ رے پھولوں کا معطر سہرا

مرزا نے اپنے سہرے کے جواب میں اُستاد ذوق کا سہرا سُن کر اس قطعے کو بادشاہ کے حضور میں پیش کیا تھا۔ عام دیوانوں میں دیگر قطعات کے سلسلے میں اس قطعے کو سہرے سے پہلے جگہ دی گئی ہے۔ لیکن ہم نے واقعہ کے لحاظ سے اس کو سہرے کے بعد درج کیا ہے تاکہ سہرا پڑھنے کے بعد اس کے مطالب بخوبی ذہن نشین ہو سکیں ۱۲۔

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی — اپنا بیانِ حسنِ طبیعت نہیں مجھے
سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری — کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے
آزادہ رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلح کل — ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں — مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے
اُستاد شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال — یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے
جامِ جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر — سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے

سر پہ طرہ ہے مزین تو گلے میں بدھی — کنگنا ہاتھ میں زیبا ہے تو سر پر سہرا
رونمائی میں تجھے دے مہ و خورشید فلک — کھول دے منہ کو جو تو منہ سے ہٹا کر سہرا
کثرتِ تارِ نظر سے ہے تماشائیوں کے — دمِ نظارہ ترے روئے نکو پر سہرا
دُرِ خوش آب مضامیں سے بنا کر لایا — واسطے تیرے ترا ذوق ثنا گر سہرا

جس کو دعوی سخن ہو یہ سنا دو اُس کو
دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

میں کون ؟ اور ریختہ - ہاں اس سے مدعا — جز انبساط خاطر حضرت نہیں مجھے
سہرا لکھا گیا ز رہ امتثال امر — دیکھا کہ چارہ غیر اطاعت نہیں مجھے
مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات — مقصود اس سے قطع محبت نہیں مجھے
روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ — سودا نہیں جنوں نہیں - وحشت نہیں مجھے
قسمت بری سہی - پہ طبیعت بری نہیں — ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول میں غالب خدا گواہ ؛
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

۸

نصرت الملک بہادر! مجھے بتلا کہ مجھے — تجھ سے جو اتنی ارادت ہے تو کس بات سے ہے
گرچہ تو وہ ہے کہ ہنگامہ اگر گرم کرے — رونق بزم مہ و مہر تری ذات سے ہے
اور میں وہ ہوں کہ گر جی میں کبھی غور کروں — غیر کیا خود مجھے نفرت مری اوقات سے ہے
خستگی کا ہو بھلا جس کے سبب سے سردست — نسبت اک گونہ مرے دل کو ترے ہات سے ہے
ہاتھ میں تیرے رہے توسن دولت کی عنان — یہ دعا شام و سحر قاضی حاجات سے ہے
تو سکندر ہے - مرا فخر ہے ملنا تیرا — گو شرف خضر کی بھی مجھ کو ملاقات سے ہے

اس پہ گزرے نہ گماں ریو و ریا کا ، زنہار
غالب خاک نشیں - اہل خرابات سے ہے

۹

ہے چار شنبہ آخرِ ماہِ صفر چلو[ے]
رکھ دے چمن میں بھر کے مئے مشک بو کی ناند
جو آئے جام بھر کے پیے اور ہو کے مست
سبزے کو روندتا پھرے پھولوں کو جائے پھاند
ٹھلتے ہیں سونے روپے کے چھلے حضور میں
ہے جن کے آگے سیم و زر مہر و ماہ ماند
یوں سمجھیے کہ بیچ سے خالی کیے ہوئے
لاکھوں ہی آفتاب ہیں اور بے شمار چاند

غالبؔ یہ کیا بیاں ہے بجز مدحِ بادشاہ
بھاتی نہیں ہے اب مجھے کوئی نوشتہ خواند

۱۰

اے شاہِ جہاں گیر جہاں بخش جہاندار
ہے غیب سے ہر دم تجھے صد گونہ بشارت
جو عقدۂ دشوار کہ کوشش سے نہ وا ہو
تو وا کرے اُس عقدے کو سو بھی باشارت
ممکن ہے کرے خضر سکندر سے ترا ذکر
گر لب کو نہ دے چشمۂ حیواں سے طہارت
آصف کو سلیماں کی وزارت سے شرف تھا
ہے فخر سلیماں جو کرے تیری وزارت
ہے نقشِ مریدی ترا فرمانِ الٰہی
ہے داغِ غلامی ترا توقیعِ امارت

ے ماہ صفر کے آخر چہار شنبہ کو عوام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یوم صحت سمجھا جاتا ہے اور اس لیے اُس روز خوشی مناتے ہیں اور باغوں کی سیر کو نکلتے ہیں اور اس قطعہ میں اسی خوشی کی طرف اشارہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کے زمانہ میں بادشاہ کے یہاں صفر کے آخری بدھ کو خوشی منائی جاتی تھی اور نقرئی و طلائی چاندی کے چھلے تقسیم ہوتے تھے ۱۲۔

تو آب سے گر سلب کرے طاقتِ سیلاں
تو آگ سے گر دفع کرے تابِ شرارت

ڈھونڈے نہ ملے موجۂ دریا میں روانی
باقی نہ رہے آتشِ سوزاں میں حرارت

ہو گرچہ مجھے نکتہ سرائی میں توغل
ہو گرچہ مجھے سحر طرازی میں مہارت

کیوں کر نہ کروں مدح کو میں ختم دعا پر؟
قاصر ہو ستایش میں تری میری عبارت

نوروز ہے آج اور وہ دن ہے کہ ہوئے ہیں
نظارگیِ[1] صنعتِ حق اہلِ بصارت

تجھ کو[2] شرفِ مہرِ جہانتاب مبارک!
غالب کو ترے عتبۂ عالی کی زیارت

۱۱[3]
افطارِ صوم کی کچھ اگر دستگاہ ہو
اُس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے

جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو
روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

۱۲[4]
اے شہنشاہِ آسمان اورنگ
اے جہاں دارِ آفتاب آثار

---

[1] نظارگی۔ نظارہ کرنے والا

[2] شرفِ مہرِ جہانتاب سے مراد شرفِ آفتاب ہے یعنی تحویلِ آفتاب حمل میں جس کو شرفِ آفتاب کہتے ہیں یا تجھے مبارک ہو۔ عتبہ۔ ڈیوڑھی ۱۲

[3] یہ قطعہ مرزا نے ماہِ مبارک میں ایک روز بادشاہ کے سامنے پڑھا تھا جس کو سن کر خود بہادر شاہ اور ان کے مصاحبین بے اختیار ہنس پڑے ۱۲

[4] یہ وہ قطعہ ہے جو مصنف نے بادشاہ کے حضور میں اس درخواست سے پیش کیا تھا کہ ان کی تنخواہ جو ششماہی پر ملا کرتی تھی ماہ بماہ ملنے لگی تھی۔ چنانچہ یہ درخواست منظور ہوئی تھی ۱۲ شہنشاہ

تھا میں اک بے نوائے گوشہ نشیں | تھا میں اک دردمند سینہ فگار

تم نے مجھ کو جو آبرو بخشی | ہوئی میری وہ گرمی بازار

کہ ہوا مجھ سا ذرۂ ناچیز | روشناس ثوابت و سیار

گرچہ از روئے ننگ بے ہنری | ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار

کہ گر اپنے کو میں کہوں خاکی | جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار

شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں | بادشہ کا غلام کار گزار

خانہ زاد اور مرید اور مداح | تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار

بارے نوکر بھی ہو گیا صد شکر | نسبتیں ہو گئیں مشخص چار

نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں | مدعائے ضروری الاظہار

پیر و مرشد اگرچہ مجھ کو نہیں | ذوق آرائش سر و دستار

کچھ تو جاڑے میں چاہیے آخر | تا نہ دے باد زمہریر آزار

آسمان اورنگ: وہ بادشاہ جس کا تخت آسمان ہو۔ جہاندار آفتاب آثار: وہ بادشاہ جس کی روشنی مثل آفتاب سب کے پھیلی ہوئی ہو چونکہ اس قطعہ میں آگے چلکر جاڑے کے موسم میں سردی کھانے کی تکلیف کا حال بیان کرنا ہے اس لیے ممدوح کو آسمان آثار کہنا ایک لطیف صنعت ہے ۱۲

لہ روشناس ثوابت و سیار یعنی ثوابت و سیارے مجھے پہچاننے لگے ۱۲

کہ دوسرے مصرعہ میں "ہمیشہ سے" اس طرف اشارہ ہے کہ شاہی ملازمت میں داخل ہونے سے پہلے بھی مرزا بحیثیت شاعر بادشاہ کی مدح میں قصیدے گزرانا کرتے تھے اور صلہ پاتے تھے۔ ۱۲

سہ بادِ زمہریر: ٹھنڈی ہوا۔ زمہریر موسم سرما کے معنی میں آتا ہے ۱۲ ۔

کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش
جسم رکھتا ہوں ہے اگرچہ نزار

کچھ خریدا نہیں ہے اب کے سال
کچھ بنایا نہیں ہے اب کے بار

رات کو آگ اور دن کو دھوپ
بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار

آگ تاپے کہاں تلک انساں؟
دھوپ کھائے کہاں تلک جاندار؟

دھوپ کی تابش آگ کی گرمی
وقنا ربنا عذاب النار

میری تنخواہ جو مقرر ہے
اس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار

رسم ہے مردے کی چھ ماہی ایک
خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار

مجھ کو دیکھو تو ہوں بقید حیات
اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار

بس کہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض
اور رہتی ہے سود کی تکرار

میری تنخواہ میں تہائی کا
ہو گیا ہے شریک ساہوکار

آج مجھ سا نہیں زمانے میں
شاعر نغز گوئے[1] و خوش گفتار

رزم کی داستاں اگر سنیے
ہے زباں میری تیغ جوہر دار

بزم کا التزام گر کیجے
ہے قلم میری ابر گوہر بار

ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد
قہر ہے گر کرو نہ مجھ کو پیار

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا
آپ کا نوکر اور کھاؤں ادھار

میری تنخواہ کیجے ماہ بہ ماہ
تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار

ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام
شاعری سے نہیں مجھے سروکار

---

[1] نغز گو: خوش گو ۱۲

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

(۱۲)
سیہ گلیم[1] ہوں لازم ہے میرا نام نہ لے
جہاں میں جو کوئی فتح و ظفر کا طالب ہے
ہوا نہ غلبہ میسر کبھی کسی پہ مجھے
کہ جو شریک ہو میرا شریکِ غالب ہے

(۱۳)
سہل تھا مسہل ولے یہ سخت مشکل آ پڑی
مجھ پہ کیا گزرے گی اتنے روز حاضر بن ہوئے
تین[2] دن مسہل سے پہلے تین دن مسہل کے بعد
تین مسہل تین تبریدیں یہ سب کے دن ہوئے

(۱۴)
خجستہ انجمنِ طوے[3] میرزا جعفر
کہ جس کے دیکھے سے سب کا ہوا ہے جی محظوظ
ہوئی ہے ایسے ہی فرخندہ سال میں غالب
نہ کیوں ہو مادۂ سالِ عیسوی "محظوظ"

۱۸۵۴ء

[1] سیہ گلیم: سیہ بخت۔ شریکِ غالب: وہ شریک جس کو غلبہ حاصل ہو اگر کسرۂ اضافی سمجھا جائے تو اس کے معنی غالب کا شریک سمجھا جائیگا۔ مصنف کے تخلص نے شریکِ غالب کے لفظ میں جو لطف پیدا کر دیا ہے وہ ظاہر ہے۔ ۱۲

[2] تین دن مسہل لینے کے لیے یونانی طبیبوں کے عمل اور رواج کے موافق ۱۱ دن صرف ہوتے ہیں اس کی تفصیل بیان کر کے ۱۱ دن کی رخصت شاعر نے طلب کی ہے۔ مسہل سے پہلے کم سے کم تین دن منضج پاتے ہیں اور ہر مسہل کے بعد ایک دن تبرید اور پھر تینوں مسہل ختم ہو جانے پر تین دن اور تبریدیں پی جاتی ہیں تبرید سے مراد اس دوا سے ہے جو مسہل کے بعد پلائی جاتی ہے۔ یہ قطعہ دربار شاہی کی غیر حاضری کے عذر میں لکھا گیا ہے ۱۲۔

[3] طوے: بیاہ ۱۲۔

۱۵ ہوئی جب میرزا جعفر کی شادی | ہوا بزمِ طرب میں رقصِ ناہید
کہا غالبؔ سے تاریخ اس کی کیا ہے؟ | تو بولا "انشراحِ جشنِ جمشید"

۱۲۷۰ھ

۱۶ گو ایک بادشاہ کے سب خانہ زاد ہیں | دربار دار لوگ بہم آشنا نہیں
کانوں پہ ہاتھ دھرتے ہیں کرتے ہوئے سلام[۱] | اس سے ہے یہ مراد کہ ہم آشنا نہیں

رباعیات

۱ [۲] بعد از اتمامِ بزمِ عیدِ اطفال | ایامِ جوانی رہے ساغر کش حال
آپہنچے ہیں تا سوادِ اقلیمِ عدم | اے عمرِ گزشتہ یک قدم استقبال

۱؎ اس قطعہ میں شاہی دربار میں ایک دوسرے کو سلام کرنے کا دستور بیان کیا گیا ہے جو یہ تھا کہ رعبِ شاہی کی وجہ سے ماتھے پر ہاتھ رکھنے کی جگہ لوگ سیدھا ہاتھ اپنے سیدھے کان پر رکھ لیتے تھے۔ اردو محاورے میں کانوں پر ہاتھ رکھنے کے یہ معنی ہیں کہ ہم بے خبر یا ناآشنا ہیں اس لیے مرزا نے اس طریقۂ سلام میں نکتہ پیدا کیا ہے کہ وہ لوگ اس طریقے سے سلام نہیں کرتے بلکہ ایک دوسرے سے ناآشنا ہونے کا اعلان کرتے ہیں ۱۲۔

۲؎ اس رباعی میں چند روز کے لیے عمرِ رفتہ کے پلٹ آنے کی تمنا کی ہے ۱۲۔

شب۱۔ زلف و رُخِ عرق فشاں کا غم تھا
کیا شرح کروں کہ طرفہ تر عالم تھا ۱
رویا میں ہزار آنکھ سے صبح تلک
ہر قطرۂ اشک دیدۂ پُرنم تھا

آتش بازی ہے جیسے شغلِ اطفال
ہے سوزِ جگر کا بھی اسی طور کا حال ۳
تھا موجدِ۲ عشق بھی قیامت کوئی
لڑکوں کے لیے گیا ہے کیا کھیل نکال

دل۳ تھا کہ جو جانِ دردِ تمہید سہی
بے تابیِ رشکِ حسرتِ دید سہی ۴
ہم اور فسردن، اے تجلّی! افسوس!
تکرار روا نہیں، تو تجدید سہی

ہے خلق حسد۴ قماش لڑنے کے لیے
وحشت کدۂ تلاش لڑنے کے لیے ۵

۱ زلف اور روئے یار کے تصور میں جو آنسو نکلے ان میں زلف کی سیاہی اور روئے یار کی سفیدی بھی شامل ہے یعنی ہر قطرۂ اشک میں آنکھ کی سی کیفیت پیدا ہو گئی ہے اس لیے ہزار آنکھ سے رونا کہا ۱۲

۲ لڑکوں سے مراد محبانِ کم سن ہیں ۱۲

۳ جانِ درد تمہید۔ وہ جان جس کا آغاز درد سے ہے یعنی زندگی پر درد۔ سہی شعر اوّل میں معنی برداشت کے آیا ہے مطلب یہ ہے کہ جب ہم دل رکھتے تھے۔ اس وقت ہم نے زندگانی پر درد اور رشک و حسرتِ دید کی بے تابی کو برداشت کر لیا اور اب تو ہم ہیں اور افسردگی [illegible] میں اے تجلّی یار اگر تکرار ممکن نہیں تو تجدید سہی یعنی تیری تجلّی نے جو سوز کہ اس سے پہلے پیدا کیا تھا اگر وہ مکرر پیدا نہیں ہو سکتا تو اسی کو پھر تازہ کر دے ۱۲

۴ حسد قماش میں وہی ترکیب ہے جو حسد شعار میں ہے مراد حاسد سے ہے لفظی معنی میں وہ شخص جس نے حسد کا جامہ پہن لیا ہے۔ تلاش سے مراد تلاشِ معاش ہے۔ کاغذِ باد: پتنگ

یعنی ہر بارِ صورت کاغذ باد		ملتے ہیں یہ بد معاش لڑنے کے لیے
دل سخت نژند ہو گیا ہی گویا پر یار کے آگے بول سکتے ہی نہیں	۶	اُس سے گلہ مند ہو گیا ہی گویا غالب مُنہ بند ہو گیا ہی گویا
دکھ جی کے پسند ہو گیا ہی غالب واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں		دل رُک رُک کر بند ہو گیا ہی غالب سونا سوگند ہو گیا ہی غالب
مشکل ہی زبس کلام میرا اے دل! آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش	۸	سُن سُن کے اُسے سخنورانِ کامل گویم مشکل، وگرنہ گویم مشکل

۱ شاعر نے اس رباعی میں اپنے زمانہ کے لوگوں کے منافقانہ دوستی کی طرف اشارہ کیا ہی وہ کہتا ہی کہ دنیا میں دو شخصوں کا ملنا ایسا ہی جیسا آپس میں دو پتنگوں کا ملنا کہ ان کے ملنے سے لڑنا مقصود ہی ۱۲

۶ نژند۔ رنجیدہ۔ اس رباعی کے دوسرے مصرعہ میں بعض دیوانوں میں "رُک" کو مکرر لکھا ہی جس کی وجہ سے وزنِ رباعی سے دو حرف زائد ہو جاتے ہیں اور یہ تکرار غلط ہی ۱۲

۸ اس رباعی کے مصرعہ آخر کے دو معنی ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ سخنورانِ کامل کی یہ فرمائش کہ میں عام فہم شعر کہوں اگر پوری کروں تو یہ مشکل ہی کیونکہ میری طبیعت کے خلاف ہی اور اگر ان کی فرمائش پوری نہ کروں تو وہ برا مانتے ہیں۔ دوسرے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ سخنورانِ کامل کی فرمائش پوری نہ کرنے کی وجہ اگر صاف صاف کہتا ہوں تو ان کا کند ذہن ہونا ظاہر ہوتا ہی اور اگر صاف نہیں کہتا ہوں تو میں ملزم ٹھہرتا ہوں ۱۲۔

ہے لطف و عنایاتِ شہنشاہ پہ دال ہے دولت و دین و دانش و داد کی دال	۹	بھیجی[1] ہے جو مجھ کو شاہِ جمجاہ نے دال یہ شاہ پسند دال بے بحث و جدال
آثارِ جلالی و جمالی باہم ہے اب کے شبِ قدر و دوالی باہم	۱۰	ہیں شہ میں صفاتِ ذوالجلالی باہم ہوں[2] شاد نہ کیوں سافل و عالی باہم
تا شاہ شیوعِ دانش و داد کرے ہے صفر کہ افزائشِ اعداد کرے	۱۱	حق شہ کی بقا سے خلق کو شاد کرے یہ دی جو گئی ہے رشتۂ عمر میں گانٹھ
اتنے ہی برس شمار ہوں بلکہ سوا ایسی گرہیں ہزار ہوں بلکہ سوا	۱۲	اس رشتے میں لاکھ تار ہوں بلکہ سوا ہر سیکڑے کو ایک گرہ فرض کریں

[1] شاہ پسند دال سے مراد مونگ کی دال سے ہے جو بادشاہ کے یہاں نہایت اہتمام سے پکا کرتی تھی۔ اس کو بادشاہ پسند کہتے تھے۔ اس دال کا ادنیٰ حصہ پہنچنے کے شکریہ میں یہ رباعی لکھی گئی تھی۔ رباعی نمبر ۱۰ بھی اسی قسم کے موقع پر لکھی گئی تھی ۱۲۔

[2] یہاں سافل سے مرتبۂ سافل مراد ہے اور دیوالی کی بت پرستی کی طرف اشارہ ہے عالی سے عبادت شبِ قدر مراد ہے ۱۲۔

[3] یہ رباعی اور رباعی نمبر ۱۲۔ بادشاہ کی سالگرہ کی تقریب میں لکھی گئی تھی نہایت لطیف پیرایہ میں دونوں ترقی عمر کی دعاؤں پر مشتمل ہیں ۱۲۔

کہتے ہیں[1] کہ اب وہ مردم آزار نہیں جو ہاتھ کہ ظلم سے اٹھایا ہوگا	۱۳	عشاق کی پرسش سے اسے عار نہیں کیوں کر مانوں کہ اس میں تلوار نہیں
ہم گرچہ بنے سلام کرنے والے کہتے ہیں کہیں خدا سے "اللہ اللہ"	۱۴	کرتے ہیں درنگ کام کرنے والے وہ آپ ہیں صبح و شام کرنے والے
سامان[2] خور و خواب کہاں سے لاؤں؟ روزہ مرا ایمان ہے۔ غالب لیکن	۱۵	آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں؟ خس خانہ و برفاب کہاں سے لاؤں؟
ان[3] سیم کے بیجوں کو کوئی کیا جانے گن کر دیویں گے ہم دعائیں سو بار	۱۶	بھیجے ہیں جو ارمغاں شہ والا نے فیروزہ کی تسبیح کے ہیں یہ دانے

[1] ظلم سے ہاتھ اٹھانا۔ ظلم سے دست بردار ہونا یعنی ترک کرنا اس رباعی میں عاشقانہ مضمون نہایت خوبصورتی سے باندھا گیا ہے بالکل اچھوتا خیال ہے ۱۲

[2] یہ رباعی قطعہ نمبر ۱ کے ساتھ ماہ مبارک میں بادشاہ کے حضور میں پیش کی گئی تھی۔ مطلب صاف ہے ۱۲۔

[3] سیم کے بیجوں کی ترکاری سے مراد ہے جو بادشاہ نے بطور تحفہ بھیجی تھی۔ آخر مصرعہ میں فیروزہ کی تسبیح اس مناسبت سے کہی ہے کہ فیروزہ انڈے کی شکل ہوتا ہے جو سیم کے بیج سے مشابہت رکھتا ہے ۱۲۔

رقعہ کا جواب کیوں نہ بھیجا تم نے حاجی کلّو کو دیکے بے وجہ جواب	۱۷	ثاقب، حرکت یہ کی ہی بیجا تم نے غالب کا پکا دیا کلیجا تم نے
اے روشنیٔ دیدۂ شہاب الدین خاں ہوتی ہو تراویح سے فرصت کب تک	۱۸	کٹتا ہی بتاؤ کس طرح سے رمضان سُنتے ہو تراویح میں کتنا قرآن

وہ اشعار و قطعات جو دیوان مروجہ میں نہیں ہیں

قصیدہ (۱)

یہ وہ قصیدہ ہی جو مرزا نے نواب کلب علی خاں بہادر خلد آشیاں والی رامپور کے غسل صحت کی مبارک تقریب میں لکھا تھا چونکہ یہ قصیدہ مرزا کی آخر عمر کا کلام ہی جو دیوان کے طبع ہونے کے بہت دنوں بعد تصنیف ہوا تھا اس لیے دیوان میں شامل نہیں ہی۔ یہ قصیدہ نواب مرزا سعید الدین احمد خاں صاحب طالب دہلوی مرحوم جاگیردار ریاست لوہارو کے ذریعہ سے رسالہ [illegible] دہلی تک پہونچا رسالہ مذکور کی اشاعت ماہ جنوری سنہ ۱۹۱۱ع سے درج ذیل کیا جاتا ہی ۱۲۔

مرحبا سالِ فرخی آئین	۱	عیدِ شوال و ماہ فروردین[۲]

۱؎ یہ دونوں رباعیاں نمبر ۱۷ و ۱۸۔ اردوئے معلیٰ سے لی گئی ہیں۔ کسی دیوان میں شامل نہیں تھیں مرزا نے ایک خط میں مولانا علائی کو لکھکر بھیجی تھیں ۱۲۔

۲؎ فروردین وہ ایرانی سال کا پہلا مہینہ جو موسم بہار میں ہوتا ہی اور تقریباً انگریزی ماہ مارچ یا ہندی ماہ چیت سے مطابق ہوتا ہی ۱۲۔

شب و روز افتخارِ لیل و نہار — مہ و سال اشرفِ شہور[۱] و سنین
گرچہ ہے بعدِ عید کے نوروز — لیک بیش از سہ ہفتہ بعد نہیں
سو اس اکیس دن میں ہولی کی — جابجا مجلسیں ہوئیں رنگیں
شہر میں کو بکو عبیر و گلال — باغ میں سو بسو گل و نسریں
شہر گویا نمونۂ گلزار — باغ گویا نگار[۲] خانۂ چیں
تین تیوہار اور ایسے خوب — جمع ہرگز ہوئے نہ ہونگے کہیں
پھر ہوئی ہے اسی مہینے میں — منعقد محفلِ نشاط قریں
محفلِ غسلِ صحت نواب — رونق افزائے مسندِ تمکیں
بزم گہہ میں امیر شاہ نشان — رزم گہ میں حریفِ شیرِ کمیں
بیٹھ گاہِ حضورِ شوکت و جاہ — خیر خواہِ جنابِ دولت و دیں
جن کی مسند کا آسمان گوشہ — جن کی خاتم کا آفتاب نگیں
جن کی دیوارِ قصر کے نیچے — آسماں ہے گدائے سایہ نشیں
دہر میں اس طرح کی بزم سرور — نہ ہوئی ہو کبھی بروئے زمیں
انجمِ چرخ گوہر آگیں فرش — تودۂ ماہ ساغرِ سیمیں

راجہ اندر کا جو اکھاڑا ہے — ہو وہ بالائے سطحِ چرخِ بریں
وہ نظرگاہِ اہلِ وہم و خیال — یہ ضیا بخشِ چشمِ اہلِ یقیں

[۱] شہور جمع شہر بمعنی ماہ اور سنین۔ سن کی جمع ہے جس کے معنی سال کے ہیں ۱۲
[۲] نگار:- بمعنی نقش و تصویر مجازاً معشوق کو بھی کہتے ہیں اور مہندی سے عورتیں ہاتھ پانوں پر جو نقش بناتی ہیں اُس کو بھی کہتے ہیں ۱۲۔

واں کہاں یہ عطا و بذل و کرم ‏ کہ جہاں گدیہ[1] گر کا نام نہیں

یاں نہیں پر نظر جہاں تک جائے ‏ ژالہ آسا بچھے ہیں در ثمیں

نغمۂ مطربانِ زہرہ نوا ‏ جلوۂ لولیانِ ماہ جبیں

اندر[2] اکھاڑے میں جو کہ ہیں مظنون ‏ یاں وہ دیکھا بچشم صورت بیں

سرورِ مہر[3] فر ہوا جو سوار ‏ بہ کمال تجمل و تزئیں

سب نے جانا کہ ہے پری توسن ‏ اور یاں پری ہے دامن[4] زیں

نقش سُم سمند سے یکسر ‏ بن گیا دشت دامن گل چیں

فوج کی گرد راہ مشک فشاں ‏ رہ رووں کے مشام عطر آگیں

بس[5] کہ بخشی ہے فوج کو عزت ‏ فوج کا ہر پیادہ ہے فرزیں

موکب[6] خاص یوں زمیں پر تھا ‏ جس طرح ہے سپہر پر پرویں

---

[1] گدیہ بالفتح گ فارسی بمعنی دریوزہ ۱۲ -

[2] یعنی راجہ اندر کے اکھاڑے کو جن پریوں سے منسوب کیا جاتا ہے وہ خیالی اور وہمی ہیں یہاں وہ صورتیں مجسم شکل میں موجود ہیں جن کو ہر شخص دیکھ سکتا ہے مظنون بمعنی خیالی ۱۲ -

[3] مہر فر خورشید شکوہ ۱۲ -

[4] اس شعر میں شاہی زین کے دامن کو پری کے بازو سے تشبیہ دی ہے ۱۲

[5] فرزیں بجز گھوڑے کے اور سب مہروں کی چالیں چل سکتا ہے اس لیے شطرنج میں سب سے زبردست مہرہ وہی ہے۔ اگر حریف مقابل کا کوئی پیادہ بڑھتے بڑھتے فرزیں کے خانہ تک پہنچ جائے تو وہ خود فرزیں بن جاتا ہے شاعر کا اشارہ پیادہ کو فرزیں بتلانے سے شطرنج کی اس چال کی طرف ہے ۱۲ -

[6] موکب سوار ہونے کو کہتے ہیں اور سواروں کی جماعت کو بھی کہتے ہیں۔ یہاں موکب خاص سے شاہی سواری مراد ہے ۱۲ -

چھوڑ دیتا تھا گور[1] کو بہرام
ران پر داغِ تازہ دیکے وہیں

اور داغ آپ کی غلامی کا
خاص بہرام کا ہے زیبِ سُریں

بندہ پرور ثنا طرازی سے
مدعا عرضِ فنِ شعر نہیں

آپ کی مدح اور میرا منہ
گر کہوں بھی تو آئے کس کو یقیں

اور پھر اب کہ ضعفِ پیری سے
ہو گیا ہوں نزار و زار و حزیں

پیری و نیستی! خدا کی پناہ
دستِ خالی و خاطرِ غمگیں

صرف اظہار ہے ارادت کا
ہے قلم کو جو سجدہ ریزِ زمیں

مدح گستر نہیں دعا گو ہے
غالبِ عاجزِ نیاز آگیں

ہے دعا بھی یہی کہ دنیا میں
تم رہو زندہ جاوداں آمیں

قطعہ

ایک اہلِ درد نے سنسان جو دیکھا قفس
یوں کہا آتی نہیں کیوں اب صدائے عندلیب [2]

بال و پر دو چار دکھلا کر کہا صیاد نے
یہ نشانی رہ گئی ہے اب بجائے عندلیب

[1] گور کے لغوی معنی قبر اور جنگل کے ہیں گورخر باضافت مقلوب جنگلی گدھے کو کہتے ہیں اور گور خر بجائے خر یعنی تنہا گور بھی بمعنی خرِ صحرائی استعمال ہوتا ہے۔ یہاں گور کے یہی معنی ہیں۔ بہرام۔ عراق کے ایک بادشاہ کا نام تھا جو اپنے عدل کے لیے مشہور تھا۔ چونکہ یہ بادشاہ گورخر کے شکار کا شائق تھا اس لیے اس کو بہرام گور کہنے لگے۔ اسی مناسبت سے بہرام اور گور دونوں لفظ اس شعر میں مرزا نے استعمال کیے ہیں ۱۲۔

[2] سب سے پہلے ان قطعات کا اضافہ طبع سوم میں کرتے ہوئے ہم نے یہ ظاہر کر دیا تھا کہ "بعض نقادانِ سخن ان قطعات کے طرزِ بیان کو حضرت غالب کے رنگ سے

اُٹھا اک دن بگولا سا جو کچھ میں جوشِ وحشت میں	۳	پھرا آسیمہ سر گھبرا گیا تھا جی بیاباں سے
نظر آیا مجھے اک طائرِ مجروح پر بستہ		ٹپکتا تھا سرِ شوریدہ دیوارِ گلستاں سے
کہا میں نے کہ او گمنام آخر ماجرا کیا ہے		پڑا ہے کام تجھ کو کس ستمگر آفتِ جاں سے
ہنسا کچھ کھلکھلا کر پہلے پھر مجھ کو جو پہچانا		تو یہ رویا کہ جوئے خوں بہی پلکوں کے داماں سے
کہا میں صید ہوں اس کا کہ جس کے دامِ گیسو میں		پھنسا کرتے ہیں طائر روز آ کر باغِ رضواں سے
اسی کی زلف و رخ کا دھیان ہے شام و سحر مجھ کو		نہ مطلب کفر سے ہے اور نہ ہے کچھ کام ایماں سے
بچشمِ غور جو دیکھا مرا ہی طائرِ دل تھا		کہ جل کر ہو گیا یوں خاک میری آہِ سوزاں سے

قطعۂ تاریخ

اس کتابِ طرب انتصاب نے جب	۴	آب و تابِ انطباع کی پائی

جداگانہ سمجھتے ہیں۔ اس پر بھی طبع سوم کے ناظرین میں سے بعض اہل الرائے حضرات نے شکایت کی کہ ان قطعات کو دیوانِ غالب میں جگہ دینا غالب کے کلام کی توہین کرنا ہے۔ میں نے نواب عماد الملک سے ان کے متعلق دریافت کیا وہ فرمانے لگے کہ وہ یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ غالب ہی کے مصنفہ ہیں۔ انھوں نے اپنے ایک بزرگ سے سنے تھے جو ان کو غالب سے منسوب کرتے تھے۔ ممکن ہے کہ غالب کا یہ ابتدائی کلام ہو۔

(واللہ اعلم)

اکثر شعرا کا دستور رہا ہے کہ وہ اپنے دیوان کے آخر میں ان قطعاتِ تاریخ کو بھی لکھ دیتے ہیں جو وہ اپنے احباب کی تصانیف یا کسی اور تقریب کی یادگار میں لکھتے ہیں۔ غالب کے اردو دیوان کے آخر میں ایسے صرف دو قطعے نظر آتے ہیں جو نمبر ۳ و ۵ قطعات کے ذیل میں درج ہیں۔ یہ قطعۂ تاریخ دیوان میں نہیں ہے اس کو غالب نے تذکرہ سراپا سخن کی اشاعت کی یادگار میں جو لکھنؤ میں سنہ ۱۲۸۰ھ میں طبع ہوا تھا تصنیف کیا تھا چونکہ غالب کو فنِ تاریخ گوئی سے زیادہ لگاؤ نہ تھا۔ ان کے مادہ

فکرِ تاریخ سال میں مجھ کو
ہندسے پہلے سات سات کے دو
اور پھر ہندسہ تھا بارہ کا
سال ہجری تو ہو گیا معلوم
مگر اب ذوقِ بذلہ سنجی کو
سات اور سات ہوتے ہیں چودہ
غرض اس سے ہیں چاردہ معصوم
اور بارہ امام ہیں بارہ

ایک صورت نئی نظر آئی
دیئے ناگاہ مجھ کو دکھلائی
با ہزاراں ہزار زیبائی
بے شمول عبارت آرائی
ہی جداگانہ کار فرمائی
بہ امیدِ سعادت افزائی
جن سے ہی چشم و جاں کو زیبائی
جن سے ایماں کو ہی توانائی

اُن کو غالب یہ سال اچھا ہی
جو ائمہ کے ہیں تولائی

طبع ہوا تھا تصنیف کیا تھا چونکہ غالب کو فن تاریخ گوئی سے زیادہ لگاؤ نہ تھا ان کو مادہ تاریخ تلاش کرنے میں ہمیشہ اُلجھن ہوتی تھی جیسا کہ اُن کے متعدد خطوط سے ظاہر ہی لیکن جب وہ احباب کی فرمائش سے تنگ آجاتے تھے تو نئے طریقے اختیار کرنے سے جیسا کہ اس تاریخ سے ظاہر ہو خوش اسلوبی کے ساتھ چھٹکارا حاصل کیا کرتے تھے ۔

غزل

شبِ[1] وصال میں مونس گیا ہے بن تکیہ — ہوا ہے موجبِ آرامِ جان و تن تکیہ

خراج بادشہِ چیں سے کیوں نہ مانگوں آج؟ — کہ بن گیا ہے خمِ جعدِ پرشکن تکیہ

بنا ہے تختۂ گل ہائے یاسمیں بستر — ہوا ہے دستۂ نسرین و نسترن تکیہ

فروغِ حسن سے روشن ہے خوابگاہ تمام — جو رختِ خواب ہے پرویں تو ہے پرن تکیہ

مزا ملے کہو کیا خاک ساتھ سونے کا — رکھے جو بیچ میں وہ شوخِ سیم تن تکیہ ۵

اگرچہ تھا یہ ارادہ مگر خدا کا شکر — اٹھا سکا نہ نزاکت سے گلبدن تکیہ

ہوا ہے کاٹ کے چادر کو ناگہاں غائب — اگرچہ زانوئے نل پہ رکھے دمن تکیہ

بضربِ تیشہ وہ اس واسطے ہلاک ہوا — کہ ضربِ تیشہ پہ رکھتا تھا کوہکن تکیہ

یہ رات بھر کا ہے ہنگامہ صبح ہونے تک — رکھو نہ شمع پہ اے اہلِ انجمن تکیہ

اگرچہ پھینک دیا تم نے دور سے لیکن — اٹھائے کیونکہ یہ رنجورِ خستہ تن تکیہ

غش آ گیا جو پس از قتل میرے قاتل کو — ہوئی ہے اس کو مری نعشِ بے کفن تکیہ

شبِ فراق میں یہ حال ہے اذیت کا — کہ سانپ فرش ہے اور سانپ کا ہے من تکیہ

روا رکھو نہ رکھو تھا جو لفظ "تکیہ کلام" — اب اس کو کہتے ہیں اہلِ سخن "سخن تکیہ"

ہم اور تم فلکِ پیر جس کو کہتے ہیں — فقیر غالبِ مسکیں کا ہے کہن تکیہ

[1] یہ غزل الہلال کلکتہ مطبوعہ ۲۲ جولائی ۱۹۱۲ء سے لی گئی ہے جریدہ مذکورہ نے حضرت طالب دہلوی کے حوالہ سے اس غزل کو مرزا کے غیر مطبوعہ کلام کے ذیل میں شائع کیا تھا۔ ۱۲

جس دن سے کہ ہم خستہ گرفتارِ بلا ہیں[1]	٦	کپڑوں میں جوئیں بخیے کے ٹانکوں سے سوا ہیں
میں ہوں مشتاقِ جفا مجھ پہ جفا اور سہی[2]	٧	تم ہو بیداد سے خوش اس سے سوا اور سہی
غیر کی مرگ کا غم کس لیے اے غیرتِ ماہ		ہیں ہوس پیشہ بہت وہ نہ ہوا اور سہی
تم ہو بت پھر تمہیں پندارِ خدائی کیوں ہے		تم خداوند ہی کہلاؤ خدا اور سہی
حُسن میں حور سے بڑھ کر نہیں ہونے کی کبھی		آپ کا شیوہ و انداز و ادا اور سہی
تیرے کوچے کا ہے مائل دلِ مضطر میرا		کعبہ اک اور سہی قبلہ نما اور سہی
کوئی دنیا میں مگر باغ نہیں ہے واعظ		خلد بھی باغ ہے خیر آب و ہوا اور سہی
کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملا لیں یارب		سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی
مجھ کو وہ دو کہ جسے کھا کے نہ پانی مانگوں		زہر کچھ اور سہی آبِ بقا اور سہی
مجھ سے غالبؔ یہ علائی نے غزل لکھوائی		ایک بیداد گرِ رنج فزا اور سہی
بس کہ فعّالِ ما یرید ہے آج[3]	ق	ہر سلحشور انگلستان کا

[1] مرزا صاحب اتفاقاً قید ہو گئے تھے وہاں کپڑوں میں جوئیں ہو گئیں تھیں۔ اُن کو مرزا چُن رہے تھے ایک رئیس نے جا کر پرسشِ مزاج کی۔ مرزا نے فی البدیہہ شعر پڑھا بخیے کے ٹانکوں سے جوؤں کی تشبیہ کس قدر تام اور نفیس ہے ۱۲۔

[2] یہ غزل مرزا نے دیوانِ ریختہ مرتب ہونے کے بعد [illegible] میں مولانا علائی اپنے شاگرد رشید کو لکھ کر بھیجی تھی اس لیے اصل دیوان میں شامل نہیں ہے۔ اردوے معلیٰ میں مرزا کی ایک خط کیساتھ درج ہے۔

[3] یہ قطعہ مرزا نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد دہلی کے حالات سے متاثر ہو کر لکھا تھا۔ اردوے معلیٰ سے لیا گیا ہے۔ فعّال: کرنے والے۔ ما یرید: جس کام کا ارادہ کیا گیا ہو۔ سلحشور: وہ فوجی جن کے جسم پہ اسلحہ سجے ہوں اور [illegible] کرنے میں اسلحہ کی جھنکار سنائی دے ۱۲۔

گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے / زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے / گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرّہ ذرّہ خاک / تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آ سکے یاں تک / آدمی واں نہ جا سکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا / وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کیے شکوہ / سوزش داغہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیے باہم / ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا
اس طرح کے وصال سے یارب / کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا

۹
بہ رہن شرم ہے با وصف شوخی اہتمام اس کا / نگیں میں جوں شرار سنگ ناپیدا ہے نام اس کا
مسی آلودہ ہے مہر نوازش نامہ ظاہر ہے / کہ داغ آرزوئے بوسہ دیتا ہے پیام اس کا
بامید نگاہ خاص ہوں محمل کش حسرت / مبادا ہو عناں گیر تغافل لطف عام اس کا

۱۰
شب کہ ذوق گفتگو سے تیری دل بیتاب تھا / شوخی وحشت سے افسانہ فسون خواب تھا
واں ہجوم نغمہ ہائے ساز عشرت تھا اسد / ناخن غم یاں سر تار نفس مضراب تھا

۱۱
دود کو آج اس کے ماتم میں سیہ پوشی ہوئی / وہ دل سوزاں کہ کل تک شمع ماتم خانہ تھا
شکوۂ یاراں غبار دل میں پنہاں کر دیا / غالب ایسے گنج کو شایاں یہی ویرانہ تھا

۱۲
پھر وہ سوئے چمن آتا ہے خدا خیر کرے / رنگ اڑتا ہے گلستاں کے ہواداروں کا

معزولیٔ تپش ہوئی افراطِ انتظار	۱۳	چشمِ کشودہ حلقۂ بیرونِ در ہے آج
میر کے شعر کا احوال کہوں کیا غالب	۱۴	جس کا دیوان کم از گلشنِ کشمیر نہیں
مے کشی کو نہ سمجھ بے حاصل	۱۵	بادہ غالب عرقِ بید نہیں
ہے نزاکت بس کہ فصلِ گل میں معمارِ چمن	۱۶	قالبِ گل میں ڈھلی ہے خشتِ دیوارِ چمن
ظاہر ہیں میری شکل سے افسوس کے نشاں ہوں گرمیٔ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج	۱۷	خارِ الم سے پشت بہ دنداں گزیدہ ہوں میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں
ابر روتا ہے کہ بزمِ طرب آمادہ کرو	۱۸	برق ہنستی ہے کہ فرصت کوئی دم ہے ہم کو
۱؎ ہندوستان سایۂ گلِ پائے تخت تھا ہر داغِ تازہ یک دلِ داغ انتظار ہے	۱۹	جاہ و جلالِ عہدِ وصالِ بتاں نہ پوچھ عرضِ فضائے سینۂ درد امتحاں نہ پوچھ

کہتا تھا کل وہ محرمِ راز اپنے سے کہ ہاں
دردِ جدائیٔ اسداللہ خاں نہ پوچھ

۱؎ اس غزل کے صرف دو شعر اصل دیوان میں ردیف ہ کے تحت میں درج ہیں ۱۲

۲۰

لطفِ نظارۂ قاتل دمِ بسمل آئے
جان جائے تو بلا سے پہ کہیں دل آئے

ان کو کیا علم کہ کشتی پہ مری کیا گزری
دوست جو ساتھ مرے تا لبِ ساحل آئے

وہ نہیں ہم کہ چلے جائیں حرم کو اے شیخ
ساتھ حجاج کے اکثر کئی منزل آئے

آئیں جس بزم میں وہ لوگ پکار اٹھتے ہیں
لو وہ برہم زنِ ہنگامۂ محفل آئے

دیدہ خوں بار ہی مدت سے ولے آج ندیم
دل کے ٹکڑے بھی کئی خون کے شامل آئے

سامنا حور و پری نے نہ کیا ہی نہ کریں
عکس تیرا ہی مگر تیرے مقابل آئے

اب ہی دلی کی طرف کوچ ہمارا غالب
آج ہم حضرتِ نواب[1] سے بھی مل آئے

۲۱

ہجومِ ریزشِ خوں کے سبب رنگ اڑ نہیں سکتا
خنائے پنجۂ صیاد۔ مرغِ رشتہ برپا ہی

۲۲

غالب بس کہ سوکھ گئے چشم میں سرشک
آنسو کی بوند گوہرِ نایاب ہو گئی

۲۳

بہا ہی یاں تک اشکوں میں غبارِ کلفتِ خاطر
کہ چشمِ تر میں ہر اک پارۂ دل پائے در گل ہی

۲۴

کمالِ حسن اگر موقوفِ اندازِ تغافل ہو
تکلف برطرف۔ تجھ سے تری تصویر بہتر ہی

[1] حضرت نواب سے نواب یوسف علی خاں ناظم والیِ رامپور کی طرف اشارہ ہی یہ وہ غزل ہی جو رامپور سے رخصت ہونے کے وقت کہی تھی۔ چونکہ دیوان اس وقت مرتب ہو کر چھپ چکا تھا اس لیے دیوان میں شامل نہیں ہوئی

حیراں ہوں شوخیِ رگِ یاقوت دیکھ کر	۲۵	یاں ہو کہ صحبتِ خس و آتش برابر ہو
چند تصویرِ بتاں چند حسینوں کے خطوط[1]	۲۶	بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

تمام شد

---

[1] یہ شعر اکثر لوگوں کی زبان پر ہے لیکن اس کے اصلی مصنف کے نام سے لوگ ناآشنا ہیں بعض اسے میر تقی میر کا شعر بتاتے ہیں۔ بعض مرزا غالب کا۔ لیکن کلیات میر میں اس کا پتا نہیں۔ نہ دیوان غالب میں ہے۔ لیکن حضرت شوکت بلگرامی نے اس شعر کے بابت اردوئے معلی علی گڑھ مطبوعہ ستمبر سنہ ۱۹۱۰ء میں اپنے ایک بزرگ کے حوالہ سے لکھا تھا کہ بانیٔ اس مشہور غزل "قیس تصویر کے پردہ میں بھی عریاں نکلا" میں بعد طبع دیوان مرزا نے اس شعر کا اضافہ کیا تھا۔ عجب نہیں کہ حضرت شوکت کا یہ بیان صحیح ہو کیونکہ اس شعر کے تیور بھی یہی کہہ رہے ہیں کہ وہ مرزا جیسے قادر الکلام شاعر کے قلم سے نکلا ہے ۱۲

زیر نگرانی محمد احید الدین ایف۔ آر۔ ایس۔ اے

نظامی پریس بدایوں میں چھپا

۱۳۳۵ھ